خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اگست 2012





اگست 2012
جلد 40 شمارہ 4
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Website www.khawateendigest.com
Email: info@khawateendigest.com

مدیر

کرن سے کرن

خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

14۔ اگست 1947ء برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین موڑ جب ایک بکھری ہوئی قوم نے متحد ہو کر جدوجہد کی اور اپنا وطن، اپنی شناخت پائی۔ ایک نظریہ کی جیت ہوئی اور برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔

پاکستان قدرت کا کتنا بڑا انعام، کتنا بڑا احسان اور ہماری کتنی بڑی خوش نصیبی ہے۔ اس کی قدروقیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے وطن اور آزادی کی نعمت سے محروم ہیں۔

حال ہی میں برما کے مسلمانوں کا قتل عام۔ آٹھ لاکھ مسلمانوں کو اپنے ہی ملک میں مہاجر بن کر کیمپوں میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور ان کیمپوں میں بھی ان کی جان محفوظ نہیں ہے۔

یہ صرف برما ہی نہیں، انڈیا اور جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اکثریت کے مظالم اور تعصب کا شکار ہیں۔ افسوس ناک بات اقوام عالم کی بے ضمیری اور اقوام متحدہ کی بے حسی اور خاموشی ہے۔

اس بار اگست کے مہینے میں دو خوشیوں بھری پُرنور ساعتیں یکجا ہو رہی ہیں۔ عیدالفطر کا تہوار بھی اسی مہینے میں ہے۔

ہماری طرف سے جشن آزادی اور عیدالفطر کی مبارک باد قبول کیجیے۔

آخری عشرے کی خصوصی عبادتوں میں پاکستان اور مسلم اُمّہ کے لیے ضرور دُعا کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے پاک وطن کو محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔

محمود خاور کی برسی،

محمود خاور کو دُنیا سے رخصت ہوئے طویل وقت گزر چکا ہے۔ وقت کی یہ طویل مسافت ان کی یادوں کے نقوش مدھم نہیں کر پائی ہے۔ ان کی محبت، ان کی یادیں آج بھی ہمارے دِلوں میں زندہ ہیں۔

20۔ اگست کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں جنّت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- مریم ساجد کا مکمل ناول۔ آنگن میں اُترے چاند،
- فرحت اشتیاق کا ناول۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
- ساری بھول ہماری تھی۔ راحت جبیں کے ناولٹ کی آخری قسط،
- فرمین اظفر اور آسیہ مقصود کے ناولٹ،
- بشریٰ احمد، نسرین خالد، عنیقہ محمد بیگ کے افسانے،
- نگہت عبداللہ اور صنیزہ سید کے ناول،
- ہم سفر کے ہیرو فواد خان سے ملاقات،
- ماڈل اور ٹی وی فنکارہ سائرہ یوسف سے باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث،
- ہمارے نام۔ آپ کے خطوط اور ان کے جوابات،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی آراء کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

روزے کے فضائل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابن آدم کے ہر عمل (کے ثواب) میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ نیکی کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا بلکہ (اس سے بھی زیادہ) جتنا اللہ چاہے، ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مگر روزہ (اس قانون سے مستثنیٰ ہے) کیونکہ وہ (خالصتاً) میرے لیے ہوتا ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ بندہ میری خاطر اپنی خواہشات اور کھانا ترک کرتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی روزہ کھولتے وقت (حاصل ہوتی ہے) اور ایک خوشی اپنے رب سے ملاقات کے وقت (حاصل ہوگی) اللہ کے ہاں روزہ دار کے منہ کی بو کستوری کی مہک سے بھی زیادہ عمدہ ہے۔"

فوائدومسائل

1۔ یہ بندوں پر اللہ کا خاص فضل ہے کہ بندہ اس کی توفیق سے جو نیکی کرتا ہے' اس کا ثواب صرف ایک نیکی کے برابر دینے کے بجائے بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ترجمہ: "جو شخص نیکی لے کر حاضر ہوا' اس کے لیے اس کا دس گنا ہے۔" (الانعام 1606)

حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن کی بیان کردہ یہ مقدار کم از کم ہے۔ ثواب اس سے کہیں زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

2۔ ثواب کی کثرت کا دارومدار حسن نیت' اخلاص اور اتباع سنت پر ہے۔ صحابہ کرامؓ کا ایمان اس قدر عظیم الشان تھا کہ ان کا اللہ کی راہ میں دیا ہوا آدھ سیر غلہ بعد والوں کے احد پہاڑ برابر سونا خرچ کرنے سے افضل ہے۔ اس لیے ہر شخص کے حالات و کیفیات کے مطابق نیکی کا ثواب سیکڑوں گنا تک پہنچ سکتا ہے۔

3۔ عمل وہی قبول ہوتا ہے جو خالص اللہ کی رضا کے لیے کیا گیا ہو۔ ریا اور دکھاوے کی غرض سے کیا جانے والا عمل اللہ کے ہاں ناقابل قبول ہے۔ چونکہ روزے

کا تعلق نیت سے ہوتا ہے اور دوسرے ظاہری اعمال مثلاً "نماز' زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی نسبت روزہ پوشیدہ ہوتا ہے اور اس میں ریا کا شائبہ بھی کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے اجر کو بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

4۔ روزے کا اصل فائدہ تب ہی حاصل ہوتا ہے جب انسان دل کی غلط خواہشات پوری کرنے سے پرہیز کرے' یعنی جس طرح کھانا کھانے سے پرہیز کرتا ہے' اسی طرح جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے بھی اجتناب کرے۔

5۔ روزہ کھولتے وقت اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ اللہ کے فضل سے ایک نیک کام مکمل کرنے کی توفیق ملی۔

6۔ قیامت کو خوشی اس لیے ہوگی کہ روزے کا ثواب اس کی توقع سے بڑھ کر ملے گا اور اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔

7۔ منہ کی بو سے وہ بو مراد ہے' جو پیٹ خالی رہنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے' چونکہ یہ اللہ کی اطاعت کا ایک کام کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے' اس لیے اللہ کو بہت محبوب ہے۔

8۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روزے کی حالت میں شام کے وقت مسواک کرنے سے بچنا چاہیے۔ تاکہ اللہ کی پسندیدہ بو ختم نہ ہو جائے' لیکن یہ درست نہیں' کیونکہ مسواک سے وہ بو ختم ہوتی ہے' جو منہ کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی بو دوسری ہے' اس کا مسواک کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

روزہ ڈھال ہے

حضرت مطرف بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ جو قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ سے تھے' ان سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفیؓ نے انہیں پلانے کے لیے دودھ طلب فرمایا۔

مطرف رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔ "میں روزے سے ہوں۔"

حضرت عثمان ثقفیؓ نے فرمایا۔ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرما رہے تھے۔

"روزہ جہنم سے بچانے والی ڈھال ہے جس طرح لڑائی میں تم میں سے کسی کی ڈھال ہوتی ہے۔"

فوائد و مسائل

1۔ مہمان کے کھانے پینے کی چیز پیش کرنا اخلاق عالیہ میں شامل ہے۔

2۔ اگر کھانے پینے کی دعوت دی جائے تو نفلی روزہ کھول کر دعوت قبول کرنا ضروری نہیں۔

3۔ اگر کسی موقع پر اپنی کوئی نیکی ظاہر کرنا پڑ جائے تو یہ ریا میں شامل نہیں۔

4۔ روزہ دوزخ سے بچاتا ہے' ایک تو اس لیے کہ یہ ایک بڑی نیکی ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں' دوسرے اس لیے کہ روزے کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ جن کے ارتکاب کی صورت میں وہ جہنم میں جا سکتا ہے۔ گناہوں سے اجتناب اور نیک عمل کی انجام دہی دونوں چیزیں جنت میں لے جانے والی اور جہنم سے بچانے والی ہیں۔

روزہ کا اجر

"جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریان کہا جاتا ہے۔ قیامت کے دن آواز دی جائے گی۔ کہا جائے گا "روزے رکھنے والے کہاں ہیں؟" چنانچہ جو شخص روزہ رکھنے والوں میں سے ہوگا وہ اس (دروازے) میں داخل ہو جائے گا اور جو اس میں داخل ہوگا' اسے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔"

1۔ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جو مختلف نیکیوں کی طرف منسوب ہیں۔ **مثلاً** "**باب الصلوٰۃ** (نماز کا دروازہ) **باب الجہاد** (جہاد کا دروازہ) **باب الصدقہ** (صدقہ کا دروازہ)

2۔ ایک شخص جس نیکی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس کی ادائیگی کی زیادہ کوشش کرتا ہے' وہ اس نیکی سے منسوب دروازے سے جنت میں داخل ہوگا۔ اگر زیادہ

صفات کا حامل ہو تو ایک سے زیادہ دروازوں سے بلایا جائے گا۔ **مثلاً** "حضرت ابو بکرؓ کو آٹھوں دروازوں سے بلایا جائے گا۔

3۔ "ریان" کا مطلب سیراب ہے۔ روزہ دار بھوک' پیاس' برداشت کرتا ہے اور پیاس کا برداشت کرنا بھوک کی نسبت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے روزہ داروں کے لیے جو دروازہ مقرر ہے اسے بھی "سیرابی کا دروازہ" قرار دیا گیا ہے۔

4۔ فرض عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ مسنون نفلی عبادات بھی ممکن حد تک ادا کرتے رہنا چاہیے۔ نفلی عبادات کا اہتمام جنت میں داخلے کا باعث ہے۔

ماہ رمضان کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص ایمان رکھتے ہوئے اور ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے' اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔"

فائدہ

1 - اس سے مراد وہ صغیرہ گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ کبیرہ گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں اور حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک انہیں ادا نہ کر دیا جائے' اِلّا یہ کہ صاحب حق معاف کر دے۔

شیطان کی قید

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطانوں اور سرکش جنوں کو جکڑ دیا جاتا ہے۔"

فوائد و مسائل

1۔ ماہ رمضان نیکیوں کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں اللہ کی طرف سے نیکیوں کے راستے میں حائل بڑی رکاوٹیں دور کر دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص نیکیوں سے محروم رہتا ہے یا برائیوں سے اجتناب کر کے اللہ کی رحمت حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

2۔ شیطانوں اور سرکش جنوں کے قید ہو جانے کے باوجود ماہ رمضان میں انسانوں سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان گیارہ مہینوں میں گناہوں کا مسلسل ارتکاب کرنے کی وجہ سے ان کے عادی ہو جاتے ہیں' پھر رمضان میں نفس کی اصلاح کے لیے کوشش بھی نہیں کرتے' یعنی روزے نہیں رکھتے' کثرت سے تلاوت نہیں کرتے' تراویح نہیں پڑھتے۔ اس لیے ان کے نفس کی تربیت اور اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے وہ گناہوں سے اجتناب نہیں کر سکتے۔

3۔ جنت کے دروازے کھل جانے اور جہنم کے دروازے بند ہو جانے سے حقیقتاً" ان دروازوں کا کھلنا اور بند ہونا بھی مراد ہے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں ماہ رمضان کو خاص اہمیت دی جاتی ہے' اس لیے نیکیوں کی طرف عام رجحان پیدا ہوتا ہے اور مسلمان ہر قسم کی نیکی کرنے پر مستعد ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں گویا یہ نیکیاں جنت کے دروازے ہیں اور گناہ جہنم کے دروازے۔

4۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکیوں میں آگے بڑھنے اور گناہوں سے باز آنے کا اعلان بھی اس لیے ہے کہ مسلمان نیکیاں کرنے اور گناہوں سے بچنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں۔

5۔ ہر رات بعض لوگوں کی جہنم سے آزادی بھی ماہ رمضان کا خصوصی شرف ہے۔ گناہوں سے توبہ کر کے ہر شخص اس شرف کو حاصل کر سکتا ہے۔

افطار کا وقت

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ ہر افطار کے وقت کچھ لوگوں کو آزاد فرماتا ہے اور یہ (رمضان کی) ہر رات میں ہوتا ہے۔"

فوائد و مسائل

1۔ جہنم سے آزادی کا یہ شرف خلوص کے ساتھ سنت کے مطابق روزہ رکھ کر اور گناہوں سے توبہ کر کے حاصل ہو سکتا ہے۔

محروم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کے مطابق جب رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے پاس یہ مہینہ آگیا ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینے سے افضل ہے، جو اس رات (کا ثواب حاصل کرنے) سے محروم رہا، وہ ہر بھلائی سے محروم رہا۔ اس کے خیر سے وہی محروم رہتا ہے، جو واقعی محروم ہے۔"

فوائد و مسائل

1۔ اس مہینے کی افضل ترین رات لیلۃ القدر ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ القدر میں بھی ہے۔

2۔ شب قدر کی عبادت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف مسنون ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کر سکے، تب بھی راتوں کی عبادت، خصوصاً "طاق راتوں کی عبادت میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

3۔ ایک رات عبادت میں گزارنے سے تیس ہزار سے زیادہ راتوں کی عبادت کا ثواب مل رہا ہو، پھر بھی کوئی شخص سستی کی وجہ سے یہ ثواب حاصل نہ کر سکے تو یہ واقعی بہت بڑی محرومی ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن بھیجا تو فرمایا۔

"تم اہل کتاب لوگوں کے پاس جا رہے ہو تو (سب سے پہلے) انہیں اس بات کی دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول کر لیں (اور اسلام میں داخل ہو جائیں) تو انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ تمہاری یہ بات تسلیم کر لیں تو پھر انہیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر ان کے مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے دولت مند افراد سے لیا جائے گا اور واپس ان ہی کے ناداروں کو دے دیا جائے گا۔ اگر وہ تمہاری یہ بات بھی مان لیں تو ان کے عمدہ مال لینے سے اجتناب کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔"

فوائد و مسائل

1۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو 10 ھ میں حجۃ الوداع سے پہلے یمن کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یمن کے ایک حصے کے گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ اور دوسرے حصے کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ تھے۔

2۔ اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں۔ اس زمانے میں یمن میں کثیر تعداد میں یہودی آباد تھے۔

3۔ غیر مسلموں کو تبلیغ کرنے میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ توحید کو حاصل ہے۔

4۔ توحید رسالت کا اقرار اسلام میں داخلے کی بنیادی شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان شمار نہیں کیا جا سکتا۔

5۔ عبادات میں نماز اور زکوٰۃ سب سے اہم ہیں۔

6۔ زکوٰۃ مسلمانوں سے وصول کی جاتی ہے، غیر مسلموں سے زکوٰۃ کا متبادل ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ جو ہر شخص کے حالات کے مطابق کم و بیش مقرر کیا جاتا ہے۔ اسے جزیہ کہتے ہیں۔

7۔ زکوٰۃ مسلمان مستحقین ہی میں تقسیم کی جاتی ہے۔ غیر مسلموں میں سے صرف اس غیر مسلم پر زکوٰۃ میں سے کچھ خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے

بارے میں یہ توقع ہو کہ اسے مسلمانوں سے قریب ہونے کا موقع ملا تو اسلام کی طرف راغب ہو جائے گا اور ممکن ہے وہ اسلام بھی قبول کر لے۔ ایسے لوگوں کو مؤلفۃ القلوب کہا جاتا ہے۔

8۔ جس علاقے کے مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جائے پہلے وہاں کے مستحق افراد میں تقسیم کرنی چاہیے۔ اگر ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد مال بچ جائے تو پھر دوسرے علاقے کے مسلمانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

9۔ زکوٰۃ میں اچھے اچھے جانور چن کر وصول نہ کیے جائیں اور نہ نکمے جانور لیے جائیں، بلکہ درمیانے درجے کے جانور لیے جائیں۔

10۔ اسلام میں نئے داخل ہونے والے افراد کو آہستہ آہستہ تعلیمات پر عمل کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ ایک ہی بار تمام احکام کا بوجھ ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے۔

11۔ تبلیغ و تفہیم کے ذریعے کوشش کی جائے کہ عوام خوش دلی سے اسلام کے احکام پر عمل کریں اور ان کے دل اسلامی تعلیمات کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے محبت سے ان پر عمل کریں۔

12۔ ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے رعایا میں انصاف بے حد ضروری ہے۔ ہر حاکم اور سرکاری افسر کا سب سے پہلا اور سب سے اہم فرض رعایا کے حقوق عدل و انصاف سے ادا کرنا ہے۔

13۔ مظلوم کی بددعا سے بچنے کا مطلب ظلم سے پرہیز اور ظالم سے مظلوم کا حق دلوانا ہے، کیونکہ جب مظلوم کو حاکم سے اپنا حق نہیں ملے گا تو اس کے دل سے بددعا نکلے گی۔

14۔ مظلوم کی بددعا جلد قبول ہوتی ہے، اسی طرح جب مظلوم کی داد رسی کر دی جائے اور وہ خوش ہو کر دعا دے تو وہ بھی جلد قبول ہوتی ہے۔

زکوٰۃ نہ دینے والے کی سزا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے مال کو گنجے سانپ کی شکل دی جائے گی حتیٰ کہ وہ اس کی گردن میں طوق بن کر لپٹ جائے گا۔"

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید سے اس کی تائید میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ترجمہ

"جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دیا ہے، وہ اس میں اپنی کنجوسی کو اپنے لیے بہتر خیال نہ کریں، بلکہ وہ ان کے لیے انتہائی برا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن انہیں ان کی کنجوسی کی چیز کے طوق ڈالے جائیں گے۔"

فوائد و مسائل

1۔ مال جب نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ فرض ہے۔

2۔ مجرموں کو قیامت کے دن جہنم میں داخل کیے جانے سے پہلے بھی سزا ملے گی۔

3۔ گنجے سانپ سے مراد انتہائی زہریلا سانپ ہے جس کا سر سفید ہو۔

4۔ اگر کسی خلاف شریعت کام میں دنیا کا کچھ فائدہ نظر آئے تو اس کے اخروی نقصان کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ تاکہ دنیا کا فائدہ حقیر محسوس ہو اور شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

5۔ ارشادات نبوی قرآن مجید ہی کی تشریح ہیں، اس لیے بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارشاد مبارک کے ساتھ قرآن مجید کی آیات بھی تلاوت فرما دیتے تھے۔

6۔ علمائے کرام کو وعظ و نصیحت کے دوران قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی بھی پڑھ کر ان کا ترجمہ سنانا چاہیے۔ اس میں جو برکت ہے، وہ بزرگوں کی حکایات پر اکتفا کرنے میں نہیں۔

اک کالم برستے پانی میں

انشا جی

ایک مسافر کا قصہ مشہور ہے کہ جنگل بیاباں میں چلا جا رہا تھا، چلتے چلتے تھک گیا۔ کہاں سے چلا تھا، کہاں جا رہا تھا اور کیوں جا رہا تھا۔ گھر میں نچلا بیٹھا حقہ کیوں نہیں پی رہا تھا۔ یہ بات قصے میں مذکور نہیں۔۔۔۔ مذکور ہے تو یہ کہ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ کوئی سواری بھیج۔ اب آسمان والوں کو یہی ایک کام تھوڑی تھا۔ ان کے پاس درخواست اور فرمائشوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی نیک بندہ تھا۔ اس کی درخواست پر حکم ہوا کہ سواری فی الفور بھیجی جائے۔ مسافر کیا دیکھتا ہے کہ ایک گھڑ سوار چلا آ رہا ہے اور ساتھ اس کے ایک چھوٹا سا بچھیرا ہے۔

اس نے اپنے ہنٹر سے اس مسافر کو ٹھوکا دیا اور کہا "ویل کالا آدمی۔ ہمارا بچھیرا تھک گیا ہے اس کو کندھوں پر بٹھاؤ اور ہمارے ساتھ ساتھ بھاگو۔

"اس شخص نے تعمیل ارشاد کی لیکن آسمان والوں سے گلہ کیا کہ "بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ خوامخواہ الٹے سیدھے حکم جاری کر دیتے ہو۔ میں نے سواری نیچے کے لیے مانگی تھی۔ اوپر کے لیے تھوڑا ہی مانگی تھی۔"

کچھ ایسا ہی اب کے کراچی والوں کے ساتھ ہوا۔ یہاں ایک پائپ لائن ٹوٹنے سے پانی کا توڑا ہو گیا تھا۔ لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترسنے لگے تھے۔ لوگوں نے تیمم کر کر کے نمازیں پڑھیں اور دعائیں کیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ۔ کارکنان قضا و قدر پائپ لائن کو جوڑ دیتے۔ اپنے پاس سے پانی دینا ہی تھا تو ناپ کر دیتے۔ وہ بھی اعشاری پیمانوں لیٹر وغیرہ سے۔ انہوں نے آسمان کی ٹینکی ہی لنڈھا دی۔ چنانچہ اہل کراچی کے ساتھ وہی ہوا جو کبھی حفیظ جالندھری کے ساتھ ہوا ہو گا۔ بلکہ ہوا تھا جب انہوں نے ایک پیر مرد کے نکاح ثانی پر ایسا ویسا سہرا لکھا تھا۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

ہم اتفاق سے ان دنوں کراچی سے باہر تھے۔ ورنہ کراچی والوں سے کہتے کہ دعا کے ساتھ اعداد و شمار بھی دیا کرو۔ یہ کہو کہ معمولی پانی چاہیے۔ باران رحمت نہیں چاہیے۔ ہم نے کچھ برسات لاہور میں دیکھی۔ کچھ پنڈی میں پائی۔ وہاں تو پانی پڑتا ہے۔ سڑکیں دھل جاتی ہیں۔ لیکن پنجاب کے لوگ اس کے عادی ہیں کراچی والوں کو جب باران رحمت کا کئی سالوں کا کوٹہ ایک ہی بار ملتا ہے تو ان کے دامن میں نہیں سماتا۔ چھاجوں برستا ہے اور چھتوں کو چھلنی کر دیتا ہے۔ آدم کچھ مانگے تو اس کا اپنا ظرف بھی کچھ ہونا چاہیے۔ دینے والی سرکار تو ایسی ویسی ہے نہیں۔ جب دیتی ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتی ہے۔ بہرحال انتظامیہ کے ہر سال کے اس اعلان کے باوجود کہ بارش کی آفات سے نمٹنے کا معقول انتظام کر لیا ہے۔ جابجا ایمرجنسی سینٹر کھول دیے ہیں۔ پانی کی مجال نہیں کہ غریبوں اور جھگیوں والوں کا بال بیکا کر سکے۔ ہر سال وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب کے برس بھی یہی ہوا۔



فی الحال یہ کیفیت ہے کہ ایک محلے کا آدمی دوسرے محلے کے آدمی سے خیریت پوچھتا ہے تو ان لفظوں میں کہ میاں آج کل کتنے پانی میں ہو؟ وہ کہتا ہے جناب ہم تو پانی پانی ہو رہے ہیں۔ یا یہ کہ پانی سر سے گزر گیا ہے یا یہ کہ ہماری کمائی پر پانی پھر گیا ہے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا کر رہے ہو فی الحال۔ جواب ملتا ہے کہ فی الحال تو آپ کے سامنے پانی بھرتا ہوں۔



مباوا پوچھنے والا سمجھے کہ محاورہ بازی ہو رہی ہے، وہ بالٹی بھی دکھاتا ہے۔ بے شک کراچی میں محاورے بولنے والوں کی خاصی آبادی ہے لیکن آج کل پانی کا جتنا کاروبار ہو رہا ہے۔ لغوی معنوں میں ہو رہا ہے۔

زبان اردو کو اس لحاظ سے بحر ناپیدا کنار کہنا چاہیے کہ اس میں پانی کے محاورے بہت ہیں۔ پانی چڑھتا ہے، اترتا ہے، بہتا ہے اور ملتان تک جاتا ہے۔ لوگ اسے پیتے ہیں اور پی پی کر حریفوں کو کوستے ہیں۔ اس کی لہریں گننے کا کاروبار ایک مستقل کاروبار ہے۔ لوگ پانی میں آگ تک لگاتے ہیں۔ پانی مانگتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو پانی تک نہیں مانگتے۔ پانی سب کچھ چکھتا ہے تو مر بھی جاتا ہے۔ چنانچہ پانی مرنا بھی ایک محاورہ ہے۔ جان صاحب کا شعر ہے۔

تیرے دل میں مصری چاہ یوسف بیگ بھیا کی!
نہ کیوں آنکھیں چرائے مجھ سے، مرتا تجھ میں پانی ہے

ایک اور استاد فرماتے ہیں۔

آنسو تو دامن سے پوچھوں، ہچکی کیوں کر روکوں میں
لاکھ چھپاؤں عشق کو لیکن پانی پھر بھی مرتا ہے

بعض شاعر اور عاشق کہ اندر سے یہ دونوں ایک ہوتے ہیں۔ خود پانی پہ مرتے ہیں۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

ایک اور شاعر اس مضمون کو یوں باندھتا ہے۔

جا سکا پھر نہ مرے گھر، جو یہ پانی آیا
رحمت اللہ کی آئی، جو یہ پانی آیا!

پانی کے جلنے کا ایک اور مضمون بھی سنئے۔

غسل حمام کو کب آئے گا، وہ شوخ غفور
پانی جلتا ہے جدا، آگ جدا جلتی ہے

اساتذہ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں پانی سستا بھی ہوا کرتا تھا۔ لوگ اسے پیسے کی طرح بہایا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح پیسے اور صراحی کے حساب سے بکا نہ کرتا تھا۔ کسی کا شعر ہے۔

پیتے ہیں اب جناب مشیخت مآب بھی
پانی کے مول بکنے لگی ہے شراب بھی

شعرا کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف کپڑا اور گردن ہی ناپنے کا دستور نہ تھا۔ پانی بھی ناپا جاتا تھا۔ مشہور شاعر قلق کا شعر ہے۔

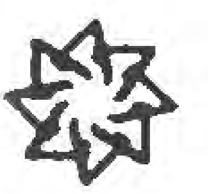
کچھ پتا ملتا نہیں عشق ذقن کو چاہ کا
پانی ناپا آشناؤں نے بہت اس چاہ کا

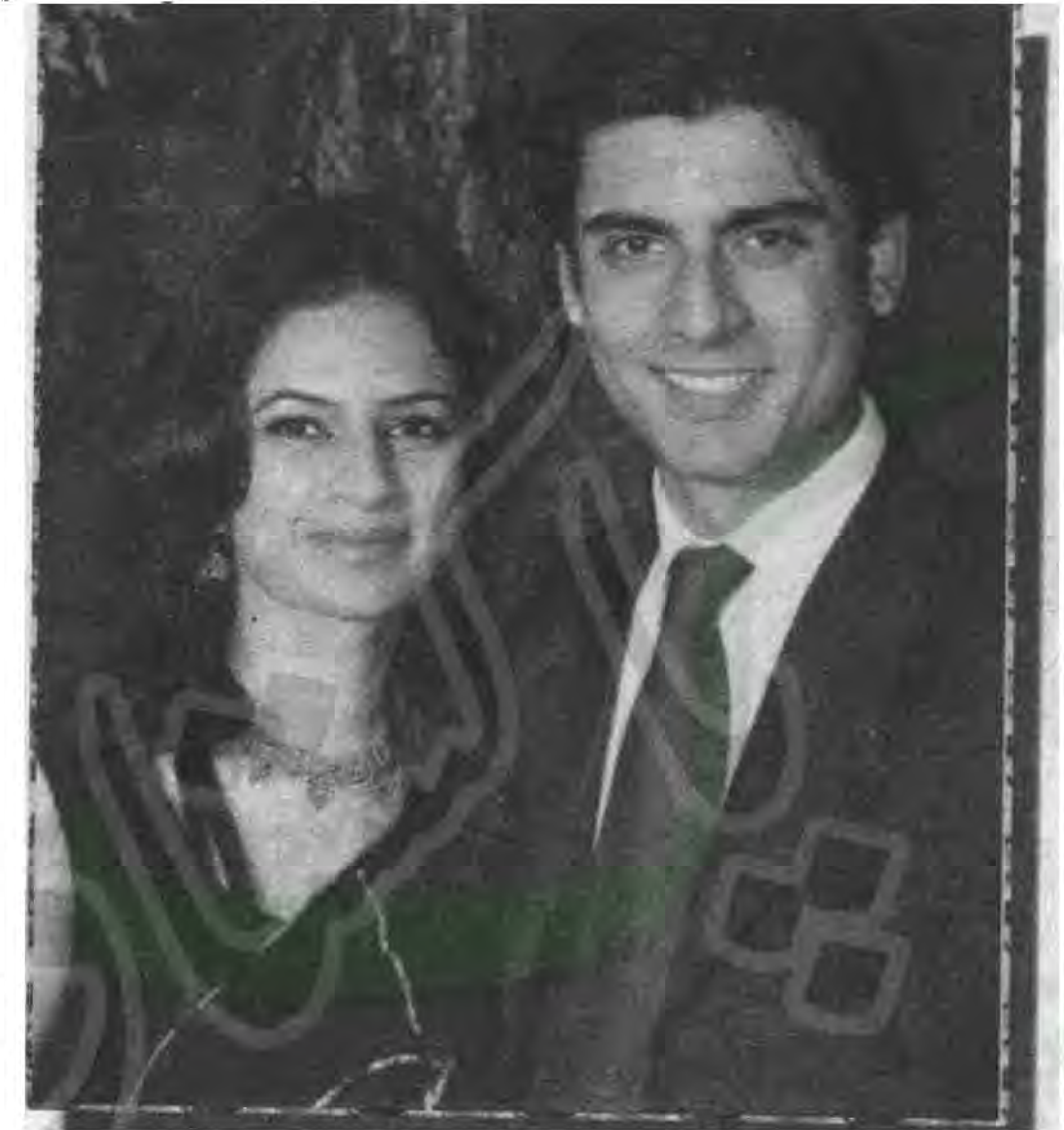
ایک شعر راسخ کا بھی سنئے کہ مضمون نکالنے کی حد تک ناسخ کے بھائی تھے۔

ہو گیا ہے مرد جلاد کا خنجر پانی!
کم سے کم ناپ کے پیتا ہوں میں گز بھر پانی

قارئین کرام! ہم پانی کے مضمون کو مزید پانی کرتے لیکن ابر پھر آیا ہے اور پانی پھر برسنے کے آثار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ذرا سی تاخیر سے ہمارے اس کالم پر پانی پھر جائے۔ جس طرح کسی شاعر نے اپنے نامے کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا ہے۔

آسمان اپنی عداوت سے نہ پانی پھیر دے
لے چلا ہے خط ہمارا نامہ بر برسات میں





ہم سفر کے ہیرو

فواد خان سے ملاقات

شاہین رشید

شوبز میں آنے والا ہر فنکار شہرت کی بلندیاں پانے کی آرزو لے کر قدم دھرتا ہے۔ کچھ فنکار اپنے دل میں یہ حسرت لیے گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں' تاہم کچھ فنکار اپنے ابتدائی سفر میں ہی کامیابی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

فواد خان یہ نام اس وقت بھی بہت مشہور ہوا' جب ان کا اپنا ایک میوزک بینڈ تھا اور بحیثیت گلوکار کے لوگ فواد خان کو بہت پسند کرتے تھے۔ پھر لوگوں نے انہیں اس وقت بھی بہت پسند کیا' جب انہوں نے شعیب منصور کی فلم "خدا کے لیے" میں بہترین پرفارمنس دی۔ پھر جب ڈرامہ سیریل "ست رنگی" اور "دل دے کے جائیں گے" میں کام کیا تو یہ ناظرین کے دلوں کی دھڑکن بن گئے لیکن جب "ہم سفر" میں اشعر کا رول کیا تو یوں سمجھیں کہ شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا..... "ہم سفر" کے ساتھ ساتھ ڈرامہ سیریل "کچھ پیار کا پاگل پن" بھی آن ایر رہا۔ اگرچہ اس میں بھی فواد خان کی اداکاری کو پسند کیا گیا' لیکن جو بات "ہم سفر" کی تھی' وہ اس دوسرے سیریل کی نہ تھی۔ یہ فواد خان کی بہترین پرفارمنس کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے جب جب کام کیا' لوگوں نے بہت پسند کیا۔

"کیسے ہیں فواد خان اور ہم سفر کی کامیابی پر بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔"

"بہت شکریہ..... آپ سب کی محبت ہے۔"

"آپ جس سیریل میں آتے ہیں' وہ بہت کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ آپ کی پرفارمنس ہے یا آپ کے چہرے کی معصومیت؟"

(قہقہہ)..... "معصومیت تو نہ کہیں' کیونکہ ہم سفر میں اشعر نے کون سا اچھا کام کیا۔ پرفارمنس کی بات کریں۔"

"بے شک آپ کی پرفارمنس بہت اچھی تھی' لیکن سچی بات ہے کہ چہرے پہ معصومیت بھی بہت ہے۔ شاید آپ دل کے بہت اچھے ہیں۔"

"شکریہ..... بس اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ اس نے اتنی عزت دی ہے ورنہ بندے کی کیا اوقات ہے۔"

"ہم سفر کو اتنی پذیرائی ملے گی' کبھی سوچا تھا؟"

"میں تو جو بھی کام کرتا ہوں' وہ اسی امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی دے گا اور وہ دیتا بھی ہے۔ دل لگا کر اور ایمانداری کے ساتھ جو بھی کام کیا جائے' اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی دیتا ہے۔"

"تعریف سن کر کیا محسوس کرتے ہیں کہ یہ میرا حق تھا یا....."

"نہیں! ایسا کچھ محسوس نہیں کرتا کہ میرا حق تھا۔ میں تو رب کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس قابل بنایا کہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں اور آپ یقین کریں کہ تعریف سن کر میں یہ نہیں سوچتا کہ میں ایک مکمل آرٹسٹ بن گیا ہوں' بلکہ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے کام میں مزید نکھار پیدا کروں اور مزید پسند کیا جاؤں اور ہم آرٹسٹ ہی کیا' آپ کسی کی بھی تعریف کریں گی' اس



کی حوصلہ افزائی ہو گی اور وہ پہلے سے بہتر پرفارمنس شو کرے گا۔"

"تو آپ شہرت انجوائے کر رہے ہیں؟"

"شروع شروع میں بہت انجوائے کرتا تھا' مگر اب عادت ہو گئی ہے۔ پہلے تو ایسا لگتا تھا کہ ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ یہ سوچ کر ہی بہت اچھا لگتا تھا کہ میں ایک عام انسان سے خاص انسان ہو گیا ہوں۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں۔"

"وہی کام جو آپ دیکھ رہی ہیں۔ کچھ کام مکمل ہو گئے ہیں' کچھ انڈر پروڈکشن ہیں' پھر میرا اسٹوڈیو ہے۔ جہاں کام ہوتا ہے۔"

"آپ کی فیلڈ کی طرف آنے سے پہلے آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"فواد خان نام ہے۔ مجھے اپنا نام بہت پسند ہے۔ لیکن مجھے دیگر ناموں میں "آیان" اور "روفیل" پسند ہے۔ "آیان" میرے بیٹے کا نام ہے اور اللہ نے اگر ایک اور بیٹا دیا تو اس کا نام "روفیل" رکھوں گا اور ہاں جی! میں 29 نومبر 1981ء میں پیدا ہوا اس لحاظ سے میرا استارہ قوس (Sagittarios) ہے والدین کا اکلوتا

بیٹا ہوں۔ البتہ ایک بڑی بہن اور ایک چھوٹی بہن ہے۔ شادی پسند سے کی۔ تقریباً" ساڑھے چھ سال ہو گئے ہیں شادی کو اور ماشاء اللہ ایک بیٹا ہے۔ اس سے زیادہ پرسنل لائف کو ڈسکس کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"بچپن سے خواب دیکھتے تھے اس فیلڈ میں آنے کا؟"

"نہیں نہیں..... ایسا کوئی چکر یا خیال نہیں تھا اور والدین بھی کب چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ یا بچی اس فیلڈ میں آئیں۔ والدین کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ بچے ڈاکٹر یا انجینئر بنیں اور سچ پوچھیں تو مجھے بھی ڈاکٹر، انجینئر اور پائلٹ کی شخصیت بہت متاثر کرتی تھی۔ نیوی کے کپتان، سائنس دان بہت متاثر کرتے تھے۔ یعنی جتنے بھی پروفیشن تھے ان سب میں کام کرنے والے مجھے بہت متاثر کرتے تھے۔ لیکن میں اس فیلڈ میں آگیا کہ قسمت میں اس فیلڈ میں آنا لکھا ہوا تھا۔"

"یعنی آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ جو قسمت میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے؟"

"بے شک جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے، وہی ملتا ہے۔ مگر انسان کی اپنی کوشش کا بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے اور وہ اپنی کوشش سے بھی بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔"

"اس فیلڈ میں آپ اتفاقاً" آئے، مگر کیسے؟"

"اصل میں ثمینہ احمد کے بیٹے "زین" سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ انہی کی وجہ سے میں اس فیلڈ میں آیا۔ فنی سفر کا آغاز اردو اور انگریزی تھیٹر پلے سے کیا اور پھر ٹی وی کی طرف آیا۔ اس دوران ایک پرائیویٹ اسکول سے اداکاری کے اسرار و رموز سیکھے اور پھر باقاعدہ طور پر اس فیلڈ کو جوائن کیا۔"

"ٹی وی پہ پہلا ڈرامہ کون سا تھا؟"

"پہلا ڈرامہ "جٹ اینڈ بونڈ" تھا اور اس میں میری پرفارمنس کو کافی پسند کیا گیا، جس کی بنا پر مجھے مزید آفرز آئیں۔ پھر اپنا میوزک بینڈ بنایا۔ اس سے بھی شہرت ملی۔"

"شوبز کی فیلڈ خطرناک ہے۔ اگرچہ کافی سال ہو گئے ہیں آپ کو۔ مگر پھر بھی کس طرح اپنے آپ کو اسکینڈلز سے بچا کر رکھتے ہیں؟"

"سب کو معلوم ہے کہ میں شادی شدہ اور صاحب اولاد ہوں۔ پھر میری عادت سے بھی سب واقف ہیں۔ اس لیے کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ فواد خان صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔"

"ہم سفر ہو یا آپ کا کوئی بھی ڈرامہ..... رومانٹک رول بہت عمدگی سے کرتے ہیں۔ حقیقت میں کیسے ہیں آپ؟"

"حقیقت میں بھی رومانٹک ہوں، لیکن آپ یقین کریں کہ رومانٹک سین کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے کرتا ہوں اور ایسا کیوں ہے، مجھے خود بھی اس کا علم نہیں۔ میں بہت زیادہ سوشل نہیں ہوں۔ بہت لیے دیے رہتا ہوں۔"

"فواد خان! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت کامیابیاں دی ہیں۔ اپنی قسمت پر تو رشک آتا ہی ہوگا مگر اپنے علاوہ کن لوگوں کے لیے آپ سمجھتے ہیں کہ انہیں بہت کامیابیاں ملی ہیں؟"

"دنیا میں بے شمار لوگ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ کامیابیاں دی ہیں۔ اپنے ملک میں بھی ایسے بے شمار لوگ ہیں۔ لیکن اگر آپ ینگ لوگوں کی بات کریں تو عاطف اسلم اور علی ظفر کو خدا تعالیٰ نے بہت کامیابیاں دی ہیں۔"

""خدا کے لیے" کے بعد آپ نے کوئی فلم نہیں کی۔ کیوں؟"

"اگر میں فلم کرنا چاہوں تو میرے لیے کمی نہیں ہے۔ لیکن ایسی فلم میں کام کرنے کا کیا فائدہ کہ کام کرنے کے باوجود بندہ گم نام رہے۔ مجھے اچھی کہانی اور اچھے رول کے ساتھ کوئی فلم آفر ہوگی تو ضرور کام کروں گا۔ انکار نہیں کروں گا۔"

"ڈراموں کے لیے کسی خاص رول کی ڈیمانڈ ہوتی ہے؟"

"نہیں! جب مجھے کوئی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بلاتے

ہیں اور کسی کردار کی پیشکش کرتے ہیں تو میں کردار کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔ اس کو تصور ہی تصور میں کر کے دیکھتا ہوں اور جب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کردار کو کر سکتا ہوں تو پھر "ہاں" کرتا ہوں۔ بس! کردار اچھا اور اسٹرونگ ہونا چاہیے۔"

"آپ کافی ڈرامے کر چکے ہیں .... اپنا بہترین ڈرامہ کس کو کہیں گے؟"

"ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے .... ابھی کوئی نمبرون اور نمبر ٹو نہیں ہے۔ ہاں! جب کبھی اس فیلڈ کو چھوڑا تب تجزیہ کروں گا کہ کون سا بہتر تھا اور کون سا بہترین تھا۔"

"چھوڑنے کی بات پر آپ کے پرستار ناراض ہو جائیں گے؟"

"میں ابھی چھوڑنے کی بات نہیں کر رہا۔ جب کبھی چھوڑا کی بات کر رہا ہوں۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"کہتے ہیں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ یہ کریڈٹ کس کو دیں گے؟"

"میری کامیابی میں ایک عورت کا ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ تین خواتین کا ہاتھ ہے ان میں میری ماں، میری بہن اور میری بیگم شامل ہیں جنہوں نے میری زندگی کو بنانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔"

"سیاست کو پسند کرتے ہیں؟"

"نہیں .... بالکل نہیں۔ میں سیاست کو دور سے سلام کرتا ہوں۔ سیاست بہت پرانا کھیل ہے، جو عرصہ دراز سے کھیلا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست بہت خراب ہے۔ اس لیے مجھے سیاست سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"کن سیاست دانوں کو ملک کے لیے بوجھ سمجھتے ہیں۔"

جو سیاست کرتا ہے، وہ ملک کے لیے بوجھ ہی ہوتا ہے۔ خواہ وہ کوئی عام انسان ہو یا کوئی خاص انسان .... یہاں آپ کو کوئی مخلص نہیں ملے گا۔"

"پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟"

"مجھے پاکستان سے بے انتہا محبت ہے۔ اس کے لیے میں کبھی برا سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس کے لیے فکر مند بھی بہت رہتا ہوں۔ میں پاکستان کو ایک بہترین ملک دیکھنا چاہتا ہوں .... میری دعا ہے کہ کچھ ایسا ماحول بن جائے کہ پاکستان میں خوشحالی آئے، پاکستان ترقی کرے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا ملک تو مسائل میں گھرا ہوا ہے؟"

"مسائل تو ہر ملک میں ہوتے ہیں، مگر حکومتیں اسے بڑی عقلمندی سے حل کرتی ہیں۔ بس مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی مخلص نہیں ہے ورنہ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔"

"نئی نسل سے کیا امیدیں ہیں آپ کو؟"

"نئی نسل سے ہی تو امیدیں ہیں جو کہ ہمارے ملک کا 70 فیصد ہیں، مگر ہم اپنی نئی نسل کے ٹیلنٹ کو ضائع کر رہے ہیں۔ بس! اللہ ہی خیر کرے۔"

"مایوس لگ رہے ہیں۔ خیر! شوبز میں کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں یا اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"کبھی کبھی تو واقعی بہت مایوسی ہوتی ہے .... رہی بات شوبز کی تو سچی بات یہ ہے کہ پہلے میں یہاں کے لوگوں کے رویئے دیکھ کر کچھ نہ کچھ بول دیا کرتا تھا۔ مگر جب دیکھا کہ یہاں کوئی کسی کی نہیں سنتا تو پھر میں بھی خاموش ہو گیا۔ اس فیلڈ میں ایماندار لوگوں کی بہت کمی ہے۔"

"ملک کے حالات دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ اس ملک کو چھوڑ کر کہیں اور بسیرا کر لیں؟"

"نہیں! ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مجھے اپنے ملک سے بہت پیار ہے۔ بہت لگاؤ ہے۔ اس ملک نے مجھے عزت، دولت اور شہرت دی۔ اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ البتہ باہر جاتا ہوں تو ان کی ترقی دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہوں۔ چونکہ وہاں صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے تو آلودگی بھی نہیں ہوتی، جبکہ ہمارے ملک میں بہت آلودگی ہے۔ جس نے ہماری

صحت برباد کی ہوئی ہے۔"

"کس چیز نے آپ کو زندگی میں بہت نقصان پہنچایا؟"

میں جیسا خود ہوں۔ دوسروں کو بھی ویسا ہی سمجھ لیتا ہوں۔ جس طرح میں دوسروں کا بھروسا نہیں توڑتا اس طرح میرا بھی دل چاہتا ہے کہ کوئی میرا بھروسا نہیں توڑے، مگر میں نے اس معاملے میں ہمیشہ دھوکا کھایا ہے۔ اس لیے اب میں نے دوسروں پر بھروسا کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی بھروسے کے قابل ہے تو وہ میری ماں، میری بیوی اور میری بہن ہے.... بس۔"

"زندگی کیسی لگتی ہے؟ اور کوئی ایسا لمحہ زندگی میں آیا جب آپ بہت ڈسٹرب، بہت اپ سیٹ ہوئے ہوں؟"

"زندگی بہت اچھی لگتی ہے۔ کیونکہ زندگی اللہ کا عطا کیا ہوا بہت خوب صورت تحفہ ہے۔ میں اللہ کی اس نعمت کو بہت انجوائے کرتا ہوں اور ہاں! میری زندگی میں ایک ایسا لمحہ آیا، جب میں بہت زیادہ اپ سیٹ ہوا۔ اس وقت جب مجھے پتا چلا کہ مجھے شوگر ہو گئی ہے .... بہت دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف سترہ سال کی تھی۔"

"اتنی کم عمری میں شوگر ہو تو ڈائریکٹ "انسولین" کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔"

"جی بالکل! "انسولین" کا ہی استعمال کرتا ہوں اور اپنی صحت کا خاص خیال رکھتا ہوں اس لیے فٹ ہوں۔"

"موت سے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں نہیں .... میرے خیال میں سب کو ہی ڈر لگتا ہو گا اور میرا خیال ہے کہ جو موت سے ڈرتا ہے، وہ ہی اچھی اور صحت مند زندگی گزارنے کا خواہش مند بھی ہوتا ہے۔ زندگی بہت بڑی نعمت ہے۔"

"اپنے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں؟ کیا پسند ہے آپ کو؟ اور گھر میں کھانا پسند ہے یا باہر؟"

"بالکل جی! اپنے کھانے پینے کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ مجھے مٹر پلاؤ رائتہ کے ساتھ اور بیسنی روٹی اچار کے ساتھ بہت پسند ہے۔ ویسے اللہ کا شکر ہے کہ کھانے پینے میں کوئی نخرہ نہیں دکھاتا اور گھر یہ بھی کھانا کھانا اچھا لگتا ہے اور گھر سے باہر بھی۔ اگر کبھی گھر سے باہر کھانے کا موڈ بن جائے تو پھر اوشا ریسٹورنٹ جہاں تھائی فوڈ بہت مزیدار ہوتا ہے، وہاں چلا جاتا ہوں فیملی کے ساتھ اور ہائی وے پہ کوئی بھی ریسٹورنٹ ہو یا ڈھابہ، مزا آتا ہے کھانے میں اور جس کھانے میں دہی اور اچار نہ ہو اس کھانے کا مزا نہیں آتا۔"

"آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"اس کا انحصار میرے کام پر ہے۔ اگر رات کو دیر سے سوتا ہوں تو ظاہر ہے کہ صبح دیر سے ہی اٹھوں گا اور اگر جلدی سوؤں گا تو جلدی ہی اٹھوں گا۔ یہ نہیں کہہ سکتا ___ کہ فلاں ٹائم مخصوص ہے اٹھنے اور سونے کا۔"

"بچپن میں والدین کی طرف سے کہا گیا کوئی جملہ جو ذہن نشین کر لیا ہو؟"

"ہاں .... کیوں نہیں ___ بچپن تو گزرتا ہی والدین کی نصیحتوں پر ہے۔ اس وقت سب باتیں یا تو ناگوار گزر رہی ہوتی ہیں یا بندہ دھیان ہی نہیں دیتا۔ والد صاحب ایک بات ہمیشہ کہتے ہیں کہ رزق حلال کمانا۔ اس میں بہت برکت ہے اور اس بات کو میں نے آزمایا اور سچ پایا۔ رزق حلال میں برکت بھی ہے اور سکون بھی۔"

"کس خواہش کے پورا ہونے تک زندگی کی دعا مانگتے ہیں؟"

"دو خواہشیں ہیں ایک تو یہ کہ اپنی ہی زندگی میں اپنے تمام فرائض کو بخوبی پورا کر دوں کہ میری فیملی کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو اور اپنے بیٹے کو جوان ہوتے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے دیکھوں اور یہ بھی دیکھوں کہ میرا بیٹا اپنی لائف کو انجوائے کر رہا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے فواد خان سے اجازت لی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆

ٹی وی فنکارہ اور ماڈل

سائرہ یوسف سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"سائرہ یوسف۔"
2 "پیار کا نام؟"
"سائری۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"20 اپریل 1988ء / کراچی۔"
4 "آپ کا ستارہ۔"
"میرے دو اسٹار بنتے ہیں۔ حمل (Aries) اور ثور (Taurus)"
5 "تعلیمی قابلیت؟"
"میں نے اے لیول مکمل کیا ہے ابھی۔"
6 "مستقبل میں کیا بننے کا ارادہ ہے؟"
"میں شیف بننا چاہتی ہوں۔"
7 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"ہم چار بہنیں ہیں اور بھائی نہیں ہے۔ میرا نمبر تیسرا ہے۔"
8 "شادی.... ارینج یا لو؟"
"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ جو قسمت میں لکھا ہوگا' اسی طرح ہوگی۔ کیا پتا لو ہو جائے' کیا پتا ارینج ہو جائے۔"
9 "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟"
"ایک کمرشل کیا تھا اور اسی سے شہرت بھی ملی تھی۔"
10 "پہلی کمائی؟"
"ایک کمرشل کیا تھا جس کے خاصے پیسے ملے تھے۔ کچھ اپنے پاس رکھ لیے اور باقی سارے امی کو دے دیے تھے۔"
11 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ یا تو ٹھنڈا گلاس کوک کا یا کوئی بھی جوس مل جائے۔"
12 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"
"مجھے اپنا پورا چہرہ ہی اچھا لگتا ہے۔"
13 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"
14 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"مجھے بہت غصہ آجاتا ہے۔"
15 "کھانا پکا ہوا نہ ہو تو بازار سے منگواتی ہیں کیا؟"
"نہیں جی! میں خود پکا لیتی ہوں کیونکہ مجھے پکانے کا شوق ہے۔"
16 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟"
"اپنی بہن پلوشہ سے۔"
17 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"اگر ضروری کام سے اٹھائے تو کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔ ورنہ تو تھوڑا غصہ آتا ہے۔"
18 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟"
"بہت سی چیزیں دیکھی جاتی ہیں' لیکن جو چیز بے ساختہ دیکھتی ہوں' وہ اس کے بولنے کا انداز ہے۔"
19 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"میں اپنے آپ کو بہت لکی محسوس کرتی ہوں۔"
20 "اگر اپنی مرضی سے زندگی گزارنی پڑتی تو؟"
"میں تو ابھی بھی اپنی مرضی سے گزار رہی ہوں۔ ہم پر کوئی پابندیاں نہیں ہیں۔"
21 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟"
"جب کسی بات پر بہت زیادہ غصہ آجاتا ہے۔"
22 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل

ہے؟"
"آج کل اپنے لیے۔"
23 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
"میں نہیں سمجھتی کہ میرے لیے کوئی جان دے گا۔"
24 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کس کو مانگتیں؟"
"فی الحال تو میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں اور ابھی ایسا وقت نہیں آیا کہ کسی کو مانگوں۔"
25 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"
"میرا نہیں خیال کہ کوئی شخص آپ کی زندگی بدل سکتا ہے۔"
26 "پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"
"اپنا نام۔"
27 "کوئی غلطی جس پر ندامت ہوتی ہو؟"
"میری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا کام نہ کروں' جس پہ مجھے گلٹی فیل ہو....."
28 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"جی.... کئی مرتبہ۔"
29 "کبھی سوچا کہ آج سے دس سال بعد آپ کہاں ہوں گی؟"
"کبھی کبھی سوچتی ہوں.... مگر ہر دفعہ ذہن میں مختلف مختلف سوچیں آتی ہیں۔"
30 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"امی کے ہاتھ کا۔"
31 "پسندیدہ ناشتا؟"
"سیریل اور جوس۔"
32 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب میرے ساتھ کسی کا رویہ خراب ہو یا میری بات کو غلط انداز میں لیا جائے تو میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"
33 "کوئی خواہش جو پوری نہ ہوئی ہو؟"
"کافی عرصے سے میری خواہش ہے کہ میں جلد سے جلد شیف بن جاؤں۔ اب دیکھیں کہ یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔"
34 "پسندیدہ چینل؟"
"کوئی بھی میوزک چینل۔"
35 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟"
"میرے خیال سے دونوں ہی نہیں ہوتے۔"
36 "کیا دعا سے قسمت بدل جاتی ہے؟"
"ایک لحاظ سے بدل بھی جاتی ہے مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "یہ تو آپ کی قسمت میں ہی لکھا تھا...." تو کچھ کہہ نہیں سکتے۔"
37 "اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟"
"میں اپنا غصہ کم کرنا چاہتی ہوں۔"
38 "قسمت پہ کتنا یقین ہے؟"
"قسمت پر یقین تو ہے مگر کچھ کام اپنے اختیار میں بھی ہوتے ہیں۔"
39 "ایک سوال جو خدا سے آپ روزانہ کرتے ہیں؟"

"نہیں۔ اللہ کا شکر ہے 'ابھی تک تو سب سیٹ چل رہا ہے۔"

40 "کبھی چھٹی حس بیدار ہوئی؟"

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے اور کسی بری بات کے لیے چھٹی حس ایکٹو ہوتی ہے تو میری دعا ہوتی ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ اب اسے چھٹی حس نہیں کہوں گی بلکہ سوچ کہوں گی۔ تو دعا یہ ہے کہ ذہن میں کوئی اچھی بات ہی آئے۔"

41 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"کہ امی میرے کمرے میں ہوں اور میں تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤں۔"

42 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"مجھے پہلے نہیں لگتا تھا..... لیکن پتا نہیں کیوں 'اب لگتا ہے۔"

43 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟"

"مجھے تقریبات میں جانا ہی پسند نہیں ہے۔ بہت مجبوراً ہی جاتی ہوں' اگر جاؤں تو....."

44 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"میرا خیال ہے موبائل 'لیکن لوگ اس کا غلط استعمال بھی کرتے ہیں۔"

45 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"پوری کوشش کرتی ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔ کیونکہ مجھے خود جھوٹ بولنے والے پسند نہیں۔"

46 "تہوار جوش و شوق سے مناتی ہو؟"

"چاند رات 'عید وغیرہ۔"

47 "آپ کے نزدیک ویلنٹائن ڈے کی اہمیت؟"

"بے وقوفوں والا دن ہے۔"

48 "شوبز کی بڑی برائی؟"

"کہ لڑکیوں کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

49 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"

"زیادہ تر گھر پر ہوتی ہوں اور اپنے بیڈ پر ہوتی ہوں۔ آرام کرتی ہوں۔"

50 "موبائل فون آپ کی نظر میں؟"

"بہت اچھی چیز ہے 'اگر اس کا غلط استعمال نہ ہو تو۔"

51 "شہرت ملنے پر آپ کے تاثرات؟"

"مزا آرہا ہے۔ سب بہت تعریف کرتے ہیں۔"

52 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"زندگی اسی وقت بری لگتی ہے 'جب کوئی چیز آپ کے حق میں نہ جا رہی ہو۔ مجھے فی الحال زندگی بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

53 "انٹرویو کے دوران ایک سوال جو برا لگتا ہے؟"

"اگر کوئی پرسنل سوال پوچھے تو۔"

54 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"گھورتا رہے 'ہمارا کیا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں برا لگتا تھا۔"

55 "سارے دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"

"جب میں اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزار رہی ہوتی ہوں۔"

56 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"

"دو حالتوں میں 'جب بہت غصے میں ہوتی ہوں اور جب بہت خوشی میں ہوتی ہوں۔"

57 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"

"جب میں عام سے خاص ہوگئی۔"

58 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"اللہ کا بڑا کرم ہے۔ کسی چیز کی نہیں۔"

59 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"آج کل کوئی کسی کو نصیحت نہیں کرتا۔ اس لیے اگر کوئی مجھے نصیحت کرتا ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے کہ آپ کو کوئی کچھ سمجھتا ہے تو ہی نصیحت کرتا ہے۔"

60 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"

"20 یا 30 روپے دے دیتی ہوں۔"

61 "کن باتوں پہ کنٹرول نہیں؟"

"اپنے غصے پہ کنٹرول نہیں تھا۔ مگر اب تھوڑا بہت ہو گیا ہے۔"

62 "باتیں دل میں رکھتی ہیں یا کہہ دیتی ہیں؟"

"میں بہت منہ پھٹ ہوں 'جو بات میرے دل میں ہوتی ہے 'منہ پر بول دیتی ہوں۔"

63 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

"میرا نہیں خیال..... اگر آپ کسی سے محبت کریں اور و
رسپانس نہ دے تو ظاہر ہے کہ ایسا نہیں چل سکتا۔"

64 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"

"اپنی اس سالگرہ پر سب کو میں نے کہہ دیا تھا کہ مجھے یہ 'یہ گفٹ چاہیے۔"

65 "پسندیدہ صحافی؟"

"زیادہ پالا نہیں پڑا۔"

66 "کیا اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی ہیں؟"

"بالکل جی..... سوری کرلیتی ہوں۔"

67 "ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی؟"

"میرا خیال ہے نادانی ہے۔"

68 "گھر والوں کی کس بات سے آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے؟"

"اگر میں کام میں مصروف ہوں اور مجھے دیر ہو جائے اور پھر بھی مجھے ڈانٹ پڑے تو میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔"

69 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟"

"اپنی فیملی پر۔"

70 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں؟"

"ڈرائیونگ کرتے وقت روڈ پر نظر ہوتی ہے۔ سگنل پہ ہوتی ہوں تو میوزک سن رہی ہوتی ہوں۔ فٹ پاتھ پہ کھڑے ہونے کا موقع نہیں ملا۔"

71 "کن کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"

"اپنی فیملی کے بغیر۔"

72 "کس شخصیت سے خوفزدہ رہتی ہیں؟"

"کسی سے نہیں۔ سب بہت پیار کرتے ہیں۔"

73 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"باادب اور تمیز والی بچی ہوں اور کسی کی برائی نہیں کرتی۔"

74 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہو؟"

"اگر میں صبح جلدی اٹھ جاؤں تب۔"

75 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟"

"ٹی وی دیکھ لیتی ہوں یا پھر لیپ ٹاپ پہ بیٹھ جاتی ہوں۔"

76 "دنیا گھومنے کی خواہش کس مشہور شخصیت کے ساتھ ہے؟"

"کوئی نہیں۔ دنیا فیملی کے ساتھ گھومنا چاہوں گی۔"

77 "سینما ہاؤس میں پہلی فلم کب دیکھی تھی؟"

"کچھ یاد نہیں۔ یہی کوئی چند سال قبل۔"

78 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"ترکی۔"

79 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ؟"

"(قہقہہ)..... بہت زیادہ چوٹ لگے تو 'یار.....'"

80 "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہو؟"

"اگر بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو فوراً سو جاتی ہوں۔ ورنہ تو کروٹیں ہی بدلتی رہتی ہوں۔"

81 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"

"حکمرانوں کی (قہقہہ)"

82 "انسان کا بہترین روپ 'مرد یا عورت؟"

"عورت..... کیونکہ وہ زیادہ انڈر اسٹینڈنگ ہوتی ہے۔"

83 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"

"میں تو ہر جگہ کھانا کھالیتی ہوں۔ چٹائی پہ بھی اچھا لگتا ہے 'ڈائننگ ٹیبل پہ بھی اور بیڈ پہ بھی۔"

84 "کون سے الفاظ بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"

"یار..... جی نہیں۔"

85 "مرد کب برے لگتے ہیں؟"

"زیادہ تر برے لگتے ہیں وہ 'بہت مشکل 'الجھے ہوئے اور کومپلی کیٹڈ (complicated) ہوتے ہیں۔"

86 "پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہو؟"

"اپنے بنک اکاؤنٹ میں۔"

87 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟"

"(قہقہہ) 'میں کسی کو قتل کرنا نہیں چاہوں گی۔"

100 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"تو فیس کروں گی اور دیکھوں گی کہ کن وجوہات کی بنا پر ایسا ہوا ہے۔ پھر اپنی غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گی۔" ✩

عنیزہ سیّد

جنوں کو گر آئے ستم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا‘ لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے‘ کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے‘ کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ‘ ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں ”شہناز“ نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں‘ جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔



ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مگر ماہ نور کو کمہار کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق نظر نہ آئی تو وہ الجھن کا شکار ہو گئی۔

سارہ خان عرف پری نے جب سے ہوش سنبھالا' خود کو سرکس کی دنیا ہی میں پایا تھا۔ وہ سرکس کے استاد عارف خان کو باپ سمجھتی تھی۔ عارف خان نے پری کی تربیت کی تھی۔ انہوں نے اسے سرکس کے تمام کرتب سکھائے تھے۔ جبکہ پیٹر نے اسے کتابی علم دیا تھا۔ پری چھوٹی عمر ہی سے اپنے فن میں ماہر ہو گئی۔ مگر تھوڑے بڑے ہونے پر وہ سرکس کی دنیا سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی۔

تصویری نمائش میں ایک نوجوان نے ماہ نور سے اس کی تصویر پر منہ مانگی قیمت پر خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو ماہ نور سحر زدہ سی اسے دیکھنے لگی۔ اسے اس نوجوان میں وہی چہرہ نظر آیا جو وہ ہر جگہ دیکھتی رہتی تھی۔

مولوی سراج کا تبادلہ دوسرے قصبے میں ہو گیا۔ چنانچہ وہ' آپا رابعہ اور ان کی بیٹی سعدیہ کلثوم دوسرے قصبے میں چلے گئے۔

ماہ نور میوزیکل نائٹ میں گئی تو اسے وہاں بھی گلوکار کی شکل میں وہی چہرہ نظر آیا۔ وہ دیوانہ وار اس کے قریب پہنچ گئی اس کا بازو پکڑ کر زور زور سے چلانے لگی کہ "تم چھلاوے ہو' ساحر یا بہروپیے؟" شاہ بانو اسے واپس لے آئی۔ مگر ماہ نور شدید الجھن میں مبتلا ہو گئی۔

ماہ نور کو ایک اجنبی نمبر سے پیغام موصول ہوا جس میں اس سے معذرت کی گئی تھی۔ ماہ نور نے اس نمبر پر فون کیا۔ ریسیور کرنے والا وہی نوجوان تھا جو ماہ نور کو ہر جگہ ٹکراتا رہا تھا۔ اس نے ماہ نور سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ماہ نور نے آمادگی ظاہر کر دی۔

۵

پانچویں قسط

پاپڑ بیلنا کیا ہوتا ہے۔ ماہ نور کو اس کاوش کے دوران پتا چلا تھا جو اس نے اس شام اس ریستوران جانے کے لیے کی تھی جس میں اسے بلایا گیا تھا۔

شاہ بانو کو یہ بتاتے ہوئے اسے خود پر شرم آرہی تھی کہ اسے فرقان ماموں کے ہاں ایک فنکشن اٹینڈ کرنا ہے کیونکہ یہ سراسر جھوٹ تھا اور اس سے پہلے اس نے کبھی اپنی کسی دوست سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ فرقان ماموں کو فون کر کے گاڑی اور ڈرائیور منگوانا بھی اسے اتنا ہی مشکل لگ رہا تھا وہ ان کے گھر سے انہیں تقریباً" ناراض کر کے نکلی تھی اب ان ہی سے گاڑی اور ڈرائیور مانگنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا مگر وہ اس شہر میں اجنبی تھی اسے یہاں کے راستوں سے واقفیت نہیں تھی' شاہ بانو کے ساتھ جانا ناممکن تھا سو اسے یہ شرمندگی اور مشکل دونوں ہی جھیلنا پڑی تھیں اور اسی لیے اسے اندازہ ہوا تھا کہ حقیقت میں پاپڑ کیسے بیلے جاتے ہیں۔



"پہلے چھ ماہ گزرنے کے بعد مجھے اچانک ایک دن ایسا لگا جیسے میں برف کی کسی قبر سے باہر نکل آئی ہوں۔" نادیہ نے ٹائپ کیا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم پڑھنے کے لیے ہیلسنکی کا انتخاب کرو۔" سعد نے جواب میں لکھا۔

"یہ میری چوائس نہیں تھی۔" نادیہ نے لکھا "ممی نے مجھے سپورٹ نہیں کیا۔"

"تمہاری ممی تمہیں یہاں سے جب لے کر گئی تھیں اس وقت ایسا لگتا تھا کہ جیسے دنیا صرف انہی کے قدموں میں ہے۔" یہ الفاظ لکھتے ہوئے سعد کے دل میں تلخی تھی۔ "مجھے ان کے کہے الفاظ ابھی تک یاد ہیں۔"

"عجیب سی بات ہے' تم ڈیڈی سے اتنے اختلافات کے باوجود ان سے نفرت کا اظہار کرنے والے کے سخت خلاف ہو جاتے ہو۔" نادیہ کا جواب چبھتا ہوا تھا۔

"ہاں' یہ سچ ہے۔" سعد نے اعتراف کیا۔ "اختلاف اور نفرت کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے' اس کو عبور کرنے کے لیے وجوہات کا سہارا چاہیے جو میرے پاس نہیں ہے۔" سعد نے لکھا۔

"تم وہ سہارا ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتے ورنہ اب تک عبور کر چکے ہوتے۔" نادیہ نے جواب دیا۔

"تم موسم کی بات کر رہی تھیں؟" سعد نے بات بدلی۔

"ہاں۔۔۔ موسم چھ ماہ کے بعد بدلا ہے اور اب ہر طرف سبزہ نظر آنے لگا ہے اس سے پہلے تو صرف اندھیرا تھا اور رات تھی۔"

"چلو۔۔۔ اب انجوائے کرو۔" سعد نے کہا۔

"جب میں یہاں شروع میں آئی تھی اس وقت ہر چیز منجمد تھی۔ اپنی آمد کے اگلے روز جب میں کالج جانے کے لیے باہر نکلی تو میرے سائیکل سے لٹکا اسپائیڈر (مکڑی) اور اس کا جالا بھی منجمد ہو چکا تھا۔" نادیہ نے لکھا۔

"تم نے اس کو محفوظ کر لینا تھا' اس نے کون سا پگھل کر پھر سے مکڑی اور اس کا جالا بن جانا تھا۔" سعد اپنی لکھی بات پر خود ہی مسکرا دیا۔

"تم سناؤ۔ کیا مصروفیت ہے آج کل' ڈیڈی کے کون سے کنسرن کی دیکھ بھال کر رہے ہو ان دنوں؟" اب کے بات نادیہ نے بدلی۔

"آج کل راوی چین لکھ رہا ہے' گرمیوں کی آمد آمد پر جھینگر کھا پی اور گا بجا رہا ہے' یہ تو سردیاں آنے پر اسے پتا چلے گا کہ سردیوں میں کیسے کھایا پیا اور گایا بجایا جاتا ہے۔" سعد نے مبہم سی بات لکھی۔

"سردیوں میں چیونٹا کہیں جھینگر کو یہ کہہ کر نہ بھگا دے کہ جاؤ سردیوں میں بھی گاؤ بجاؤ' ناچو نچاؤ۔" نادیہ

مسکرائی۔

"نہیں چیونٹا یہ کہہ نہیں سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس جھینگر کو سردیوں میں بھی یہ سب کچھ کر کے زندہ رہنا آتا ہے۔" سعد نے جواب دیا۔

"اگلی بار اسکائپ پر آنا۔" نادیہ نے کہا۔

"ہاں ضرور' مجھے میسیج کر دینا' میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی تصویریں بھی بھجواؤ۔" سعد نے لکھا۔

"چلو۔ دیکھتے ہیں۔" نادیہ نے آف لائن ہونے سے پہلے کہا۔ اس کی کلاس شروع ہونے والی تھی۔

"کیا ہم جیسے اپنی ماؤں اور باپوں سے بچھڑے بچے' ایک نیچرل لائف گزار سکتے ہیں۔" نادیہ نے اپنی کلاس کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

"ہماری مائیں اور باپ جنہیں عرصے تک خبر نہیں ہوتی کہ ہم کس حال میں جی رہے ہیں۔"

اس نے چلتے چلتے رک کر دو پودوں کے پتوں میں سبز رنگ کے دو مختلف شیڈز پر کچھ دیر غور کیا۔ ہیلسنکی میں بہار آگئی تھی اور خون منجمد کرنے والی سردی کی حکومت کچھ عرصہ کے لیے ختم ہو چکی تھی۔

✲ ✲ ✲

"میں معذرت خواہ ہوں ماہ نور! میں تھوڑا لیٹ ہو گیا۔"

آدھا گھنٹہ اس ریستوران میں بے کار بیٹھے انتظار کرنے کے بعد ماہ نور کے کان میں یہ جملہ پڑا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اپنے مخاطب کو دیکھا۔ بلیک جینز اور سفید ٹینس شرٹ میں ملبوس یہ وہ لڑکا تھا جو تصویری نمائش کے دن اس کے چارکول اسکیچ کی منہ مانگی قیمت دے رہا تھا۔

"نہ تو یہ بندر والا ہے نہ ہی سائیں۔" اس کے دل نے فوراً" فیصلہ دیا اور ایک بار پھر سامنے بیٹھے اس لڑکے کو دیکھا۔

"میں سعد سلطان ہوں ماہ نور!" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"میری زندگی میں اتفاقات بہت کم ہوتے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "ایسے اتفاقات جو کوئی تیسرا سنے تو سنتے ہی مسترد کر دے کیونکہ ایسے ماورائی اتفاقات حقیقی زندگی میں نہیں ہوتے۔"

ماہ نور ساکت بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

"مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ایسا ہو گیا ہے۔" پھر اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ بھی اور تمہارے ساتھ بھی۔"

ماہ نور نے اپنی پلکیں تیزی سے جھپکیں۔

"اس لیے میں نے سوچا کہ ہم دونوں ہی اس ماورائی اتفاق کو ڈسکس کر لیں بجائے دوسروں کے سامنے شور مچانے اور اپنی ہنسی اڑوانے کے۔"

"میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی۔" ماہ نور نے سرہلایا۔ "تم نے فون پر کہا تھا۔ بندر کے تماشے والے سے لے کر کنسرٹ سنگر تک سب کہانی سناؤ گے کیونکہ تم ہی تو جانتے ہو۔ مگر تم تو مزید پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"نہیں۔ میں پہیلیاں نہیں بجھوا رہا۔" وہ ہلکا سا مسکرایا اور ویٹر کی جانب متوجہ ہوا جو اس سے آرڈر لینے آیا تھا۔

"کیا لو گی تم؟"۔ اس نے ماہ نور سے اتنے بے تکلفانہ انداز میں پوچھا جیسے کوئی پرانا دوست ہو۔

ماہ نور کے ذہن میں کئی قسم کے سوال آ جا رہے تھے' اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہاں تو کہاں سے شروع کروں؟" اس نے خود ہی آرڈر دیا اور ماہ نور کی طرف متوجہ ہوا۔

"بندر کا تماشا۔" الفاظ ماہ نور کی زبان سے پھسلے۔

"ہاں!" وہ بتانا شروع ہوا' وہ ایک اوپن ایر ریستوران تھا۔ ان کے ارد گرد کئی لوگ وہاں آئے اور آ کر چلے گئے۔ شام ملگجے اندھیرے میں تبدیل ہوئی اور ملگجے اندھیرے پر رات کی تاریکی کے سائے نے ڈیرے ڈال دیے۔ جا بجا بتی قمقمے روشن ہوئے اور فضا میں خنکی بڑھتی چلی گئی مگر ماہ نور' بندر کے تماشے والے شخص' منگو کے میلے کے سائیں سعید پور فیسٹیول کے کمہار اور میوزیکل نائٹ کے سنگر کے قصے میں اتنی مگن ہوئی کہ اسے بدلتی ساعتوں کے ساتھ ارد گرد ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔

"اوہ!" سعد سلطان خاموش ہوا تو وہ جیسے حال کی دنیا میں واپس آئی اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے اور ارد گرد دیکھا۔

"کیا وقت ہو گیا؟" اس نے اپنے موبائل فون پر وقت دیکھا' رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اسے یہاں آئے ساڑھے چار گھنٹے ہو چکے تھے اس کا فون سائیلنٹ پر تھا اور اسے ممی کے علاوہ شاہ بانو کی بھی تین چار کالز آ چکی تھیں۔

"بہت دیر ہو گئی۔" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔

"کچھ خاص دیر نہیں ہوئی۔" وہ بولا اور پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ایک چھلاوے' ایک بہروپیے' ایک ساحر کی کہانی سننے کے بعد تم میرے لیے دل میں کیا محسوس کر رہی ہو؟"

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔" ماہ نور نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دبانے کے بعد کہا۔

"مگر تم تو عینی گواہ ہو اس سب کی!"

"ہاں۔ یہ ہی تو بات ہے۔" ماہ نور نے سرہلایا۔ "میں اس کو جھٹلا بھی نہیں سکتی۔"

"ایک بات پوچھوں ماہ نور!" اس نے ماہ نور کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ سب جان جانے کے بعد تم میرے لیے دل میں کیا محسوس کر رہی ہو؟" اس کے لہجے میں ایک ہلکا سا اضطراب محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"حیرت' غصہ' ناراضی' نفرت۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔" ماہ نور نے سرہلایا۔ "مگر یقینی طور پر یہ نفرت نہیں ہے۔"

"اوہ!" وہ پیچھے ہوتے ہوئے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر سیدھا ہوا' اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ماہ نور کی یہ بات سن کر بہت پُرسکون ہو گیا ہو۔

"میں خود بھی اس اتفاق پر کنفیوز ہوں کہ تم ہی' ہر بار' ہر جگہ تم ہی کیوں موجود ہوتی ہو۔" اس نے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایک نارمل سی زندگی گزارتی عام سی لڑکی ہوں' ایک ماورائی اتفاق کا حصہ میں کیسے بن گئی یہ میری سمجھ سے بھی باہر ہے۔"

"تمہاری اسکیچنگ بہت اچھی ہے۔" سعد نے کہا۔ "تم اس کو اپنا پروفیشن بنا سکتی ہو۔"

"کامپلیمنٹ (تعریف) کا شکریہ۔" ماہ نور نے اپنے بیگ کے اسٹریپ سیدھے کرتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ایک بات اور پوچھوں ماہ نور؟" اس نے ماہ نور کے اٹھنے کے ارادے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں!“ ماہ نور نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم نے بندر کا تماشا ہی سیکھنا تھا نا۔“ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ”جس بندر والے کو تمہارے چچا نے گندم کی بوری اور پانچ سو روپے دے کر خاص طور سے بلایا تھا اس سے کیوں نہیں سیکھا۔“ ماہ نور کو اس سوال نے خاصا گڑبڑا دیا تھا۔

”پھر بابے منگو کے میلے پر تم کسی بندر کے تماشے والے کی تلاش میں گئی تھیں یا ویسے ہی میلہ دیکھنے کا شوق تھا؟“

ماہ نور نے جواب دینے کے بجائے اپنے سیل فون کے بٹن دبانے شروع کر دیے۔

”تمہیں بابے منگو کے میلے میں کوئی بندر کے تماشے والا قابل اعتنا نہیں لگا مگر ایک سائیں کی آواز نے تمہیں اٹریکٹ کر لیا اتنا کہ تم اس سائیں سے بات کرنے کے لیے سارا دن اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔“

ماہ نور نے ٹیبل پر رکھے گلاس میں سے کچھ دیر پہلے چھوڑا ڈرنک کا آخری گھونٹ غیر ارادی طور پر پیا۔

”سید پور میلے میں نہ بندر کے تماشے والا تھا نہ ہی کوئی سائیں‘ ایک عام سا کمہار جو برتن گھڑنے کے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ تمہیں بری طرح چونکا گیا جبکہ اس وقت اس کے اردگرد بہت سے لوگ موجود تھے‘ کسی نے نہیں سوچا کہ اس دھوتی کرتا پہنے کمہار کے اندر کوئی اور شخص چھپا ہے۔“

ماہ نور نے اپنے بیگ میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنا چاہی جو شاید اس میں موجود ہی نہیں تھی۔

”اور پھر ایک عام سا لڑکا تم سے تمہارے اسکیچ کی قیمت پوچھتا ہے‘ ایک ایسا اسکیچ جسے تم نے بیچنا ہی نہیں اور تم اسے فروخت کرنے کی ہامی بھر لیتی ہو۔“

ماہ نور کا ہاتھ لگنے سے ٹیبل پر رکھا گلاس گر گیا۔

”فائنلی تم ایک نو آموز سنگر جو ایک آؤٹ آف کنٹرول کراؤڈ میں کچھ گا کر سنانے کی کوشش میں مصروف ہے کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف لپکتی ہو اور بھرے مجمع میں اس کا بازو پکڑ کر چلاتی ہو اس سے پوچھتی ہو‘ وہ کون ہے۔“

ماہ نور نے اپنا دھیان دوسری طرف کر لیا اور اپنے بالوں کی اڑتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ایسی بے اختیاری... کیوں لگی ماہ نور‘ خود سے پوچھا ہے کبھی؟“ وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”اس سوال کے جواب کی تلاش ہی تو مجھے یہاں تک لے آئی ہے آج۔“ ماہ نور نے دھیان اس کی طرف واپس پھیر کر کہا۔

”کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی شخص کو ایک سے دوسری دفعہ دیکھیں اس کے ایک ہی حلیے میں تو پہچان نہیں پاتے۔“ اس نے کہا۔

”پھر تم کو اتنے مختلف حلیوں اور مقامات والے لوگوں نے کیوں بار بار چونکایا؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ ماہ نور نے الجھ کر کہا۔

”پتا کرو ماہ نور۔“ وہ مسکرایا۔ ”یہ بڑا اہم سوال ہے۔“

”میں اب چلوں گی بہت دیر ہو گئی۔“ ماہ نور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”میرا خیال ہے‘ ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔“ وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے بولا۔ ”کتنے دن مزید ٹھہرو گی تم اسلام آباد میں؟“

”مجھے پہیلیوں کی طرح گنجلک‘ جلیبی کی طرح بل دار‘ چھلاووں کی طرح حاضر غائب اور بہروپیوں کی طرح نت نئے سوانگ بھرنے والے لوگوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ماہ نور نے پارکنگ لاٹ کے قریب پہنچ کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

”او ریئلی!“ وہ مسکرایا۔ ”اور پھر بھی تم اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب لینے آج یہاں آ گئیں۔“ ماہ نور نے خفگی سے سر جھٹکا۔

”میں نے بڑے اچھے الفاظ میں معذرت تو کر لی‘ اب ایک ایسی بلا ارادہ غلطی پر معاف کرنے کا اختیار تو صرف تمہارے پاس ہے۔“ وہ بولا۔

”لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس سلسلے میں شیور ہوں کہ تم ایک اچھی دوست بن سکتی ہو۔ میں تمہیں فوک سونگز کے ناقابل یقین کلیکشن سے متعارف کروا سکتا ہوں۔ بندر کا تماشا کرنے کے لیے بنیادی ٹپس دے سکتا ہوں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں مجھے یقین ہے‘ تمہیں دلچسپی محسوس ہو گی۔ لیکن پھر بھی چوائس تو بہرحال تمہاری ہے۔“ وہ اپنی گاڑی کی طرف مڑنے سے پہلے بولا۔

ماہ نور برقی روشنیوں کے سائے میں اسے خود سے تیسرے نمبر کے فاصلے پر کھڑی گاڑی میں بیٹھتے دیکھتی رہی۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی گاڑی میں لگے طاقت ور اسپیکرز بج اٹھے۔

“ We found love in a hopeless plece ”

دوسرے لمحے ہی شاید آواز کو مدھم کر دیا گیا تھا اس کی گاڑی بیک ہوئی اور دائیں طرف مڑ کر سیدھے راستے پر رواں ہو گئی۔



”تم اگر کھاؤ پیو گی نہیں تو یونہی اس بیڈ پر پڑے پڑے تمہاری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔“ سیمی آنٹی نے سیب کا چھلکا اتارتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا ہے جب نارمل زندگی قسمت ہی میں نہیں رہی تو یوں ہی پڑے پڑے گزر جائے کیا حرج ہے۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”یوں جو ہو گی‘ وہ زندگی نہیں ذلالت ہو گی۔“ سیمی آنٹی نے اشتعال میں آتے ہوئے چھری فروٹ باسکٹ میں پٹخ دی۔

”تمہیں Bed ridden (بستر پر پڑے) مریضوں کے انجام کا اندازہ ہے۔“ انہوں نے زنجیر کے ساتھ لٹکتی گلے میں پڑی عینک آنکھوں پر لگاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں خبر ہے کہ ”Bed sores“ (بستر پر لیٹے رہنے سے پڑنے والے چھالے اور زخم) کیا ہوتے ہیں؟“ سیمی آنٹی کو اپنے الفاظ کی سفاکی کی کبھی پروا نہیں ہوتی تھی۔

”تم نے کبھی ان بے بس‘ معذور اور بد قسمت لوگوں کی بابت سنا ہے جو Bed sores کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر ان کے ان زخموں میں کیڑے پڑ جاتے ہیں ان کے قریب بدبو اور وحشت کے مارے کوئی پھٹکتا تک نہیں۔“

سارہ نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔

”جن کے اپنے سگے رشتے ہوتے ہیں ماں‘ باپ‘ بہن بھائی‘ بیٹا بیٹی‘ شوہر... وہ بھی اس انجام سے دوچار ہوتے ہیں کیونکہ رشتے بھی اس صورت حال کے آگے ہار مان جاتے ہیں اور تم تو...“ پہلی بار سیمی آنٹی کوئی بے رحمانہ جملہ بولتے بولتے رک گئیں۔

"مجھ پر کب تک انحصار کیا جا سکتا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ قدرے پست آواز میں گویا ہوئیں۔

"ہائپر ٹینشن' شوگر اور جوڑوں کے درد میں مبتلا ایک چھپن سالہ عورت تم کو کب تک یوں سنبھال پائے گی۔"

انہوں نے پانی پانی ہوتی آنکھوں سے سارہ کی طرف دیکھا جس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"غنیمت سمجھو جو اس لڑکے کے روپ میں خداوند نے ایک فرشتہ تمہارے لیے بھیج دیا۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔

"میری سمجھ میں اگرچہ یہ نہیں آتا کہ اس کو تمہارے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے۔" انہوں نے ایک بار پھر سارہ کی طرف دیکھا۔ "لیکن اگر ہے اور وہ اس فلیٹ کے علاوہ تمہارے کھانے پینے' دوا دارو کا خیال کرتا ہے تو تمہیں بھی سوچنا چاہیے۔ "آخر کب تک کرتا رہے گا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں زندگی نے موقع دیا ہے کہ اس میں پھر سے متحرک ہو جاؤ' خود کو اس قابل بنالو کہ زندگی کا حق ادا کر سکو' پھر کیوں اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتیں۔" سیمی آنٹی کا پتھر مارنے کا سا انداز بے بسی میں ڈھلنے لگا۔

"کیوں خود کو اس قابل نہیں بنا لیتیں کہ دوسروں کے سہارے اٹھنے بیٹھنے کی محتاجی سے نکل کر اپنے سے بھی بری حالت میں مبتلا کسی انسان کو ایک helping shoulder (سہارا) پیش کر سکو۔

کب تک جو ہو گیا اس کا غم مناتی رہو گی۔" سیمی آنٹی نے سوال کیا۔

"ویسے بھی تو عمر تاروں' بار زاور رنگ میں کرتب دکھاتے نہیں گزرنا تھی ریٹائرمنٹ کا ایک وقت تو بہر حال آنا ہی تھا۔ سمجھو آچکا۔ اب ریٹائرڈ لائف کا کوئی مصرف سوچو' پریاں بھی بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن ان کا فیری ونڈ (پری کی چھڑی) کبھی بوڑھا نہیں ہوتا وہ اپنی سنہری جھلملاہٹیں ہر دم ہر سو بکھیر تا رہتا ہے۔"

"تھوپریا رانی۔" سیمی آنٹی کا لہجہ پتھر سے نرم اور نرم سے نرم ترین ہوا جا رہا تھا۔ "فرشتوں کا قیام ہمیشہ کے لیے نہیں رہتا خداوند انسانوں کو وقتی سہارا دینے کے لیے فرشتے بھیجتا ہے پھر ان کو ان کے اگلے کام پر لگا دیتا ہے۔"

سارہ نے سیمی آنٹی کی بات مکمل ہونے کے بعد سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کے خداوند کو یاد ہونا چاہیے کہ جو زندگی اس نے مجھے عطا کی وہ میرے ساتھ کبھی بھی فیئر نہیں رہی' زندگی نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ میں دراصل ہوں کون' میں بلیو ہیون سرکس میں کیسے آئی' مجھے پیدا کرنے کے ذمہ دار وہ دو لوگ کون تھے جن کو کبھی یاد نہیں آیا کہ میری پیدائش ان کے جسمانی ملاپ کا نتیجہ تھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔" سارہ کا لہجہ اور چہرہ دونوں ہی بے تاثر تھے۔

"آپ کے خداوند کو یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ جب بلیو ہیون سرکس میں پائے جانے کی پاداش میں مجھے نٹ بن جانا پڑا اور نٹ بننے کے دوران جسمانی اور روحانی مشقتیں جھیلنا پڑیں اس وقت میں نے کتنی بار اور کیسے کیسے اسے یاد کیا کن کن التجاؤں کے ساتھ اسے پکارا۔ مگر جواب میں اس کی طرف جامد خاموشی طاری رہی اور میری زندگی اسی رنگ میں ڈھلتی گئی جو وہ تقدیر کر چکا تھا۔ اس کو یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ برسوں رنگ میں کرتب دکھاتے کن کن تماشائیوں کے چہروں پر پھیلی آسودگی اور مسرت کو دیکھ کر میں نے اسے پکار کر التجا کی کہ ایسا ہی کچھ مجھے بھی عطا کر دے' مگر اس نے میری کسی ایسی التجا کا جواب نہیں دیا۔

اسے وہ وقت بھی یاد ہونا چاہیے کہ اس آخری کرتب کے دوران جب میں نے ہوا میں تین قلابازیاں کھانے کے بعد خود کو سیدھا کر کے واپس بار پر ٹک جانا چاہا تو اس کرتب کو دیکھ کر گلابی ربنوں سے پونیاں باندھے اس بچی کو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اپنے باپ کے سینے سے لگتے ہوئے دیکھ کر میں نے ایسے ہی ایک سینے کی جو چاہ کی تھی اسے کرنے کے دوران جب میرا دھیان بھٹکا اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاؤں کی انگلیاں تھرک گئی ہیں اور وہ بار پر جا کر نہیں ٹکی تو کوئی بھی اس ہزارویں سیکنڈ میں جو میرے اور اس حادثے کے درمیان تھا' میں نے اسے پکار کر کیا اپنی گزشتہ تمام خواہشات پر معافی اور ان سے دست برداری نہیں مانگی تھی۔ میں نے اس سے زندگی بھر کے دوران ایک صرف ایک معجزے کی بھیک مانگی تھی۔"

اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی اس کا حلق گھٹنے لگا تھا اور زبان ساتھ چھوڑ رہی تھی اس نے آنسوؤں کے گولے کو بمشکل حلق سے گزارا اور بھیگے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ کے خداوند کی دی ہوئی زندگی میرے ساتھ کبھی فیئر نہیں رہی۔ اس وقت بھی نہیں جب معجزے کی دعا مسترد ہونے پر بار سے گرتے ہوئے میں نے اس زندگی ہی سے دست برداری کی دعا کی تھی' جب میں نے اسے پکار کر کہا مجھے نہ جیتے نہ مرتے میں سے نہ کرنا۔ مجھے ابدی نیند سلا دینا۔ اس وقت بھی تقدیر کے قلم نے میری عرضی پر ریجیکٹڈ کے الفاظ لکھ کر اس پر سیاہ روشنائی کی لکیر کھینچ دی۔

پھر اب!" اس نے ڈبڈبائی نظروں سے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔

"اب کس بھروسے پر اس "زندگی" کے بھرے میں آؤں میں کسی التباس کا شکار ہو کر اس "زندگی" کی طرف چل دوں جس نے سدا میری طرف اپنا منفی پہلو موڑے رکھا۔ جس کو آپ کے خداوند نے ہدایت کر رکھی ہے کہ یہ اس روپ میں میرے سامنے آئے جو میرا "من چاہا" نہیں ہے۔

مت سنائیں مجھے حرکت اور عمل کی داستانیں۔" اس نے سر جھٹکا "انجام کی کوئی بھی لرزہ خیزی مجھ پر آغاز کی سفاکی سے بڑھ کر دہشت کی کیفیت طاری نہیں کر سکتی۔"

"پڑا رہنے دیں مجھے یوں ہی' ہونے دیں زخم اور بننے دیں میرے جسم کو جیتے جی خوراک حشرات الارض کی۔" اس نے سخت اور بلند آواز میں کہا۔

سیمی آنٹی بے یقینی سے اس کے الفاظ سن رہی تھیں۔ وہ اس کی زندگی کے سارے سفر سے واقف تھیں۔ ایک پُر اعتماد' بے خوف' ہنستے کھلکھلاتے خطرات سے بھرپور کرتب دکھاتی اس لڑکی کے دل میں شروع ہی سے اتنی تلخی اور اتنی مایوسی تھی' انہیں اس کا اندازہ اس روز پہلی بار ہوا تھا مگر وہ اس کے ان الفاظ سے ہار مان کر اسے زندگی کی طرف لوٹ آنے کی بلاشیری دینے سے باز آنے والی نہیں تھیں۔

"سعد کے بارے میں سوچا تم نے کبھی؟" انہوں نے سارہ کی تمام تلخیاں سننے کے بعد تحمل سے پوچھا۔

"کیا سعد وہ معجزہ نہیں ہے جس کی تم نے دعا کی تھی۔ کیا وہ ان تمام التجاؤں' پکاروں اور دعاؤں کا جواب نہیں ہے جو عمر بھر تم نے خداوند سے کیں۔

کیوں اس خداوند نے تمہارے چکنا چور' شکستہ اور نیم جان وجود کو اٹھا کر اس کی مسیحائی کی طرف لے جانے کو اس لڑکے کو وہاں بھیجا؟" سیمی آنٹی نے اس سے سوال کیا۔

"کیا دلچسپی تھی اس لڑکے کی ایک بے کار اور قریب المرگ وجود میں؟

کیوں اس کے دل میں مدد کا' مسیحائی کا جذبہ اس نے اتارا جو تمہارے بقول تمام عمر تمہاری پکاریں مسترد کرتا رہا۔

اس کو تمہاری زندگی ختم کرنا ہوتی تو اسی وقت کر دیتا جب تم بار کے بجائے زمین پر جا گری تھیں۔ تم کو زندگی کی کچھ اور اذیت دینا مقصود تھا تو ان ابتدائی دنوں جب تم زخم زخم اپنی چھولداری میں بغیر کسی علاج کے پڑی تھیں اور تمہارے قریب مکھیوں کے علاوہ کوئی دوسرا جان دار آنے کو تیار نہیں تھا' کے بعد ہی ختم کر دیتا۔ کیوں اس کو تمہاری موت کے بجائے زندگی مقصود تھی جو اس نے اس لڑکے کو تمہاری تلاش میں لگا دیا جو گھڑی بھر کو سرکس کے دوران تمہیں گرتا دیکھ کر چلا گیا تھا۔

یہ کوئی آسان کام نہیں تھا جس کا ذمہ اس نے لے لیا۔" سیمی آنٹی نے اسے باور کرانا چاہا۔ "زخموں سے چور جسم کے زخم کتنے عرصے میں بھرے' جگہ جگہ سے ادھڑی کھال کی گرافٹنگ کیسے ہوئی ٹوٹی رگوں میں خون دوبارہ کیسے جاری ہوا۔۔۔ یہ دنوں اور ہفتوں کا نہیں مہینوں کا عمل تھا اور وہ کیسا پر عزم تھا یہ میں جانتی ہوں۔ اس کو یہ عزم' یہ حوصلہ کس نے عطا کیا اس کے دل کو اتنی نرمی اور مزاج کو اتنی عاجزی کس نے بخشی۔ کبھی سوچا تم نے؟ مگر وہ تو صرف وسیلہ تھا۔" دم لینے کو رکنے کے بعد وہ دوبارہ کہنا شروع ہوئیں۔ "اصل مرضی اس خداوند کی ہی چلنی تھی۔ جس نے تمہارے قریب الخاتمہ جسم و روح کو دوبارہ زندگی بخشنے کے لیے سعد کو وسیلہ بنا کر بھیجا۔" سیمی آنٹی نے سرسری نظر سارہ پر ڈالی جو رونا دھونا بھول کر مبہوت ہوئی ان کی بات سن رہی تھی۔

"گلے گزاریاں' ہم انسان بہت کرتے ہیں' شکر گزاری کی طرف آنے کا نام نہیں لیتے۔" انہوں نے عینک اتار کر رومال سے اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے اندر شیطان بیٹھا ہے جو شکر گزاری کے جذبے پر جھپٹا مارتا ہے' اسے آگے جانے سے روکتا ہے دل میں گلے شکوے شکایتوں کا غلبہ رکھتا ہے۔ خداوند کی مرضی تو صرف یہ ہے کہ اس شیطان کو بچھاڑ کر بے دخل کیا جائے۔ نہ ہم اس کی مرضی پوری کرتے ہیں نہ ہماری عرضیوں پر قبولیت کی مہریں لگتی ہیں پھر ہم چلاتے ہیں فلاں وقت پکارا' فلاں چیز کی بھیک مانگی فلاں وقت التجا کی۔ خداوند کی طرف سے جامد خاموشی پائی۔"

"مجھے بھوک لگی ہے۔" مبہوت سارہ نے سیمی آنٹی کی گفتگو کا طلسم ٹوٹنے پر نیچی آواز میں کہا۔

"سیب کھاؤ۔" انہوں نے پلیٹ اس کے سامنے رکھی۔

"میں نے گھونٹی دال کے ساتھ روٹی کھانی ہے ٹماٹر کی قاشیں سجا کر۔" اسے سرکس کے دنوں کا وہ کھانا یاد آیا جو سیمی آنٹی کے مشاق ہاتھ بڑے پیمانے پر بنایا کرتے تھے۔

"پیاز اور ہری مرچوں کا کچومر بھی بناتے ہیں۔" سیمی آنٹی اس کھانے کے تذکرے پر ایک دم خوش ہو گئیں اور تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

Its 11:30 am (صبح کے ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔) کلک کی آواز کے ساتھ سامنے کی دیوار پر لگے کلاک کا نیلا پرندہ باہر نکل کر اعلان کر رہا تھا۔

"آج ایک بار پھر تم وقت کا اعلان کرتے رہو۔ دیکھتے ہیں اس بیڈ سے اس چیئر تک پہنچنے میں مجھے آج کتنا وقت لگتا ہے۔" سارہ نے نیلے پرندے کی طرف دیکھ کر کہا۔ نیلا پرندہ جیسے ہولے سے سرہلا کر واپس اپنے باکس میں بند ہو گیا۔

"آج اس کھڑکی تک پہنچنے کے بعد میں گنتی گنوں گی۔"

سارہ نے سیمی آنٹی سے سنی باتوں کو یاد کرنے کے بعد ایک نئے حوصلے کو اپنے اندر مجتمع کرنے کی سعی کرتے ہوئے سوچا۔

"پھر اس کے بعد اس سے اگلے قدم کے لیے مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی اور میں ایک دو تین کا ورد کروں گی اگر جو تم پہنچو۔" اس نے تصور میں بیٹھے شخص کو مخاطب کر کے سوچا۔



میدانی علاقوں میں گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ صبح' در شام میں خوشگوار مگر دوپہریں گرم رہنے لگی تھیں۔ اسکول سے واپسی پر گھر پہنچتے پہنچتے دو ڈھائی بج جاتے تھے قصبے کے اسکول سے بچیوں کو گاؤں پہنچانے والا تانگہ سڑک پر ہی گاؤں کی بچیوں کو اتار دیا کرتا تھا اس کے بعد اسے اگلے گاؤں کی بچیوں کو پہنچانا ہوتا تھا سرکاری اسکول کی مخصوص وردی نیلی قمیص' سفید شلوار اور سفید بڑے سے ڈوپٹے میں ملبوس' کتابوں کا وزنی بستہ اٹھائے سعدیہ گاؤں کے آغاز میں موجود کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر جما جما کر قدم رکھتے ہولے ہولے چل رہی تھی۔ دوپہر میں سورج کی حدت بڑھ جانے کی وجہ سے اسے پسینہ آ رہا تھا اس کی کوشش تھی کہ وہ ان پگڈنڈیوں پر چلے جن کے ساتھ سایہ دار درخت تھے۔ مگر اس روز پھر بھی اسے سڑک سے گھر تک کا فاصلہ معمول سے زیادہ لگ رہا تھا۔ چلتے چلتے سر اٹھا کر اس نے سامنے دیکھا۔

چوہدری سردار کا فارم ہاؤس اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ سامنے کھڑا تھا۔ روزانہ اسکول آتے جاتے وہ اس فارم ہاؤس کو غور سے دیکھتی تھی۔ وہ اتنے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا کہ سعدیہ کبھی تعین نہ کر سکی تھی کہ وہ کہاں سے شروع ہوتا تھا اور کہاں ختم ہوتا تھا اس کے گرد کھڑی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ ان سے اوپر جاتے نظر تھک جائے۔ اس کا آہنی گیٹ سیاہ رنگ کا تھا اور کبھی کبھار ہی کھلا نظر آتا تھا جب بھی یہ گیٹ کھلا نظر آتا تھا سعدیہ اور اس کے ساتھ کی لڑکیاں کتنی کتنی دیر اندر جھانک کر اندازہ لگانے کی کوشش کرتیں کہ اندر کیا ہوتا تھا۔ وسیع و عریض باغوں' پھولوں' پودوں اور درختوں سے پار اندر کی عمارت شاید ہی کبھی نظر آئی ہو کندھوں پر بندوقیں لٹکائے مختلف مرد البتہ اکثر نظر آتے تھے۔

"یہاں ڈاکو اور چور سارا دن چھپے رہتے ہیں۔ رات کو باہر نکل کر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ لوگوں کو گولیاں مار کر قتل کرنے والے بھی یہاں ہی رہتے ہیں۔" سعدیہ کی سہیلی روبینہ ان کے سامنے انکشاف کرتی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" باقی لڑکیاں سوال کرتیں۔

"میرا چاچا بھی پہلے ادھر ہی کام کرتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ ایک ٹوٹی کرسی اٹھالی' گھر لے جانے کے لیے' اس کے گھٹنے میں گولی ماروی تھی کسی نے اندر' ساری عمر کے لیے لنگڑا ہو گیا۔ بے چارہ وہ بتاتا ہے سب کچھ۔" روبینہ نے بتایا اور سب کے دل پر ہیبت طاری ہو گئی۔

"مگر چوہدری صاحب تو بڑے اچھے آدمی ہیں۔" سعدیہ حیران ہو کر بولی۔

"ہم جب یہاں آئے تھے تو ہمیں مسجد سے الگ گھر انہوں نے ہی دیا تھا۔ ہمارے گھر فارم سے سبزیاں اور پھل بھی بھیجتے ہیں۔ ابا جی کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ گندم اور چاول کی بوریاں بھی ہمارے گھر ادھر سے ہی آتی ہیں۔"

"تمہارے ابا جی سیپی ہوں گے۔" ایک لڑکی نے بتایا۔

"کوئی نہیں' ابا جی کو تو مسجد سے تنخواہ ملتی ہے۔" سعدیہ نے اس لڑکی کو جھٹلایا۔

"چوہدری بڑا چالاک ہے۔" روبینہ قہقہہ لگا کر ہنستی۔ مولوی صاحب کو نذرانے دے کر اپنا کالا دھن چٹا کرتا ہے۔ مولوی جی تو اس کے حق میں دعائیں ہی کریں گے نا سوغاتیں لے کر۔"

سب لڑکیاں اس بات پر ہنستیں اور سعدیہ کو بہت برا لگتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے سب ابا جی پر رشوت لینے کا الزام لگا رہی ہوں' جو کہ سراسر بہتان تھا۔ ابا جی تو گھر میں بھی اور مسجد میں بھی صاف صاف لفظوں میں بتاتے تھے کہ رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اب چوہدری صاحب بھلے جہنمی ہوں' ابا جی جیسا تہجد گزار' قرآن کا حافظ شخص تو اپنے عمل جہنم کی آگ میں نہیں جھونک سکتا۔

اس روز بھی سعدیہ فارم ہاؤس کو دیکھ کر یہی باتیں یاد کرتی چلتی جا رہی تھی۔ آج اس کے ساتھ جانے والی چاروں لڑکیوں نے نائیوں کی بیٹی کی شادی کی وجہ سے چھٹی کی تھی اور صرف وہ ہی اکیلی اسکول گئی تھی۔ اکیلے ہونے کی وجہ سے راستہ اور بھی لمبا لگ رہا تھا۔ فارم ہاؤس کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا۔ فارم ہاؤس کی مشرقی دیوار سے باہر نکلا لمبا سا نل پانی اگل رہا تھا اور ماسی رشیدہ اس ہودی کے قریب بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی جہاں یہ پانی

آکر گر رہا تھا۔

"السلام علیکم ماسی!" سعدیہ نے رک کر تعظیماً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" ماسی نے سر اٹھا کر سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"سکولوں پڑھ آئی (اسکول سے پڑھ آئی۔)" سعدیہ نے سر ہلایا۔

"گرمی بڑی اے' آمیری دھی دو چھپا کے پانی کے منہ پر لگا لے اور دو گھونٹ پانی پی لے' بڑا ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔" ماسی نے دعوت دی۔

"او ماسی او ماسی... ایہہ پانی تے کھارا اے۔" نہ جانے کہاں سے کھاری نمودار ہوا اور ماسی کو پانی پینے سے روکنے لگا۔

"تیرا بیڑا ترجائے (تیرا بھلا ہو) مجھے کیا پتا یہ پانی کھارا ہے' کھاری کی طرح۔" ماسی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"آپ لوگ بھی تو جہاں پانی دیکھو' بیٹھ جاتے ہو۔" کھاری نے کہا۔

"شکر ہے میں پی نہیں لیا' نہ ایس نمانی نے بیتیا۔" ماسی نے دوپٹے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

سعدیہ نے کھاری کی طرف دیکھا۔ جو دانت نکوس رہا تھا۔

"یہ کتنا خوش قسمت ہے' ہر وقت فارم ہاؤس میں رہتا ہے۔" سعدیہ نے سوچا۔ چوہدری صاحب ان کے گھر جو بھی چیز بھیجتے کھاری ہی لے کر آتا تھا اور اس کی سعدیہ کی اماں سے اچھی خاصی بے تکلفی تھی۔ اماں ہمیشہ یتیم یسیر بچہ کہہ کر کھاری کی خوب خاطر تواضع کرتی تھیں۔

"جو یہ پانی پی لیتی اور اسے کچھ ہو جاتا تو مولوی صاحب کتنا ناراض ہوتے۔" ماسی نے سر جھٹک کر کہا۔ کھاری نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"ماسی! سعدیہ' مولوی صاحب اور بھین جی سے کتنی چھوٹی ہے نا۔" کھاری کی اس بات کی کیا تک تھی۔ سعدیہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر کھاری کا کیا تھا اس کی تو سنا تھا اکثر ہی باتیں بے تکی ہوتی تھیں۔

ماسی نے ٹھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "بچے' ماں' باپ سے چھوٹے ہی ہوتے ہیں۔"

"نا ماسی نا!" کھاری نے سر ہلایا۔ "سعدیہ بہت ای چھوٹی ہے۔ مولوی صاحب کی عمر دیکھو' بھین جی ان سے کتنی چھوٹی لگتی ہیں اور سعدیہ ان دونوں سے کتنی چھوٹی ہے۔ مجھے لگتا ہے مولوی صاحب اور بھین جی کی شادی بڑی لیٹ ہوئی تھی۔ سعدیہ دونوں کی پچھلی عمر کی اولاد ہے۔"

"او چل شدائیا" ماسی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تیری بات کا نہ کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر' تینوں گھر چھوڑ آؤں' تیری ماں سے بھی مل لوں گی۔" ماسی نے سعدیہ سے کہا جو کھاری کی بات پر غور کر رہی تھی۔

"مانو نہ مانو میں صحیح کہہ رہا ہوں۔" کھاری نے سعدیہ کی طرف دیکھ کر دانت نکالتے ہوئے کہا۔

سعدیہ نے عجیب نظروں سے کھاری کی طرف دیکھا اور ماسی کے ساتھ چل دی۔ سب کی نظر میں احمق کھاری نے سعدیہ کا دھیان اس روز ایک ایسی بات کی طرف لگا دیا تھا جس پر اس نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔



"ایک چارکول آرٹسٹ ہیں فلزا ظہور' اسلام آباد ہی میں رہتی ہیں۔" مجھے ان کا اتا پتا کچھ معلوم نہیں مگر مجھے ان سے ملنا بھی ہے کیا کروں۔

ماہ نور کا یہ پیغام سعد کے سیل فون پر اس وقت ریسیو ہوا جب وہ ابراہیم کے جم میں ٹریڈ مل پر بھاگ رہا تھا۔ اس کی جیب میں رکھا فون وائبریٹ ہوا۔ وہ رک کر محض ایک میسج پڑھنے کے لیے اپنے پسینے میں شرابور جسم کو وقفہ

نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ اسے رک کر یہ میسیج پڑھ لینا چاہیے۔ اس نے مشین آف کی اور ٹریڈ مل سے اتر آیا۔ تولیے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے چیئر پر بیٹھنے سے پہلے وہ یہ پیغام پڑھ چکا تھا۔ یہ پیغام اس کے لیے ایک سرپرائز تھا۔ اگرچہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس روز کی ملاقات کے بعد ماہ نور ضرور اس سے رابطہ کرے گی مگر وہ بہت پُر یقین بھی نہیں تھا۔

"تمہاری خاطر میں ان خاتون کا پتا جلد ہی لگا لوں گا۔" اس نے تیزی سے جواب ٹائپ کیا اور بھیج دیا۔

"تو نے ٹریڈ مل کی جان جلدی نہیں چھوڑ دی آج۔" اسی دم ابراہیم اس کے قریب آیا "کہیں تیری کوئی کیلوری جلنے سے رہ نہ گئی ہو۔"

"جو رہ گئی ہو گی وہ تو لے لینا ادھار۔" وہ مسکرایا۔

"میرے پاس پہلے ہی وافر ذخیرہ ہے کیلوریز کا' تیری کبھی کم پڑ جائیں تو مانگ لینا۔ ادھار نہیں پکی دے دوں گا بخوشی۔" ابراہیم نے اپنے کسرتی مضبوط جسم پر شرٹ کھینچ کر نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"او نا بابا!" سعد نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے "تیری مرغ کڑاہیوں' چپلی کبابوں' ہریسوں' نہاریوں اور افغانی پلاؤوں کی پلی کیلوریز لینے کا رسک کون لے' جو دس گھنٹے بھی ان مشینوں پر گزار کر جان نہ چھوڑیں۔" اس نے جم کے ہال میں موجود ایکسر سائز مشینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ کتنا اسٹاؤٹ (مضبوط) ہے میرا جسم۔" ابراہیم نے بازو دبا کر اپنے ڈولے دکھاتے ہوئے کہا۔ "تیری طرح دبلا پتلا نہیں ہوں' نرا قد اور ہڈیاں۔"

"تجھے مبارک تیرا مضبوط جسم' میں ایسے ہی بھلا۔" سعد نے جھک کر اپنے سینکرز کے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

"آج کیا پروگرام ہے۔" ابراہیم نے پوچھا۔ "چلتا ہے بنی گالا اجمل کی طرف' وہ آج نمک اور کالی مرچ والی لیمب کڑاہی بنا رہا ہے مکھن میں' پُرزور دعوت دی ہے اس نے ہمیں۔"

"او جگر' کبھی ان مسئلوں سے آگے بھی سوچا کر' زندگی صرف کھانا پینا اور کسرتیں کرنا ہی نہیں۔" سعد نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"تو تمہارے ساتھ اوٹ پٹانگ جگہوں پر اونگی بونگی حرکتیں کرنے کون جاتا ہے اگر میں صرف کھانے پینے اور کسرتیں کرنے ہی میں لگا رہتا ہوں تو۔" ابراہیم نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"وہاں بھی تو کاڑھے کے پیالے پیتا اور دیسی گھی کے جلیب کھاتا پھرتا ہے۔" سعد نے مسکرا کر کہا اور ایک بار پھر اپنے سیل فون کے ان باکس کو چیک کرنے لگا۔

"لے پھر میں چلتا ہوں' تو ڈنر نکلوا اپنے آنریبل ممبرز کے۔" سعد نے ہاتھ ابراہیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جا کدھر رہا ہے" ابراہیم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"کسی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔" سعد نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کسی ملا' حکیم کہ طبیب کی یا پھر سائیں کی؟" ابراہیم نے ابرو اچکاتے ہوئے سوال کیا۔

"اس بار کسی سائیکاٹرسٹ کی" سعد نے سر ہلایا "جو نبض پر ہاتھ رکھے بغیر مرض کے بارے میں بغیر کچھ پوچھے جان لیتا ہے۔"

"تیری باتیں باتیں نہیں گتھیاں ہیں۔" ابراہیم نے سر جھٹک کر کہا۔

"اور تو ان گتھیوں کو سلجھانے سے بہتر یہ سمجھتا ہے کہ گشتابے کھا کر سو جایا جائے۔" سعد نے ایک بار پھر

اس پر چوٹ کی۔

”دیکھ لے تو زیادتی کر رہا ہے“ ابراہیم نے یاد دلایا۔

”معاف کر دے بھائی۔“ سعد نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اور ابراہیم کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا کر باہر کو چل دیا۔

”فلزا ظہور۔“ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر میسج پڑھ کر نام کنفرم کیا۔ دوسرے لمحے وہ کسی کو کال کر رہا تھا۔



اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فلزا ظہور کو ڈھونڈنے کے لیے اس نے سعد سلطان کو میسج کیوں کیا تھا۔ سعد سلطان سے اس روز کی ملاقات کے بعد گھر آ کر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ تجسس ختم ہوا‘ اتفاقات کے سلسلے کا راز کھلا اور دل پر چھایا غبار چھٹ گیا‘ مزید کسی التباس کا امکان نہیں‘ ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب مل گئے منطق اور بصارت دونوں کی جنگ بھی ختم ہو گئی‘ اب وہ ایک پرسکون اور نارمل زندگی گزارنے لگے گی۔ مگر ہونے یہ لگا تھا کہ اس دن کے بعد سوتے جاگتے‘ کھاتے پیتے‘ کسی دوسرے شخص سے گفتگو کرتے‘ گھومتے پھرتے غرض ہر وقت‘ ہر جگہ سعد سلطان کا تصور اس کے لاشعور میں رہتا تھا‘ اس نے اپنے ذہن کو کئی بار جھٹکا‘ اس خیال سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی‘ مگر ناکام رہی‘ اور جب شاہ بانو نے اس امکان کو مسترد کر دیا کہ بغیر کسی پتے کے وہ فلزا ظہور کو تلاش کر سکتی ہیں اسی روز اس نے بغیر کچھ اور سوچے فلزا ظہور سے متعلق سعد کو میسج کر دیا تھا۔

”درحقیقت تم کسی بہانے اس سے رابطے کی خواہش مند تھیں“ اس رات اسی بات پر غور کرتے کرتے اس کے لاشعور نے اس کے شعور کو دو ٹوک بتایا۔

”یہ بھی غلط نہیں کہ وہ لڑکا متاثر کن شخصیت کا مالک ہے اور اس کی سنائی کہانی اس سے بھی زیادہ متاثر کن ہے۔“ اس کا ذہن یہ پیغام وصول کر رہا تھا اور اس کا دل اس پیغام کو جھٹلا نہیں پا رہا تھا۔

”یہ بھی درست ہے کہ پہلے ان بہروپیوں کا سحر تھا‘ اب سعد سلطان کا سحر ہے‘ جو تم پر طاری ہے۔“

”یہ بھی سچ ہے کہ دنیا میں چند ہی ایسے لوگ ہوتے ہیں‘ جو ملتے ہیں تو انسان کے ذہن پر اپنا ایسا مضبوط تاثر چھوڑ جاتے ہیں کہ اس تاثر سے چھٹکارا ناممکن ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر کسی کو ایسے لوگ ملیں‘ مگر جن کو ملتے ہیں ان کے لیے ایسے لوگوں کے تصور سے چھٹکارا مشکل ہوتا ہے اور تم ان ہی لوگوں میں شامل ہو چکی ہو جن سے ایسے لوگ ملتے ہیں۔“

”یہ احساس کیا ہے۔“ اس نے اپنے لاشعور کی حقیقت بیانی سے ہار مانتے ہوئے کروٹ بدل کر سوچا۔ ”مجھے وہ اچھا لگا یا کچھ اور؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ”اس نے کہا تھا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں‘ کیا میں اس کی اچھی دوست بننا چاہتی ہوں؟“ دوسرا سوال ذہن میں آیا۔

”سو رنگ بدلنے والا سو سوانگ بھرنے والا‘ ایک شخص دوستی کے لیے قابل بھروسا ہو سکتا ہے۔“ تیسرا سوال ذہن میں نازل ہوا۔

”اگر نہیں ہو سکتا تو میں پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل اسی کے بارے میں کیوں سوچے چلی جا رہی ہوں۔ کیا میں عام لڑکیوں کی طرح ایک اجنبی لڑکے کے لیے اپنے سیدھے سادے راستے سے اتر رہی ہوں؟“ چوتھا سوال آیا۔

”نہیں۔“ پھر اس کا دل اس کی مدد کو آیا۔ ”اس کی دوستی کی آفر پر تمہارا دل یوں ہی لبیک کہنے کو نہیں کہہ رہا۔ تم جانتی ہو کہ اس سے دوستی میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ اب کے اس نے ذہن اور دل کو اپنے قابو میں کر کے سوچا۔ ”میوزیکل نائٹ والی میری بے ساختہ حرکت کو ایکسپلائٹ بھی کیا جا سکتا تھا‘ اسے منظر عام سے ہٹوایا گیا۔ یہ کس نے کیا یقیناً“ سعد سلطان نے۔ اور جو شخص انسان کی عزت کا ساتھی ہو وہ ہی بہترین دوست ہوتا ہے۔“ اس نے آخری بات سوچی۔

”بس تو پھر طے ہے‘ سعد کو فلزا ظہور کے بارے میں میسج کر کے میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

”اور یہ بھی طے ہے کہ فلزا ظہور سے ملنا بہت اہم بات نہیں تھی‘ مگر وہ میسج میں نے صرف اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے کیا تھا۔“ اس نے سوچا اور مسکرا کر اپنے سیل فون کے ان باکس میں وہ جواب پڑھنے لگی۔

”تمہاری خاطر ان خاتون کا پتا میں جلد ہی لگا لوں گا۔“ وہ یہ پیغام دن میں کئی بار پڑھ چکی تھی اور اب دوبارہ سے پڑھنے کا سلسلہ شروع تھا۔

”تمہاری خاطر۔“ اس پیغام کے سب سے اہم الفاظ یہ تھے۔ اور یہ ہی وہ الفاظ تھے جنہیں دیکھنے کے لیے وہ یہ پیغام بار بار پڑھ رہی تھی۔



وہ شاہ بانو کے ساتھ عبید بھائی کی دی سید پور میلے کی ویڈیو دیکھ رہی تھی‘ میوزیکل نائٹ میں سعد سلطان کے گائے ہوئے گانے شاہ بانو نے بار بار ری پلے کر کے سنے تھے۔ رائی حانہ کے بعد وہ دوبارہ فوک پر آگیا تھا۔

گھوم چرخڑا گھوم۔۔۔ تیری کتن والی جیوے
کتن والی جیوے۔۔۔ لڑیاں وٹن والی جیوے
(اے چرخے خوب گھوم۔۔۔ تجھ پر سوت کاتنے والی جیے)
(سوت کاتنے والی اور سوت کی بٹیں بنانے والی جیے)

ان لوگوں کے چلے آنے کے بعد اس نے یہ مشہور کافی سنا کر مجمع میں اکثر لوگوں کو حال کھیلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تم نے سنا۔“ شاہ بانو نے پانچویں بار یہ کافی سننے کے بعد ویڈیو بند کی اور اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لڑکا پیدائشی گلوکار ہے۔“

”اور تمہاری وجہ سے اس روز ہم نہ اس کا رائی حانہ سونگ سن سکے نہ یہ کافی“ ماہ نور نے سر جھکا لیا۔

”اب تم اس کے کلوز اپس دیکھو اور سوچو کہیں سے بھی یہ لڑکا لگ رہا ہے‘ جو تمہارا اسکیچ خریدنے آیا تھا۔“ شاہ بانو نے پوچھا۔

ماہ نور نے سر جھکائے جھکائے نفی میں سر ہلا دیا۔

شاہ بانو کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے خفگی کا شدید تاثر ابھرا مگر پھر اس نے اسے کنٹرول کر لیا۔

”چلو خیر۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”جو بھی ہوا تمہارا الوژن تو دور ہوا۔“ ماہ نور کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اسی وقت اس کے سیل فون پر میسج کی ٹون بجی۔

”فلزا ظہور بنی گالہ میں رہتی ہیں‘ ایڈریس اور فون نمبر بھیج رہا ہوں۔“ ماہ نور نے یہ میسج پڑھا اور محفوظ کر لیا۔



”کھاری ٹھیک ہی کہہ رہا تھا‘ آپا جی کتنے بوڑھے سے ہیں اور اماں ان کی نسبت اتنی بوڑھی نہیں ہیں‘ پھر بھی میں اتنی چھوٹی کیوں ہوں۔“ سعدیہ کا دھیان اس دن اپنے سبق سے زیادہ کھاری کی بات کی طرف آ رہا تھا۔

”اماں بھی خوب ہیں نہ بالوں میں مہندی لگاتی ہیں نہ ناخنوں پر۔“ اسے اماں کی ملنے والی دو تین خواتین ایسی یاد

آئیں جو سفید بالوں میں مہندی لگا کر اس کی سفیدی چھپا لیتی تھیں اور ناخنوں پر بھی مہندی لگاتی تھیں۔

"پر اماں کتنی پیاری ہیں۔" اس نے چولہے میں اپلے رکھ کر آگ جلاتی اماں کو دیکھا۔

"پتا نہیں اماں کی ابا جی سے شادی کیسے ہو گئی' ابا جی بے چارے تو اللہ معافی اگر چہرے پر داڑھی نہ ہو تو بھلے جن لگیں۔" اسے اپنی سوچ پر خود ہی ہنسی آ گئی۔

"میں کس کی طرح ہوں بھلا۔" پھر اس نے ایک چھوٹا آئینہ لے کر اپنا چہرہ اس میں دیکھا۔ اسے زیادہ سمجھ نہیں آئی کہ اس کے نین نقش کس سے ملتے تھے۔

"کبھی میرے پاس بھی دو سے زیادہ سوٹ ہوں نا گھر میں پہننے کے لیے۔" نوعمر دل میں پہلی تمنا اٹھی۔

"جو دو سوٹ ہوتے ہیں وہ بھی بس ایسے ہوتے ہیں کہ دو' تین بار دھونے کے بعد جن کے رنگ بھی نکل جاتے ہیں اور وہ بری طرح گھسے ہوئے لگنے لگتے ہیں۔" پہلی ہوک نے دل میں قدم رکھا۔

"اماں سے کہوں۔" اس نے پھونکنی سے چولہے کی آگ میں پھونکیں مارتی ماں کو دیکھا کہ نئے کپڑے لے دیں تو وہ بے چاری کہاں سے لے دیں گی' میرے یونیفارم کی شلواریں وہ آٹے کی تھیلیوں کا کپڑا جوڑ کر سیتی ہیں' گھر کے کپڑے کیسے نئے لے دیں۔" اسے ماں کے ہاتھ کی تنگی یاد آئی۔

"شمائلہ اور بسمہ کے چاچا اور خالہ جب آئے تھے تو ان کے لیے نئے کپڑے اور جوتے بھی لائے تھے۔" بھٹکتی سوچ نے ایک موڑ کی طرف رخ کیا۔

"میرے تو نہ کوئی چاچا ہیں نہ خالہ ہیں۔" پہلی بار یہ سوچ بھی ذہن میں ابھری۔

"اماں سے بھلا کبھی پوچھوں تو سہی کہ نانا' نانی' دادا دادی کون تھے۔" ایک بار پھر اماں کی طرف دیکھ کر سوچا۔

"توبہ اماں کبھی نہ بتائیں۔" اسے جھرجھری آ گئی۔

"کیا ہوا جو ڈانٹ لیں گی تھوڑا بہت۔" پھر اس نے دل میں فیصلہ کیا۔

"میں نے بھی ضرور پوچھ لینا ہے کسی دن۔" اس روز کھاری کی مذاق میں کہی بات نے سعدیہ کی سوچ کو پہلی بار ایک نیا رخ عطا کیا اور اسی رخ پر سوچتے سوچتے بائیالوجی کا ٹیسٹ بھی پہلی بار یاد نہ ہو سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ بانو اور عبید بھائی کی فیملی ایبٹ آباد جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

"بہت مزا آئے گا' ایبٹ آباد سے آگے کے علاقے بھی دیکھیں گے۔" شاہ بانو نے ماہ نور سے کہا۔

"میرا خیال ہے اتنے دن میں فرقان ماموں کے پاس واپس چلی جاؤں۔" ماہ نور کو نجانے کیوں ایبٹ آباد جانے میں تامل تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی' تم ادھر آئی ہو اپنی ممی کی اجازت سے۔" شاہ بانو نے کہا۔

"لیکن فرقان ماموں بھی ناراض ہوئے ہیں نا۔" ماہ نور کے پاس بہانہ اچھا تھا۔

"ہم اتنے دن اکٹھے رہ لیے' اب جانے سے پہلے تم ایبٹ آباد رہ آؤ' میں فرقان ماموں کی ناراضی دور کر لیتی ہوں پھر واپس لاہور چلے جائیں گے۔"

"تم کیسے رہو گی اس سونے کے محل میں۔" شاہ بانو نے اسے ڈرایا۔

"کوئی بات نہیں' رہ لوں گی۔" ماہ نور نے کہا۔

"تمہارے ساتھ میں نے خوب انجوائے کرنا تھا۔ ابھی تو تم اس سحرزدہ کیفیت سے نکلی ہو مشکل سے' اب ہی تو مزا آنا تھا۔" شاہ بانو مایوسی سے بولی۔

"میں شاید ایک سحر سے نکل کر دوسرے سحر میں گرفتار ہو گئی ہوں شاہ بانو۔" ماہ نور نے یہ بات صرف سوچی تھی کہی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"کل رات فارم تے بہت بڑی دعوت تھی۔" کھاری آپا رابعہ کو جلانے کے لیے لکڑیاں پہنچانے آیا تھا اور اس کی زبان قصے سنانے لگی تھی۔

"کوئی نئی بات بتاؤ' فارم پر دعوتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔" آپا رابعہ نے لکڑیاں ڈیوڑھی سے چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کے نیچے سنبھالتے ہوئے کہا۔ کئی دن تک ان کے ایندھن کا بندوبست ہو گیا تھا۔

"منوں کے حساب سے بالن آیا تھا۔ ڈیڑھ سو کے قریب دیگیں پکی تھیں' پھر بھی بالن بچ گیا۔" کھاری ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑ چٹخاتے ہوئے بولا۔

"چوہدری صاحب نے کہا مولوی صاحب کو دے آؤ۔"

"تم نے کتنی دیگیں کھائیں؟" سعدیہ نے جو کمرے میں بیٹھی کھاری کی لن ترانیاں سن رہی تھی اندر بیٹھے بیٹھے سوال کیا۔

کھاری آپا رابعہ کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

"تسیں دسو بھین جی ——— کیا کبھی کوئی ایک بندہ اکیلا پوری دیگ کھا سکتا ہے۔"

"تم قصے تو یوں ہی سناتے ہو۔" سعدیہ نے کہا۔

"میں قصے نہیں سناتا ہوں۔" کھاری نے ترکی بہ ترکی جواب دیا' خبریں سناتا ہوں۔"

"اچھا چل' میں تجھے گلاب کا شربت پلاؤں۔" آپا رابعہ نے لکڑیاں ٹھکانے لگانے کے بعد کھاری سے کہا۔

"مولوی صاحب سے کہیں مجھے بھی قرآن پاک پڑھا دیں۔" ڈیوڑھی میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر شربت پیتے ہوئے کھاری نے کہا۔

"ارے تم نے ابھی تک قرآن پاک نہیں پڑھا۔" آپا رابعہ کو دھچکا لگا۔

"نئیں..." کھاری نے شرمسار ہوتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"جب سے پیدا ہوا یہی حالات ہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے ادھر فارم پر کام کرتے کرتے وقت گزر رہا ہے۔"

"چوہدری صاحب نے تمہیں پالنے کی ذمہ داری لے لی' دین' دنیا کی عقل سکھانے کا بندوبست نہیں کیا۔" دکھ سے آپا رابعہ کی آواز کانپنے لگی۔

"لو جی اماں اب اس کے غم میں گھلیں گی۔" اندر بیٹھی سعدیہ نے منہ بنا کر سوچا۔

"اب اگر میں مسجد میں آ کر سبق لینے کی بات کروں تو لڑکے مذاق اڑاتے ہیں۔" کھاری کے لہجے میں بھی دکھ تھا۔

"کھاری بیٹا! یہ بتاؤ... تمہیں دل سے قرآن پڑھنے کا شوق ہے؟" آپا رابعہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بڑا شوق اے بھین جی!" اس نے سر اٹھا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں جانتا کس نماز میں کتنی سنتیں اور کتنے فرض پڑھتے ہیں۔ نفلوں میں کیا پڑھا جاتا ہے۔ مجھے نہ آیت الکرسی آتی ہے' نہ کلمے اور درود پاک پورا آتا ہے۔ لیکن پھر بھی میں پانچ وقت وضو کرتا ہوں اور نماز کی نیت بھی کرتا ہوں۔ جب سمجھ نہ آئے کہ کیا پڑھنا ہے تو بسم اللہ کا ورد کرتا رہتا ہوں۔"

"شرع میں کیسی شرم میرے بچے۔" آپا رابعہ کھاری کی بات سن کر آبدیدہ ہو گئیں۔ اندر کمرے میں بیٹھی سعدیہ کے دل پر بھی کھاری کی یہ بات اثر کر گئی۔ "نماز، کلمہ سیکھنے کے لیے تم نے پہلے کسی سے کیوں نہیں کہا۔ اتنے سال ہو گئے مولوی سرفراز کو یہاں آئے اور ان سے پہلے بھی مسجد میں مولوی صاحب موجود تھے۔ تم نے کیوں نہیں ان سے کہا کہ مجھے یہ سب سیکھنا ہے۔"

"مولوی صاحب سے پہلے والے مولوی صاب نے ہی تو مجھے ڈرایا مجھے پاگل اور ہلکے دماغ والا کہتے تھے۔ غلطی نہیں ہوتی تھی، وہ ڈنڈا پکڑ لیتے تھے، میں نے سوچا اللہ بھی شاید صرف بڑے لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔" کھاری نے سر جھکا کر بتایا۔

"اوہو۔۔۔" آپا رابعہ نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اللہ تو غریب کی کٹیا کا سب سے بڑا اور اکثر اکلوتا آسرا ہے بیٹا۔"

"پھر میں اللہ کا پیچھا کرنا چھوڑ گیا۔ مگر اب مجھے وضو کرتے، نماز کے لیے قطاریں بناتے، اذان کی آواز سن کر سب کام چھوڑ کر مسجد کی طرف آنے والے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ جب کوئی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں شروع سے نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا ہوتا تو شاید آج تک مجھے میرے ماں، باپ نہ سہی اللہ ہی مل جاتا۔"

آپا رابعہ نے اس سیدھے سادے نوعمر لڑکے کو دیکھا۔ جس کا جسم محنت کا عادی اور ہاتھ محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جس نے اپنے گھر اور اپنے ماں، باپ کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جو کسی نگران اور رہنما کے بغیر زندگی گزارتا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس کے معصوم دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہوک ڈال دی تھی۔ یہ جذبہ کسی کے سکھانے پڑھانے پر نہیں، خود سے اس کے دل پر اترا تھا۔

"تو کسی کی پروانہ کر بچے۔" انہوں نے ایک بار پھر کھاری کے سر کو سہلایا۔

"میں خود تجھے سب سکھاؤں گی، تو مسجد میں جا کر نماز پڑھے گا بس چند دن کی بات ہے۔ نماز سیکھنے میں زیادہ دن نہیں لگتے۔ ہاں ناظرے میں دن لگیں گے۔ لیکن جو لڑکا اتنے سارے کام جانتا ہو، ٹریکٹر ٹھیک کر لیتا ہو، ٹیوب ویل کے مسئلے حل کر لیتا ہو، شہر تک ٹرک لے جانے کے قابل ہو، صرف کم عمری کی وجہ سے نہ لے کر جا سکتا ہو، اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں، بالکل بھی نہیں۔ نہ تم شیدائی ہو، نہ کم عقل ہو۔ اللہ نے بندے کو سب کچھ عطا کیا ہوتا ہے، جب ہی تو باقی کام ٹھیک کر لیتا ہے، پھر اللہ کے کاموں میں کیا مشکل ہے۔"

کھاری نے مسکرا کر تشکر بھری نظروں سے آپا رابعہ کی طرف دیکھا اور اندر بیٹھی سعدیہ کے دل پر بھی یہ ساری گفتگو اثر کر گئی تھی۔

"مجھے سب کچھ میسر ہے اور میرے دل میں یہ لگن نہیں، اوپر سے میں شاکی بھی ہوں۔" وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں اس شہر میں اجنبی ہوں، مجھے راستوں سے واقفیت نہیں، اس لیے فلزا ظہور قریب رہتی ہوں یا دور میرے لیے ایک ہی بات ہے۔" سعد نے ماہ نور کا میسج پڑھا اور مسکرا دیا۔

"تم کہو اور مجھ پر بھروسا کرو تو میں لے جاتا ہوں تمہیں فلزا ظہور کے پاس۔" اس نے جواب لکھ کر بھیجا۔ اس کا جواب آنے میں تاخیر ہوئی تو اس نے ماہ نور کے نمبر کو کال کے لیے پش کیا۔

"تم نے میرے میسج کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا تمہیں کال کر لوں۔" ماہ نور کی آواز سنائی دینے پر اس نے کہا۔

"اچھا۔" دوسری جانب سے مختصر جواب آیا۔

"میری آفر بری تو نہیں لگی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس بار آواز قدرے اونچی تھی۔

"ماہ نور۔۔۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم اتنے بڑے کالج میں میڈیا سائنسز کی اسٹوڈنٹس ہونے، ایک اچھی پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی انڈر کانفیڈنٹ (اعتماد کی کمی کا شکار) کیوں ہو؟" سعد کے سوال نے ماہ نور کو کنفیوز کر دیا تھا۔ وہ اعتماد کی کمی کا شکار ہرگز نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ سعد کے سامنے وہ اس کمی کا شکار ہو جایا کرتی تھی۔

"اچھا اپنا ایڈریس بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ تم کب فارغ ہو، میں تمہیں فلزا ظہور کے گھر لے جانے کے لیے آؤں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

ماہ نور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے، وہ نہ انکار کرنا چاہتی تھی، نہ فوری ہامی بھرنا چاہتی تھی۔

"دیکھو ماہ نور! میں کوئی برا بندہ نہیں ہوں۔ میری نیت بھی بڑی صاف ہے۔ میں لڑکیوں کو ورغلانے اور شکار کرنے کی ہسٹری بھی نہیں رکھتا۔ تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔" سعد نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ دوسری طرف گومگو والی کیفیت تھی۔

"میں تمہیں فون کر کے بتاؤں گی کہ تم کب مجھے لینے آؤ۔" قدرے پر اعتماد لہجے میں جواب آیا۔

"گڈ!" وہ مسکرایا۔ "میں انتظار کروں گا۔" اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا۔

☼ ☼ ☼

اس فائیو اسٹار ہوٹل کی پول سائیڈ پر ڈیک چیئر پر بیٹھے انہیں دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ انہوں نے کافی دیر سوئمنگ کی تھی اور سوئمنگ کے دوران وہ سوچتے رہے تھے کہ ان کا جسم اور ذہن ابھی بھی مضبوط اور قائم تھا۔ انہوں نے اپنے بازوؤں کو پوری طاقت سے پانی میں چلایا تھا اور سوئمنگ کے مختلف طریقوں پر زور آزمائی کی تھی۔ نہ ان کا جسم تھکا تھا، نہ ذہن، بلکہ وہ خود کو پہلے سے کہیں زیادہ تازہ دم محسوس کر رہے تھے۔ وہ سوئمنگ پول سے نکل کر ڈیک چیئر پر بیٹھے تھے۔ باوردی اور مستعد ویٹر نے ان کے آرڈر پر فریش جوس کا گلاس ان کے سامنے ٹیبل پر رکھا اس روز اس پول میں سوئمنگ کرنے والوں میں ان کا قریبی شناسا کوئی نہیں تھا۔ چند ایسے لوگ موجود تھے جن سے ان کا تعلق ہیلو ہائے تک محدود تھا باقی اجنبی تھے۔ جب ہی انہیں دو گھنٹے وہاں بغیر کسی کی مداخلت کے بیٹھنے اور لیٹنے کا موقع مل گیا تھا۔

ان کے ذہن میں کئی قسم کے خیالات آ جا رہے تھے۔ ان کے بزنس کنسرنز، میٹنگز، وزٹس، ان کا موجودہ اکانومی اسٹیٹس، وہ اپنے ذہن میں اپنی حکمت عملیاں طے کر رہے تھے۔ انہیں ایسی پلاننگز کرنے میں بہت مزا آتا تھا۔ پلاننگ کرنے میں مشاق ان کا ذہن بہت کم وقت میں دو جمع دو کر کے آنے والے دنوں کا پورا پروگرام مرتب کر کے ان کے ذہن کے خانے میں اسٹور کر دیتا تھا اور ان کے ذہن کی یہ پروگرامڈ فائلز کبھی نہ تو غلط ثابت ہوتی تھیں، نہ ہی کرپٹ ہوتی تھیں۔ نہ ان میں کوئی وائرس گھستا تھا، نہ ہی کوئی وائرس ان پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ ان کے پروگرامڈ ذہن میں آٹو کلین کا سسٹم بھی فٹ تھا۔ جو خود بخود ناکارہ اور استعمال شدہ فائلز ضائع کر کے اسٹوریج کی استعداد بڑھاتا رہتا تھا۔ آنے والے کئی دنوں کا لائحہ عمل طے کرتا ان کا ذہن نہ جانے کیسے سعد کے بارے میں سوچنے پر لگ گیا۔

گزشتہ کئی دنوں سے اس سے ان کا رابطہ منقطع تھا اور یہ ان کے اور سعد کے درمیان طے ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی انہیں لگتا کہ ان کا اور سعد کا تعلق بھی بزنس کی کسی شق میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ دونوں میں سے جس کو جب موقع ملتا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے یا پھر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں صرف کر دیتا۔

انہیں سعد کی کاروباری سوجھ بوجھ اور ذہانت پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ ان کا سب سے بڑا بزنس ایڈ تھا۔ ایک ایسا ایڈ جس پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے وہ اسے کوئی بھی پروجیکٹ آنکھ بند کر کے سونپ سکتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سعد کی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جس تک نہ ان کی کوئی رسائی تھی، نہ ہی کنٹرول۔ وہ ان کے لیے بہت بڑے بڑے فائدے حاصل کرنے کے بعد اچانک کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ غائب ہونے سے پہلے وہ ان سے غائب ہونے کی اجازت ضرور طلب کرتا تھا اور ایسا وہ صرف اس وقت کرتا تھا جب ان کے پاس یہ اجازت دے دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس غائب ہونے کے عرصے کے دوران وہ اس کی سرگرمیوں سے بے خبر رہتے تھے۔ باخبر رہنے کے لیے ان کے پاس کئی ذرائع تھے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کی سرگرمیوں پر دل میں ابال اٹھنے کے باوجود وہ اسے ان سے منع نہیں کر سکتے تھے۔

وہ ان کا سب سے بڑا بزنس ایڈ تھا اور اس ایڈ کو ہاتھ سے جانے دینے کی غلطی ان کی سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر شاید وہ اپنے دل میں انڈر ٹون کی طرح بجتی ایک آواز پر کان دھرے اس کی دھڑلے کو محسوس کرتے اور اس سے مسحور بھی ہوتے تھے کہ دنیا بھر میں سعد ان کا سب سے پیارا رشتہ تھا۔ جسے دیکھ کر ان کا دل جیتا تھا اور جس کی کمپنی میں ان کا دل کھلا رہتا تھا۔ دل کے اس احساس کا اظہار یا اعتراف انہوں نے کسی اور کے سامنے تو کیا، کبھی خود اپنے سامنے بھی نہیں کیا تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ سعد کا تصور اکثر ان کی شدید ترین تھکاوٹ کے احساس کو بھی زائل کر دیتا تھا۔

اس شام بھی بلال سلطان نے خاصی دیر اس خوش گوار تصوّر کی روشنی میں گزار دی تھی اور ان کا دل بہت ہلکا ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آپا رابعہ نے کھاری کو کلمہ، نماز اور چند دعائیں سکھانا شروع کی تھیں۔ قاعدے کی الف، ب سے نابلد حرف، حرف پر اٹکتا تھا۔ پھر اپنے آپ شرمندہ ہو کر آگے پڑھنا بند کر دیتا۔ آپا رابعہ کے دلاسے اور تسلیاں اسے ہمت باندھے رکھنے کی طرف لے آتیں۔

"ایک تو یہ بولتا بہت ہے۔" اس روز بھی کھاری کو ایک ہی لفظ کے ہجے کر کے پڑھنے میں بار بار اٹکتے دیکھ کر چارپائی پر کتابیں پھیلا کر بیٹھے پڑھتے ہوئے سعدیہ نے کہا۔

"ایک لفظ یاد نہیں ہوتا۔ اسے دس خبریں سنانی یاد آجاتی ہیں۔" اس نے کھاری کو گھورا۔

"تم اپنا پڑھو، کھاری کو اپنا پڑھنے دو۔" آپا رابعہ نے سعدیہ کو ڈانٹا۔

"میں سعدیہ صاحبہ، بڑا صحیح پڑھ لیندا ہوں، بس ایک واری زبان تے چڑھ جائے بات۔" کھاری نے پڑھی لکھی سعدیہ سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرنی شروع کر دی تھی۔

"یوں تھوڑی پڑھا جاتا ہے۔ ایک لفظ پڑھا۔ ساتھ ہی ماسی جنت کے قصے شروع، دوسرا لفظ پڑھا فارم کے مہمان یاد آگئے۔ تیسرا لفظ پڑھا کوئی میلہ، کوئی شہر والی بی بی یاد آگئی۔" سعدیہ نے منہ بنا کر سر جھٹکا۔

"بابے منگو واحد میلہ آئے گا پورا سال ہو جائے گا۔ مہ نور بی بی نوں ایتھے آئے۔" کھاری نے اس کی بات کا برا ماننے کے بجائے کچھ یاد آنے پر کہا۔

"دیکھ لیا۔" سعدیہ نے اماں کی طرف جتانے والے انداز میں دیکھا۔ "اس نے خاک پڑھنا ہے۔"

"تمہارے ہی جیسے لوگ ہوں گے وہ جو اس سے پہلے اس بے چارے کی حوصلہ شکنی کرتے ہوں گے۔" اماں نے سکون بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "بچے کو پڑھانا اور بچے کا پڑھنا آسان کام ہے۔ یہ بچپن سے بہت آگے آچکا ہے۔ کچھ پڑھنا سیکھنے سے پہلے اس نے محنت مزدوری کرنی سیکھ لی ہے۔ اب اسے پڑھنا سیکھنے میں وقت تو لگے گا۔"

"تم ہو کب سے اس فارم پر کھاری؟" سعدیہ نے اماں کی بات کا کوئی خاص اثر نہ لیتے ہوئے کھاری سے پوچھا۔

"پتا نئیں جی جب سے ہوش سنبھالا ہے خود کو ادھر ہی دیکھا ہے۔" کھاری نے جواب دیا اور آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"پہلے یہ فارم نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑا سا ڈیرہ ہوتا تھا۔" اس نے انہیں بتایا۔

"پچاس بھینسیں، چند گھوڑے، ربیع خریف کی فصلیں... بس یہی کچھ ہوتا تھا۔"

"اچھا پھر کب بنا یہ فارم ہاؤس؟" آپا رابعہ نے پوچھا۔

"جب میں اتنا سا تھا۔" کھاری نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"جب تم فارم ہاؤس میں آئے تو کیسا لگا۔" آپا رابعہ محض کھاری کا دل لگانے کو پوچھ رہی تھیں۔

"بڑا اچھا لگیا۔ کشادہ فارم ہاؤس، ڈیری فارم، پھل پھول، سبزیاں، گھوڑے اور نہ جانے کیا کچھ۔" کھاری نے بتایا۔

"پر اک گل بری ہوئی۔" پھر اس نے منہ بنا کر سر ہلایا۔

"وہ کیا؟" اماں کے بجائے سعدیہ نے تجسس سے پوچھا۔ "پمپ ایکشن تے بڑی بڑی بندوقوں والے لوگ بھی آگئے۔ آتے جاتے پوچھ پڑتال ہونے لگی۔"

"پابندیاں لگ گئیں یعنی؟" سعدیہ نے تیزی سے کہا۔

"ایک بات بتاؤ کھاری، فارم ہاؤس اندر سے کیسا ہے۔" اسے خیال آیا کہ فارم ہاؤس کے اندر کا احوال کھاری سے بہتر کون بتا سکتا تھا۔

"یہ تو اندر سے جب دیکھو گی تب ہی پتا چلے گا۔" کھاری نے سر ہلا کر جواب دیا۔ اسے پہلی بار سعدیہ کو للچانے کا موقع ملا تھا۔

"وہ کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟" اماں کسی کام سے اٹھ کر اندر گئیں تو سعدیہ نے حسرت سے کہا۔ کھاری نے ایک نظر سعدیہ پر ڈالی اور ایک لمحہ اس کی حسرت پر غور کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود اپنے ذہن میں کچھ سوچ کر سر ہلا رہا تھا۔

"چلو بیٹا! بہت باتیں ہو گئیں، اب سبق شروع کرو۔" اسی دم اماں ادھر آگئیں۔

"چلو سناؤ ذرا پھر سے سورہ فاتحہ۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

"الحمدللہ۔" کھاری اٹک اٹک کر پڑھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"انسان کو اپنی زندگی کے معاملات کے بارے میں بہت شیور ہونا چاہیے۔" وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "گومگو کی کیفیت، ہمیشہ مسائل کھڑے کرتی ہے۔" اس نے کہا۔ "یا تو کوئی چیز غلط ہے یا درست، درمیانی کیفیت کوئی نہیں ہوتی، اس میں پڑ کر انسان ہمیشہ کنفیوز رہتا ہے۔"

"کیا تم ابھی بھی کنفیوز ہو۔" سعد نے لمحہ بھر کے لیے گردن موڑ کر اپنے بائیں جانب بیٹھی ماہ نور کو دیکھا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے پریقین لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن میں اس سے پہلے کبھی یوں کسی بالکل ناواقف انسان کے ساتھ باہر نہیں گئی۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ میں نے ٹھیک کیا یا غلط۔"

"تم جو پڑھتی ہو اس کے لیے ایک اسٹوڈنٹ کو بہت خواری اٹھانا پڑتی ہے۔ تمہارے جیسی اسٹوڈنٹ کو تو بہت پراعتماد اور پُریقین ہونا چاہیے کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے یا غلط۔" اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"دراصل تم ڈبل مائنڈ اس لیے ہو رہی ہو کہ تمہارا دل کہتا ہے میں قابل بھروسہ انسان ہوں، جبکہ تمہارا دماغ کہتا ہے ہر کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شاید۔" ماہ نور نے اسے جھٹلایا نہیں۔

"تمہیں اپنے ذہن کو اس کنفیوژن سے نکال کر آنا چاہیے تھا۔" اس کے لہجے میں تردد اتر آیا۔

"میں اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں بہت شیور ہوتا ہوں۔ میں جن چند معاملات میں کنفیوز ہوتا ہوں ان کی طرف قدم ہی نہیں بڑھاتا اور اپنے دوستوں سے بھی اسی رویے کی توقع کرتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "ہم اپنے نظریات اور مزاج کی روشنی میں دوست بنانے لگیں تو پھر شاید ہمارا کبھی کوئی دوست نہ بن سکے۔" ماہ نور نے اس ملاقات کی پہلی مکمل بات کی۔

"درست!" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔ "ہمارے مزاج، ہمارے ماحول اور تربیت کے ہاتھوں پروان چڑھتے اور بنتے ہیں اور دنیا کے ہر بندے کا ماحول اور تربیت دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔" ماہ نور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا تعلق ایک پڑھی لکھی لبرل فیملی سے ضرور ہے، مگر میری تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ دوست کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرو، کیونکہ رشتہ داری کے معاملے میں انسان مجبور ہوتا ہے۔ دوستی کے معاملے میں ہرگز نہیں۔"

"بالکل۔۔۔" اس نے سرہلایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو کہ میرے دل کو تمہارے ساتھ آنے میں تامل نہیں تھا۔ مگر میرا دماغ گھٹی میں بیٹھی نصیحت کے تابع ہے۔ وہ بار بار مجھے تنبیہہ کر رہا تھا کہ دوستی ایک دن کی ملاقات کا نتیجہ نہیں ہونا چاہیے۔ جانچ اور پرکھ کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی اور وہ پورے دھیان کے ساتھ سن رہا تھا۔

"میرے کنفیوژن کی وجہ بھی یہی تھی۔۔۔ لیکن میرے مزاج کا ایک فیکٹر میرا امپلسو (Impulsive) ہونا بھی ہے۔ اگر آج میں یہاں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوں تو اس میں سارا عمل دخل impulse کا ہے۔ میں بغیر نتائج کی پروا کیے دل کے کہے پر لبیک کہہ دیتی ہوں اکثر۔" اس نے اعتراف کیا۔

"کبھی ایسا کرنے کا نتیجہ غلط نکلا۔" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ ابھی تک تو کبھی نہیں۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"آئندہ بھی نہیں ہوگا۔" وہ پراعتماد انداز میں بولا۔ "تم نے بندر کے تماشے والے سے دوبارہ ملاقات کی خواہش بھی اسی طرح کی تھی۔"

"ہاں!" ماہ نور پہلی بار مسکرائی۔

"تم مسکراتی رہا کرو۔۔۔ یوں زیادہ اچھی لگتی ہو۔" اس نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔

"ورنہ میں کیسی لگتی ہوں۔" ماہ نور بغیر سوچے سمجھے بولی۔

"بھئی مجھ سے تمہاری ملاقات تو ہوتی ہی اس انداز میں رہی کہ تم ایک کنفیوز، حواس باختہ، پریشان حال لڑکی

کے روپ میں میرے سامنے آتی رہیں۔ اسی لیے تو آج مجھے تمہاری مسکراہٹ نے تبدیلی کا احساس دیا۔ جو مجھے اچھا لگا اور میں نے کہہ بھی دیا۔ میں جو محسوس کرتا ہوں اکثر کہہ بھی دیتا ہوں۔ میری یہ عادت نوٹ کرلو، کبھی جو تمہیں بری لگے۔" اس نے تفصیلی جواب دیا۔

"میں اس سے پہلے تمہارے جیسے بندے سے کبھی نہیں ملی۔" ماہ نور نے یہ بات بھی بے ساختہ کہی۔

"اور میں بھی اس سے پہلے تمہارے جیسی لڑکی سے کبھی نہیں ملا۔" وہ بھی بے ساختہ بولا۔ "تم بہت سمپل ہو اور انوسینٹ بھی، تمہارے جیسی بے نیازی بھی میں نے کسی دوسری لڑکی میں نہیں دیکھی۔"

"کیا مطلب۔" ماہ نور نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ایک لڑکی جس کا ایک خام سا اسکیچ پچاس ہزار روپے میں بک رہا ہو، وہ یہ کہے کہ مجھے بیچنا نہیں، مفت لے لو تو یہ بے نیازی نہیں تو اور کیا ہے۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔" ماہ نور نے سیٹ کی پشت چھوڑ کر آگے ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔ "تم نے وہ احمقانہ اسکیچ اتنا مہنگا کیوں خریدا۔ کیا تمہارے پاس بہت پیسہ ہے۔"

"میرے پاس پیسہ نہ بھی ہوتا تو وہ میں اتنے میں ہی خریدتا، چاہے مجھے کسی سے قرض لینا پڑتا۔" اس کے جواب نے ماہ نور کو ششدر کردیا۔

"کبھی چیزیں اتنی valueable (قیمتی) ہوتی ہیں کہ آپ ان کی قیمت کا اندازہ نہیں لگاپاتے۔ بلکہ ان کی قیمت ادا ہی نہیں کرسکتے۔ تمہارا وہ اسکیچ بھی ایسا ہی تھا۔" وہ کہہ رہا تھا اور ماہ نور کو حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"لیکن کیوں۔" اس نے پوچھا۔ "وہ تو محض ایک۔۔۔" وہ اس کو بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ اسکیچ محض خام لکیریں تھیں جو اس نے یوں ہی مشق کے دوران کھینچی تھیں۔ لیکن اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس لیے کہ وہ اسکیچ اس لڑکی نے بنایا تھا جو نادانستگی میں سہی بار بار مجھ سے ایسے حالات میں ٹکراتی رہی جن میں میرا سگا باپ بھی شاید مجھے نہ پہچان پاتا۔ اس لڑکی نے نہ صرف مجھے پہچانا، بلکہ میری کھوج میں لگ گئی۔ اس کا تجسس میرے بارے میں بڑھتا ہی گیا۔ کیا میں اتنا احمق تھا کہ یہ اشارہ نہ سمجھ سکوں کہ وہ کوئی عام نہیں، بہت خاص لڑکی ہے۔" ماہ نور باقاعدہ منہ کھولے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔

"اب اس بہت خاص لڑکی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے کچھ بہت ہی خاص تو کرنا ہی تھا۔" وہ اس کے اس انداز کو دیکھ کر مسکرایا۔

"جب ہی میں نے وہ اسکیچ اتنے پیسوں میں خریدا۔"

"پھر تو تینوں لے لینے چاہیے تھے۔" ماہ نور نے اس کی بات کو بمشکل ہضم کرنے کے بعد دوبارہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

"ہاہا!" وہ زور سے ہنسا۔ "دل تو میرا یہی چاہ رہا تھا، مگر اس کا کیا جائے کہ ایسا کرنے پر ہلچل مچ جانے کا خدشہ تھا۔ خصوصاً" تمہاری دوست تو شاید بے ہوش ہی ہوجاتی۔"

"ہاں یہ بھی تھا۔" ماہ نور نے کہا۔

"پھر کیا کیا تم نے ان پچاس ہزار کا، دوست کو تو نہیں دے دیے آدھے۔" وہ مسکرایا۔

"نہیں، وہ کسی ویلفیئر آرگنائزیشن کو دے دیے، میں ان کی حق دار ہی نہیں تھی۔" ماہ نور نے کہا۔

"تم کو اندازہ نہیں، تم کیا ڈیزرو کرتی ہو۔" وہ زیر لب بولا۔ ماہ نور نے اس بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھا، مگر خاموش رہی۔

"ویسے ہم ان خاتون فلزا ظہور کے ہاں کس سلسلے میں جارہے ہیں؟" وہ اس کی خاموشی توڑنے کے لیے بولا۔

"خدیجہ اور فاطمہ' بلکہ فاطمہ خالہ کے کہنے پر۔" ماہ نور نے جواب دیا۔
"اور ان دونوں خالاؤں کا کیا تعارف ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔
"میری خالائیں ہیں بس۔" ماہ نور نے لاپروائی سے کہا اور باہر دیکھنے لگی۔ "کب آئے گا آخر فلز ا ظہور کا گھر' اتنا بھی ضروری نہیں تھا ان سے ملنا' میں بھی پاگل ہوں۔" وہ جیسے خود کلامی میں مصروف تھی۔ اس کی بات پر سعد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"اتنا بھی ضروری نہیں تھا' پھر بھی تم نے اس کا پتا لگانے پر مجھے لگا دیا اور اب ان تک پہنچنے کے لیے میرا ہی انتخاب کیا۔" اس نے دل میں سوچا اور ہاتھ بڑھا کر میوزک سسٹم آن کر دیا۔

عشق تے آتش دونوں برابر

اس بار یہ کانی علی ظفر گا رہا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ ماہ نور اپنی طرف والے شیشے سے پار دیکھ رہی تھی۔

✵ ✵ ✵

آسمان پر پھیلے سفید بادلوں پر تیزی سے سیاہی چھا رہی تھی۔ اس نے پرمسرت انداز میں بادلوں کے ان ٹکڑوں کو آسمان پر تیرتے دیکھا تھا۔ بادل کے ان ٹکڑوں کی بھی کئی شکلیں تھیں۔ کوئی ٹکڑا فادر کرسمس کی طرح لمبی داڑھی لگائے ادھر سے ادھر پھر رہا تھا' کوئی کسی جھک سفید بالوں والی بڑھیا کی طرح سر جھکائے چرخہ کاتتا نظر آ رہا تھا۔ کچھ ٹکڑے ننھے شرارتی بچوں کی طرح ادھر سے ادھر مسکراتے ہوئے اٹھکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ اس نے کتنی ہی دیر بادل کے ان ٹکڑوں کی مختلف شکلوں کو دیکھتے گزاری تھی۔ اسے پتا تھا کہ بادل کے ٹکڑوں کو یہ شکلیں صرف اس کا ذہن عطا کر رہا تھا۔ کسی دوسرے انسان کو شاید وہ کسی اور شکل میں نظر آئیں۔ مگر اسے ان سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں کی حرکات اتنا لطف دے رہی تھیں کہ اس کا ذہن بس انہی میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مشرق سے کالے رنگ کی ایک گھٹا سی اٹھی اور سفید بادلوں کے ٹکڑوں پر چھا گئی۔ نیلے آسمان پر بھی سیاہی جھلکنے لگی۔ بادل گھبرا کر اپنی رو میں چلنے کے بجائے شاید اس تاریکی کی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ جب ہی اس بلندی سے گھڑگھڑاہٹ کی آواز آنے لگی تھی۔ اس گھڑگھڑاہٹ سے ذرا دیر پہلے سیاہ پڑتے آسمان پر بجلی نے ایک کوندا سا مارا تھا۔
"روشنی کی رفتار' آواز کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے۔"
اسے مسز پیٹر کے خزانے سے پڑھی کتاب کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ وہ کتاب سائنسی حقائق سے متعلق تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اس سائنسی حقیقت کا مشاہدہ کیا تھا۔ روشنی کا ایک اور کوندا آسمان پر لپکا اور تڑاخ کی آواز کے ساتھ بادل ایک بار پھر گرجا' ساتھ ہی اس نیم تاریک آسمان سے پانی کے قطرے زمین پر برسنے لگے۔ اس نے بچے کی سی مسرت کے ساتھ کھلی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پانی کی ان بوندوں کو پکڑنے کی کوشش کی' مگر وہ اس کی رسائی سے باہر تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر ہاتھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے کرسی کو مزید آگے کھینچا۔ اب وہ کھڑکی کی دہلیز کے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس کا بازو باہر کی طرف بڑھا اور ہاتھ پھیل کر بارش کے قطرے' جو اب نیم پھوار میں تبدیل ہو چکے تھے۔ قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا ہاتھ ہلکا سا نم ہوا' لیکن وہ کوئی قطرہ پکڑ نہیں سکی۔" اس نے مایوسی سے کھڑکی کے اوپر تنے سیمنٹ کے کٹورین اسٹائل شیڈ کو دیکھا جو کھڑکی کو موسمی اثرات سے بچا رہا تھا۔ بازو بدستور باہر رکھے اور ہاتھ پھیلائے اس نے اونچے اونچے درختوں کے سیاہ پڑتے تنوں پر غور کیا اور پھر نظر کے سامنے تنی ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک پھیلی بجلی کی تاروں کو دیکھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا پرندہ ان تاروں پر بیٹھا پانی کی پھوار میں بھیگ رہا تھا۔

"اگر ان بھیگی تاروں میں کرنٹ دوڑ جائے تو اس پرندے کا کیا بنے گا۔" اس نے سوچا۔
"پرندوں کو کرنٹ نہیں لگتا پریا۔" کسی نے اس کے کان میں کہا۔ اس نے سر اٹھا کر دائیں جانب دیکھا۔ سرخ بالوں کی وگ لگائے' زرد ٹینس بال ناک پر اٹکائے' ہونٹوں پر شرفا "غربا" سفید پینٹ پھیلائے' گالوں پر لالی کی ٹکیاں سجائے' سر پر زرد دائروں والی ہری ٹوپی پہنے ایک چہرہ مسکرا رہا تھا۔
"جیسے ایک منحوس سات گھنٹے مسلسل بھی یونی سائیکل چلائے وہ تھک کر نہیں گرتا۔" اس نے اس کا منہ چڑایا۔
"ہر منحو نہیں' صرف رکو (Rikko) کہو' صرف رکو دس گھنٹے مسلسل سائیکل چلائے تو بھی تھک کر نہیں گرتا۔" اس چہرے نے سفید دستانوں میں چھپے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"رکو۔" اس نے پھوار سے نم ہوتا ہاتھ کھینچ کر دائیں جانب بڑھایا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے دیکھو میں کیسے اپاہج ہو گئی' تم نے پلٹ کر مجھے پوچھا بھی نہیں' تم کو پریا رانی اتنی جلدی بھول گئی۔ اب کہیں مت جانا۔" اس نے بڑھا ہوا ہاتھ مزید آگے کیا۔ مگر اس کے ہاتھ رکو کی آستین آئی نہ ہاتھ۔ اس کا ہاتھ خلا ہی میں ادھر ادھر ہلتا رہ گیا۔
"آہ۔۔۔ مجھے کیوں اس کا وہم ستاتا ہے۔ مجھے کیوں وہ اس طرح نظر آتا ہے۔ جبکہ وہ ہوتا ہی نہیں۔" اس نے بے بسی سے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر سوچا۔
"وہ جو نئے نئے منظروں میں پھرتا ہو گا' نت نئی منزلوں کو پاتا ہو گا' نت نئے لوگوں کو اپنے فن اور کرتبوں سے ہنسانے میں مصروف رہتا ہو گا۔ اسے پریا رانی تو کبھی بھول کر بھی نہ یاد آتی ہو گی۔" اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مگر اس نے سر جھٹک کر خود کو اس دکھ بھرے احساس سے نکال لیا اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔
ٹکڑیوں میں بٹے بادل آپس میں مدغم ہو چکے تھے اور مل کر چھما چھم برسنے لگے تھے۔ مشرق سے چلتی ہوا پانی کی پھوار کو کھڑکی سے اندر لاتی اور یہ پھوار اس کو بھگو جاتی۔ اس کے بال بھیگ گئے تھے۔ کپڑے نم ہو رہے تھے۔ اسے ایک عجیب سے لطف کا احساس ہو رہا تھا۔ سامنے کے منظر میں موجود فلک بوس پہاڑ نیم تاریک آسمان کے سائے میں نظر کی حد سے غائب ہو چکے تھے۔ بجلی کے کھمبوں سے منسلک تاروں کے جال کی جھلک بھی مدہم پڑنے لگی تھی۔ تاحد نظر صرف آسمان سے برستا پانی یا کبھی کبھار کڑا کے مارتی روشنی تھی۔ سماعتوں میں بھی صرف برستی بارش کی آواز تھی یا پھر گرجتے بادلوں کی گڑگڑاہٹ' سارہ نے سالوں بعد برستی بارش کا فرصت سے نظارہ کیا تھا اور اس سے بے حد لطف اندوز ہوئی تھی۔ اس سے پہلے سالوں تک وہ بارش کے آثار دیکھ کر سرکس فیملی کے ساتھ بیٹھ کر اجتماعی دعا میں شامل رہی تھی کہ۔
"خدا کرے بارش نہ برسے' کم از کم اتنے دن جب تک سرکس کا ڈیرا ہے۔"
بارش کا مطلب' کئی دنوں تک آمدنی بند ہو جانا تھا۔ بارش دیکھ کر سرکس کے انسان ہی نہیں حیوان بھی دم ہلاتے' بے چین پھرتے تھے۔ ہر کسی کے ذہن و دل پر الارم کی طرح ایک خیال یلغار کرتا تھا۔
"Going to loose some money every rainy night"
(برستی بارش میں ہر رات ہم پیسے کا نقصان اٹھانے والے ہیں۔)
پریشان حال چہرے' نظریں آسمان سے لگائے ادھر ادھر پھرتے تھے۔ سارہ کی زندگی بھی بارش کے غم میں مبتلا گزر گئی تھی۔ اسی لیے تو اسے بارش سے حظ اٹھانے کا نہ کبھی موقع ملا تھا' نہ ہی خیال آیا تھا۔ "کیا ہو جو اسی طرح کی برستی بارش میں سامنے کے پہاڑوں پر موجود گھروں میں سے کسی گھر میں بیٹھ کر چائے پی جائے۔" اس کو ایک انوکھا خیال آیا۔

"مگر پہاڑ تو بلند ہیں۔ ان تک رسائی کیسے ممکن ہے۔" دوسرا خیال آیا۔
"میرا ناتواں جسم اور میری اپاہج ٹانگیں وہاں تک کیسے پہنچ پائیں گی۔"

And if you ever forget
how much you mean to me
Everday i will
Remind you

(اور اگر تم کبھی بھولنے لگو کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو تو میں روزانہ تمہیں یاد دلاتا رہوں گا۔)
پھر اسے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے بارہا سنے تھے اور اس کے چہرے پر آپوں آپ مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

You can count on me
Like one. two three
I will be there

اس نے تصور میں ابھرے الفاظ پر سر دھنا اور پھر اپنی گود میں چھپا سیل فون نکال کر احتیاط سے حرف دبا دبا کر لکھنے لگی۔
"سنو مجھے بھی اس پہاڑ پر چڑھنا ہے' اس کی اونچائیوں کو ناپنا ہے۔ جو اس وقت میری نگاہ کے سامنے موسلا دھار بارش میں بھیگ رہا ہے۔"
لکھنے کے بعد اس نے جملے جانچے' کہیں کسی حرف یا لفظ کی غلطی تو نہیں ہوئی۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے send کا بٹن دبا دیا۔ وہ میسج اس کے سیل فون کی کانٹیکٹ لسٹ میں محفوظ دو نمبروں میں سے ایک پر چلا گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"ہاں ایک وقت تھا جب مجھے کوئلے کے ٹکڑوں سے پیار تھا۔"
ان کے سامنے بیٹھی خاتون کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے کیسری اور سفید رنگ کے امتزاج کا جمپر پہن رکھا تھا۔ ان کے شانے سے ذرا نیچے جاتے گھنگھریالے بالوں کے سیاہ رنگ میں کئی جگہ پر سفیدی کی لہریں جھلک رہی تھیں۔ ان کے چہرے کا رنگ جو شاید کبھی گندمی ہوتا ہو' اب ہلکا سیاہ پڑ رہا تھا۔ ان کے چہرے کے خطوط پر عجیب سی سرد مہری اور سختی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خاتون فلزا ظہور تھیں جن کی تلاش ماہ نور کو یہاں لے آئی تھی۔
"مگر میرے ذہن میں تو ان کا اور ہی سا تصور تھا۔" ماہ نور نے ان سے اپنا تعارف خدیجہ اور فاطمہ کے حوالے سے کرواتے ہوئے سوچا۔ "آرٹسٹوں کی سی آرٹسٹک خاتون' نرم لہجہ' خوش گوار چہرہ۔ یہ تو بے چاری لگتا ہے حس لطیف کہیں ان کو چھو کر بھی نہیں گزری۔"
خود کو خوش آمدید کہے جانے کے بعد اس چھوٹے سے گھر کے سٹنگ روم میں بٹھائے جاتے ہوئے اسے خیال آیا تھا۔
"مجھے حیرت ہے' فاطمہ کو میں ابھی بھی یاد ہوں۔" یہ بات انہوں نے سعد سے مخاطب ہو کر کہی تھی۔ سعد نے جواب کے لیے ماہ نور کی طرف دیکھا۔
"جی ہاں' آپ انہیں یاد ہیں' جب ہی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ سے ملنے کی کوشش کروں۔" ماہ نور نے جواب دیا۔
"مگر میرے ذہن کے بہت سے خانے یادوں سے خالی ہو چکے ہیں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "اگر تم یہاں آج نہ

آئیں تو شاید [illegible] بڑی سخت سے اڑایا کرتی تھی۔"
"لیکن جو یادیں یاد آیا دلا دی جاتی ہیں ان کی بہت قدر ہے میرے دل میں۔" دوسرے ہی لمحے انہوں نے کہا۔
"آپ ابھی بھی چارکول میں کام کرتی ہیں۔" ماہ نور نے اس چھوٹے سے سٹنگ روم کی دیواروں پر لگے چارکول میں بنے ماسٹر پیسز کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا صفائی ہے ہاتھ کی اور کیا مشاقی ہے۔" اس نے سوچا۔
"ہاں... لیکن بہت کم۔" انہوں نے کہا۔ "اب میرا رجحان زیادہ تر کیلی گرافی کی طرف ہے۔ میں نے کیلی گرافی میں بہت سے کورسز کیے ہیں اور اب میں ایک اکیڈمی میں کیلی گرافی سکھاتی بھی ہوں۔"
"وہیں سے آپ کا نام پتا مجھے ملا۔" سعد نے کہا۔
"اچھا!" انہوں نے سعد کی طرف دیکھا۔ "جبکہ میں نے کبھی اکیڈمی کے بروشرز اور نیوز لیٹرز میں اپنا نام نہیں آنے دیا۔ میں وہاں ایسے ہی کام کرتی ہوں جیسے میں وہاں نہیں ہوں۔"
یہ ایک مبہم سی بات تھی۔ ماہ نور نے سعد کی طرف دیکھا۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو عجیب سا سہی مگر ان کا مزاج تو شاید ایسا ہی ہے۔
"آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔" ماہ نور نے سوال کیا۔
"بس مجھے اچھا نہیں لگتا۔" مختصر جواب آیا۔
"آپ اپنی پہچان نہیں چاہتیں؟" سعد نے سوال کیا۔ "کسی بھی ویب سائٹ پر آپ کا نام مجھے بطور آرٹسٹ نہیں ملا... جبکہ آپ کا کام میں دیکھ رہا ہوں کہ انتہائی noteable ہے۔"
"نہیں مجھے نہ پہچان کی تمنا ہے' نہ شہرت کی خواہش' میں اپنا کام صرف اپنے اطمینان کے لیے کرتی ہوں۔" انہوں نے روکھائی سے جواب دیا۔
"تمہارے آنے سے میری یادوں کا ایک خانہ کھلا۔ میں اس کے لیے تمہاری مشکور ہوں۔" پھر انہوں نے قدرے نرم لہجے میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔ ماہ نور کے تنے اعصاب ذرا ریلیکس ہوئے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں ان کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کچھ دیر اپنی یاد کے اس خانے سے جو ماہ نور نے کھولا تھا۔ کچھ باتیں نکال کر سناتی رہیں۔
"آپ کے بچے' آپ کی فیملی۔" ماہ نور نے ——— جھجکتے جھجکتے پوچھا۔
"میرا تعلق بھی خدیجہ اور فاطمہ کے قبیلے سے ہے۔ میں تنہا ہوں۔" انہوں نے غیر واضح جواب دیا۔
"اوہ!" ماہ نور نے کہا اور ایک مرتبہ پھر سعد کی طرف دیکھا۔
"تم کیا کرتے ہو؟" پھر انہوں نے براہ راست سعد سے پوچھا۔
"میں ایک گڈ فار نتھنگ قسم کا انسان ہوں' کچھ خاص نہیں کرتا۔" اس کے جواب نے ماہ نور کو بھی حیران کیا۔
"اور تمہاری فیملی کہاں رہتی ہے۔" یہ سوال انہوں نے ماہ نور سے بھی نہیں کیا تھا۔
"میری فیملی خاصی موبائل ہے' ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتی۔" دوسرا حیران کر دینے والا جواب آیا۔
"ہوں۔" انہوں نے بدستور سعد کی طرف دیکھتے ہوئے گہرا سانس لیا۔
"تمہارے ابا' اماں کیا کرتے ہیں۔" ایک اور سوال آیا۔
"آج تک مجھے خود بھی پتا نہیں چلا۔" سعد نے سکون سے جواب دیا۔ "کیوں کیا کوئی کالا دھندا کرتے ہیں جو چھپا کر مصروف رہتے ہیں اس میں۔" انہوں نے خشمگیں نظروں سے سعد کو دیکھا۔ ماہ نور نے سوالات کے اس

اچانک سیشن پر جزبز ہوتے ہوئے پہلو بدلا۔

"کالے سفید کا بھی اندازہ نہیں۔" سعد نے بھی اسی سکون سے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں ایک دوسرے کے معمول کے بارے میں سوال کرنے کا رواج نہیں۔"

"ہوں!" انہوں نے سر ہلایا اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"یہ لڑکا تمہارا بھائی ہے یا کزن؟"

"ہم لوگ ساتھ پڑھتے ہیں' اکٹھے کمپینز (Compaigns) بناتے ہیں۔" اس بار بھی سعد کی طرف سے جواب آیا۔

"اوہ!" انہیں جیسے مایوسی ہوئی۔

"میرا خیال ہے اب ہم چلتے ہیں۔" ماہ نور کو اب اس ماحول اور فلزا ظہور سے الجھن ہونے لگی تھی۔

"ٹھہرو' میں ابھی آتی ہوں۔" وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئیں ان کے ہاتھ میں ایک بڑی چار کول شیٹ پر بنا اسکیچ تھا۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔" انہوں نے شیٹ میز پر رکھ کر ہاتھ میں پکڑے چار کول کے ٹکڑے سے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ یہ زبردست ہے۔" ماہ نور بے اختیار دو قدم آگے بڑھی۔

"اس کو فریم کروا لینا۔" انہوں نے سائن کرنے کے بعد شیٹ رول کر کے ماہ نور کی طرف بڑھائی۔

"بہت شکریہ۔ یہ ایک ونڈر فل گفٹ ہے۔" ماہ نور یہاں آنے کے بعد پہلی بار خوش نظر آئی۔

"اور تم برخوردار!" انہوں نے ناک کی پھننگ پر ٹکائی عینک اتارتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔ "اپنا فون نمبر دے جاؤ' کبھی ادھر چکر لگے تو پھر آنا۔"

"جی!" وہ تعظیماً" سر جھکا کر بولا اور اپنی جیب سے بال پوائنٹ نکال کر ان کی دی چٹ پر اپنا نمبر لکھ کر ان کی طرف بڑھایا۔

"چلو ٹھیک ہے' بچو' خوش رہو' آباد رہو۔" پھر انہوں نے ماہ نور کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "بادل جھکا ہوا ہے' کہیں بارش نہ آجائے' اب تمہیں جانا چاہیے۔ فاطمہ اور خدیجہ کو میرا اسلام کہنا۔ ان کا نمبر بھی دے جاؤ مجھے۔ میرا لاہور چکر لگا تو ان سے ملنے آؤں گی۔"

ماہ نور نے سعد والی چٹ پر خدیجہ خالہ کا نمبر لکھا اور تیزی سے چلتی باہر نکل آئی۔ باہر واقعی بادل جھکے ہوئے تھے اور ہلکی سی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔

"واہ کیا زبردست موسم ہے۔" سعد اس کے پیچھے آیا اور موسم دیکھ کر بولا۔ ماہ نور اس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔

"یہ تم کس قسم کی خاتون سے ملنے آگئی تھیں۔" گاڑی میں بیٹھ کر اسٹارٹ کر کے روڈ پر گاڑی لاتے ہوئے اس نے کہا۔

"مجھے خود اندازہ نہیں تھا۔" ماہ نور نے منہ بنا کر کہا۔

"تم نے چارلس ڈکنز کو پڑھا ہے۔" اس نے اسٹیئرنگ وہیل گھماتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "تھوڑا بہت۔"

"اس کا ایک کردار ہے مس ہولیشم۔" وہ کچھ سوچ کر مسکرایا۔

"ان فلزا ظہور کو دیکھ کر مجھے وہ کردار یاد آگیا۔"

"ایک کہانی... strgoika monor پڑھی تھی میں نے' جس میں چند بچے ایک پراسرار گھر میں گھس جاتے ہیں اور گھر کا مالک انہیں caldron میں ابلتا عجیب ذائقے والا مشروب پلا دیتا ہے۔ اوہ..." اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگا میں stragoika monor میں جا گھسا ہوں اور وہ محلول آیا کہ آیا۔"

"تمہیں تو بہت اہمیت دے رہی تھیں' بڑے پرسنل سوال کر رہی تھیں۔" ماہ نور نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاہا..." وہ زور سے ہنسا۔ "اب یہ مت کہنا کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہو گئیں۔ میری اماں اگر ہوتیں تو ان سے کم عمر ہی ہوتیں۔"

"تمہاری مدر۔" ماہ نور کو یہ بات سن کر جھٹکا سا لگا۔

"پتا نہیں... میں نے انہیں نہیں دیکھا۔" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"وہ بارش تیز ہو گئی۔" ماہ نور نے بات بدلنے کو کہا۔

"ہاں... دیکھو کتنا حسین نظارہ..." اس کے سیل فون پر بجنے والی مسیج ٹون نے اس کو بات مکمل کرنے سے روک دیا۔

"ایک جگہ میں تمہارے کہنے پر گیا اور مس ہولیشم' سے ملاقات کر آیا۔" مسیج پڑھنے کے بعد اس نے کہا۔ "ایک جگہ میرے کہنے پر چلو گی تم۔" اس نے سوال کیا۔

"کہاں؟" ماہ نور نے چونک کر کہا۔

"اگر تم مجھ پر اعتماد کر سکو تو۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"جانا کہاں ہے؟" ماہ نور نے دوبارہ پوچھا۔

"ہے ایک جگہ' تمہیں کسی سے ملانا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اچھا!" ماہ نور نے تھوڑی دیر سوچا۔ "چلو۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرایا اور گاڑی نئے راستے پر ڈال دی۔

you can count on me
Like one two three
I will be there

"تمہیں بس ایک' دو' تین تک گنتی گننے کی ضرورت ہے' اس کے بعد میں تمہارے پاس موجود ہوں گا۔"

اس نے ایک کے بعد دو کہا اور پھر تین' بارش زوروں پر تھی اور ایسے میں کسی کا کہیں دور سے اٹھ کر ادھر کو آجانا ناممکن سی بات لگ رہی تھی۔ مگر وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوا کے جھونکے کے سنگ آتی پانی کی پھوار میں بھیگتی تین سے آگے گنتی گننے سے انکاری تھی۔ اس کا خوش فہم' پر مسرت دل' موسم کے خراب تیور دیکھ لینے کے باوجود منتظر تھا۔

"ایک' دو' تین' ایک' دو' تین۔" وہ گن رہی تھی۔ جب ہی اسے کال بیل کے بجنے کی آواز آئی۔ اس کا دل جھوم اٹھا۔ وہ سچ کہتا تھا۔ وہ اس کے لیے گنتی گن سکتی تھی۔ جس پر وہ حاضر ہو جاتا۔ چند لمحوں بعد اسے اپنے عقب میں دروازے پر ہلکی دستک کے بعد دروازہ کھل جانے کی آواز آئی۔ بھیگے بالوں' بھیگے چہرے اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس نے ایک' دو' تین بار پلکیں جھپکائیں اور پھر آنکھیں پوری کھول کر دیکھا۔ لمحہ بھر میں اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اسے نہ جانے کیوں اپنے سامنے کا منظر اجنبی سا لگا تھا۔ وہ منظر غیر متوقع تھا یا ناقابل یقین... یہ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بشریٰ احمد



اس کی شادی کو آج پورے بیس دن ہو چکے تھے۔ اپنے کمرے کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے ٹیبل کیلنڈر پر اس کی نگاہ پڑی تو بے ساختہ مسکراہٹ نے لبوں کو چھولیا۔ بیس دن کتنا مختصر سا عرصہ ہوتا ہے لیکن اس مختصر سے وقت میں اس کی زندگی یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ پہلے اس کی ذات کے حوالے کچھ اور طرح کے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن صاحب اور عشرت بیگم کی پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ بابا اور ماما کی پنکی۔ جنید اور عنید کی بجیا اور عروج کی آپی۔ اس کی ذات سے جڑے یہ سب حوالے اسے بہت عزیز تھے۔

اور زندگی میں وہ موڑ آگیا جس کے بارے میں شاید ہر لڑکی ہوش سنبھالتے ہی سپنے بننا شروع ہو جاتی ہے۔ نکاح نامے پر دستخط اور گواہان کے سامنے تین بار عاشر اکمل کے لیے اقرار میں سر ہلانے کے بعد وہ عفیفہ عبدالرحمن سے عفیفہ عاشر بن گئی تھی۔

ذات کا حوالہ بدلتے ہی نئے نئے رشتے اس کی ذات سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اب وہ اکمل صاحب اور بیگم اکمل کی بڑی بہو تھی۔ نائلہ، الوینہ، ذاکر اور ثاقب کی بھابھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ نئے رشتے نزاکت سے بھرپور ہیں اور انہیں بخوبی نباہنا اتنا سہل نہیں جتنا کتابوں، کہانیوں میں ہوتا ہے۔ نئے لوگوں کا مزاج سمجھنا بہت مشکل کام تھا۔ وہ فی الحال بہت سج سج قدم اٹھا رہی تھی۔ کسی کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملے۔ یہ اس کی بھرپور کوشش ہوتی تھی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ بیدار ہو جاتی۔ عاشر کو بھی جگانے کی کوشش کرتی۔ مگر وہ "ابھی کہاں سے صبح ہو گئی۔ سونے دو یار!" کہہ کر کروٹ بدل لیتا۔ وہ مسکرا دیتی۔ ظاہر ہے 'یہ عاشر کا گھر تھا'، سسرال نہیں۔ نہا دھو کر دوپٹا سلیقے سے سر پر جمائے وہ ساس، سسر کے کمرے میں سلام کے لیے جاتی۔ اس کے سسر اکمل صاحب تو خیر نماز کے بعد واک کے لیے نکلے ہوتے۔ زبیدہ خاتون اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتیں، پھر وہ کچن کی راہ لیتی۔ چولہے پر چائے چڑھا کر آٹا گوندھتی۔ اتنے میں نائلہ اس کی نند کچن میں آجاتی۔

"پلیز بھابھی! میں اٹھ تو جاتی ہوں۔ آپ کو اتنی جلد کچن میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ خفا ہو کر کہتی، مگر عفیفہ مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ بٹاتی رہتی۔ نائلہ روٹی، پراٹھے بناتی۔ دسترخوان پر سارے لوازمات سجانا، سب لوگوں کو ناشتے کے لیے بلانا، ساتھ ساتھ کچن میں نائلہ کی بھی مدد کروانا عفیفہ بخوشی سارے کام انجام دیتی۔

ابھی باقاعدہ طور پر اس سے کھیر پکوائی کی رسم ادا نہیں کروائی گئی تھی اس لیے کھانا نائلہ ہی بناتی تھی۔ نائلہ اس سے محض ڈیڑھ، دو برس ہی چھوٹی ہوگی۔ بی اے کے بعد اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر گھر سنبھال لیا تھا۔ زبیدہ خاتون شوگر کی مریضہ تھیں۔ وہ گھر کے کاموں میں حصہ نہ لیتی تھیں اور اس کی شادی سے پہلے تو بیٹی کی مدد کی غرض سے وہ شاید تھوڑا بہت ہاتھ بٹا بھی دیتی ہوں، مگر اب عفیفہ انہیں خود سے ملنے بھی نہ دیتی تھی۔ وہ نائلہ کی ہر ممکن طریقے سے مدد کرواتی تھی، بلکہ اب تو وہ اس انتظار میں تھی کہ اس سے کھیر پکوالی جائے تاکہ وہ باقاعدہ طور پر کچن سنبھال لے۔ وہ اپنے گھر کی بڑی بیٹی تھی، سو چھوٹی عمر سے ہی وہ ماں کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ امور خانہ داری میں ——— طاق ہو گئی تھی۔ چند سال سے تو اس نے ماں کا کچن میں داخلہ ہی بند کر دیا تھا گویا تعلیم سے فراغت کے بعد جو بھی وقت اس نے میکے میں گزارا، بھرپور ذمہ داری کے ساتھ گھر بھر کے کاموں کا بار اپنے سر لے لیا۔

وہ بہت پھرتی سے کام نمٹاتی تھی۔ گھر میں اچانک آنے والے مہمانوں کی خاطر بھی اتنے بھرپور طریقے سے کرتی کہ لوگ حیران رہ جاتے۔

"تم ضرور دو چار ڈشز فریز کیے رکھتی ہو، ورنہ اتنی جلدی اتنا سب کچھ تو نہیں بن سکتا۔" اس کی چچازاد بہن فوزیہ جو اس کی گہری سہیلی بھی تھی۔ تبصرہ کرتی۔

چچا کا گھر شہر کے دوسرے سرے پر تھا، لیکن فوزیہ کی ضد پر چچا اکثر اسے لیے بڑے بھائی کے گھر آن موجود ہوتے اور وہ جھٹ پٹ کئی طرح کے کھانے تیار کر کے دسترخوان سجا دیتی۔ چچا محبت سے بھتیجی کو مسکرا کر دیکھتے۔

"فوزیہ کی ضد تو ایک بہانا ہے۔ ہمیں تو تمہارے ہاتھ کا ذائقہ کھینچ لاتا ہے۔ کچھ اپنی بہن کو بھی سکھا دو بیٹا۔"

"فوزیہ کی پڑھائی اتنی ٹف ہے چچا! یہ کیسے کچن میں



گھنے کی فرصت نکال سکتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنی سہیلی کی طرف داری کرتی۔ فوزیہ میڈیکل کے فورتھ ایر میں تھی۔

"سچ عفی اگر زبیر تم سے پانچ برس چھوٹا نہ ہوتا تو تمہیں صرف میری ہی بھابھی بننا تھا۔"

وہ اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کرتی۔ عفیفہ مسکرا دیتی اور اس کا رشتہ بھی چچا کی فیملی کے توسط ہی سے انجام پایا۔ عاشر' چچا کے ایک دوست کا بیٹا تھا۔ چچا کے گھر میلاد کی محفل میں عاشر کی امی نے اسے دیکھا اور اپنے بڑے بیٹے کے لیے پسند کرلیا۔ کمی عاشر میں بھی کوئی نہ تھی جو اس جانب سے انکار کیا جاتا۔ چچا نے عاشر کے متعلق پوری چھان بین کروائی اور بابا کو گرین سگنل دے دیا۔ پھر تو پلک جھپکتے میں سارے مرحلے طے ہوگئے۔

عاشر بہت سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اس کی رفاقت پر نازاں تھی۔ سسرال والے بھی ابھی تک اس کا خیال رکھ رہے تھے' لیکن وہ اس پیار' محبت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اسے علم تھا کہ اگر اس نے گھر کی ذمہ داریاں بخوبی اٹھالیں تب ہی وہ سسرال والوں کے دل میں جگہ بنا پائے گی۔ عاشر نے بھی سہاگ رات اسے صرف ایک ہی پیار بھری نصیحت کی تھی۔

"کوشش کرنا کہ میرے گھر والوں کو تم سے کوئی شکایت نہ ہو عفیفہ۔" اور وہ تو اپنے گھر سے ہی یہ عزم کرکے آئی تھی کہ جس طرح وہ اب تک ایک بیٹی کا کردار بہترین طور پر نبھا رہی ہے' بہو کی حیثیت میں بھی کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دے گی۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر ہر کام کرنے کی کوشش کرتی اور اس کے بار بار کہنے پر ہی اس سے باقاعدہ طور پر کھیر پکوائی کی رسم ادا کروائی گئی۔ اب وہ مطمئن تھی کہ بنا روک ٹوک کچن کا کام سرانجام دیا کرے گی۔

اس کے سسرال میں میٹھے سے پہلے نمکین میں ہاتھ ڈالنا اچھا شگون نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ بہت دل لگا کر کھانا تیار کرتی۔ اگرچہ اس کے اپنے گھر کے برعکس یہاں دسترخوان پر پکانے والے کی محنت کو سراہنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ وہاں میکے میں تو امی' بابا اور چھوٹے بہن بھائی اس کے ہاتھ کے پکے مزیدار کھانے چٹخارے لے کر کھاتے اور ساتھ ساتھ خوب تعریفیں کرکے سیروں خون بڑھاتے مگر یہاں سب چپ چاپ کھانا کھا کر اٹھ جاتے۔ اسے محسوس تو ہوتا مگر اس نے ان سب کے مزاج سے بخوشی سمجھوتہ کرلیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس نے سارے کام اپنے سر لے لیے۔ جب نائلہ ناشتا بناتی تھی تب وہ اس کی مدد کروانے کی غرض سے سارا وقت کچن میں موجود رہتی تھی لیکن جب سے اس نے ناشتا بنانا شروع کیا۔ نائلہ کچن میں جھانک کر بھی نہ دیکھتی۔ وہ کچن سے ڈائننگ روم تک کے لاتعداد چکر کاٹتی۔

یہ ہی نائلہ تھی جو شادی کے بعد شروع شروع میں اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی اور اب آہستہ آہستہ اس نے سارے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ عفیفہ کبھی گھر جاتی تو ماں' بہنوں کے کریدنے پر اپنی روزمرہ کی روٹین سناتی۔ اس کی چھوٹی بہن عروج کو بہن پر خوب غصہ چڑھتا۔

"تم آپ کو ہی شوق تھا شروع شروع میں ایفی شنسی دکھانے کا۔ اب آپ کو بے وقوف جان کر گھر بھر کے کام آپ کے سر تھوپ دیے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو عروج۔ وہ اب عفیفہ کا گھر ہے۔ گھر کا انتظام سنبھالنا اب عفیفہ کی ذمہ داری ہے۔ نائلہ کا کیا ہے چار دن کی مہمان ہے آخر اس کے بعد بھی تو سب کچھ عفیفہ کو سنبھالنا ہے۔"

امی عروج کو ٹوک دیتیں۔ وہ ماؤں کی اس قسم سے تعلق نہ رکھتی تھیں جو بیٹیوں کو سسرالی رشتہ والوں سے نمٹنے کے گر سکھاتیں۔ وہ خود جب تک جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہیں۔ خدمت گزار اور صلح جو قسم کی بہو بن کر رہیں اور انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بھی ان ہی خطوط پر کی تھی عروج مزاجاً" پھر بھی کچھ تیز تھی لیکن عفیفہ بالکل ان کا عکس تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں

کہ عفیفہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھنا شروع کردے اس میں اس کا اپنا نقصان تھا۔

عفیفہ ماں سے متفق سہی پر یہ بھی سچ تھا کہ وہ دل ہی دل میں کبھی کبھار اپنے سسرال والوں کے رویّے سے گھبرا جاتی۔ شروع کا پیار اور چاؤ چونچلے اب مفقود ہوچکے تھے۔ اکثر نائلہ یا زبیدہ خاتون کوئی ایسی چبھتی ہوئی بات کہہ دیتیں کہ عفیفہ سوچنے پر مجبور ہوجاتی کہ اس سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوگیا ہے۔ جس پر طنز کی نوبت آئی ہے۔

شاید عاشر کا بیوی کے لیے بڑھتا التفات ان کے من کو نہ بھاتا تھا۔ وہ عاشر کو دبی زبان میں سمجھا چکی تھی کہ وہ گھر والوں کے سامنے اپنے طرز عمل میں محتاط رہے۔ آفس سے واپسی پر عفی کی صدائیں لگاتا بیڈ روم میں مت گھسے بلکہ پہلے زبیدہ خاتون کے پاس بیٹھ کر کچھ وقت گزارے۔

"ڈرپوک بیوی! میرے گھر والے اتنے کنزرویٹو نہیں ہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔"

عاشر ہنستے ہوئے اس کی ناک دباتا تھا۔ وہ محض مسکرا کر رہ جاتی۔ کبھی عاشر کی تردید نہ کی اور چند دنوں سے تو زبیدہ خاتون اور نائلہ کے رویے میں مزید سرد مہری اتر آئی تھی اسے بہت سوچنے کے بعد بھی اپنا قصور سمجھ میں نہ آیا۔

اس دن بھی اس نے روٹین کے مطابق گھر کے کام شروع کیے۔ پہلے ناشتا بنایا۔ کچن سمیٹا' ڈھیروں ڈھیر برتن دھوئے۔ اس کے بعد گھر میں بکھری اشیا ترتیب سے ٹھکانے پر رکھیں ماسی۔ صرف جھاڑو پونچھے کے لیے آتی تھی۔ گھر سمیٹنے کے بعد وہ نہا دھو کر فریش ہوئی۔

ہلکا سا میک اپ کرکے خود کو آئینے میں دیکھ کر داد کے کیا۔ عاشر کی موجودگی میں اسے آئینے سے رائے لینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ عاشر کی نگاہیں ہی سب کچھ کہہ دیتی تھیں۔ جس وقت وہ کمرے سے نکلی' عاشر کا تصور ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کا سبب بنا ہوا تھا۔

"اف بھابھی! اتنی گرمی میں بھی آپ میک اپ کیے بنا نہیں رہ سکتیں۔ دو منٹ میں پسینے سے بہہ جائے گا۔"

نائلہ لاؤنج میں بیٹھی چینل سرچنگ کررہی تھی' اسے دیکھ کر نخوت سے بولی۔ یہ وہ ہی نائلہ تھی جو شادی کے اولین دنوں میں اس کے سر پر کھڑے ہوکر میک اپ کرواتی اور خوب ہی توصیفی کلمات سے نوازتی تھی۔ نائلہ کے پُرنخوت انداز پر عفیفہ دل ہی دل میں رنجیدہ ہوگئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ میک اپ کا تو کام ہی اترنا ہے لیکن جب لوگوں کے چہروں پر سے خلوص اور اپنائیت کی نام نہاد تہہ اترتی ہے تو چہرے کتنے بدرنگے لگنے لگتے ہیں لیکن یہ کہنا اپنی شامت بلوانے کے مترادف تھا سو اس نے چپ رہنے پر اکتفا کیا۔

"پروین ابھی تک سبزی نہیں لائی کیا۔" دو چار لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے ملازمہ کی بابت استفسار کیا۔

"ہاں' دیکھ لیں۔ شاید کچن میں رکھی ہوگی۔" نائلہ نے ٹی وی پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ عفیفہ چپ چاپ کچن میں چلی آئی۔

زبیدہ خاتون پڑوس کا راؤنڈ لینے نکلی ہوئی تھیں۔ سلیب پر سبزی کا شاپر دھرا تھا۔ آج شاید قیمہ کریلے پکنے کا پروگرام تھا۔ وہ کریلے ٹوکری میں ڈال کر چھری وغیرہ لے کر لاؤنج میں ہی چلی آئی۔ اس کے سسرال والے خاصے خوش خوراک تھے۔ ایک وقت میں اتنی ترکاری بنتی جتنے میں اس کے میکے والے باآسانی دو وقت کا کھانا کھالیتے۔ بہرکیف خوش خوراکی کوئی قابل اعتراض فعل نہ تھا ہاں اکیلے سبزی بنانا ذرا مسئلہ لگتا۔

میکے میں امی سبزی بنوانے میں مدد کرتی تھیں اور یہاں جب تک نائلہ کھانا بناتی تھی وہ نائلہ کے ساتھ لازمی سبزی بنواتی تھی لیکن جب سے اس نے کھانا بنانا شروع کیا تھا' نائلہ نے تقریباً" ہر کام سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ وہ آج کل صرف ٹی وی دیکھتی یا حسن نکھارنے کے لیے ٹوٹکے آزماتی رہتی۔

چند مہینوں بعد اس کی شادی متوقع تھی۔ نائلہ کی منگنی اپنے ددھیالی رشتہ داروں میں ہوئی تھی اگر عاشر

اور عفیفہ کی شادی کے وقت نائلہ کا منگیتر برسر روزگار ہوتا تو ہو سکتا ہے' وہ بھی ساتھ ہی نمٹ جاتی لیکن ایم بی اے کے باوجود اس کے منگیتر بلال کو اچھی نوکری کے حصول کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اللہ اللہ کر کے اسے جاب ملی تھی۔ اب اس کے سسرال والوں کی طرف سے شادی کا تقاضا تھا۔ یہ نائلہ کے اپنے گھر میں آخری چند مہینے تھے۔ عفیفہ اس سے کسی قسم کی بدمزگی نہ چاہتی تھی اور بقول امی کام کا کیا تھا' وہ تو نائلہ کی شادی کے بعد بھی عفیفہ کو ہی کرنا تھا کہ باقی نندیں دیور ابھی پڑھ رہے تھے اور زبیدہ خاتون گھر کے کاموں سے بالکل لاتعلق۔

عفیفہ کریلے چھیل کر بیج نکالنے کا مرحلہ طے کر رہی تھی کہ زبیدہ خاتون آگئیں

"فریزر سے قیمہ تو نکال لیا ہو گا۔" انہوں نے آتے ہی سوال کیا اور عفیفہ اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہو گئی۔

"ذہن سے ہی نکل گیا امی۔ ابھی نکال لیتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھی تھی۔

"ذہن حاضر رکھا کرو نا بہو بیگم! تمہیں اپنی تیاریوں سے فرصت ملے تو کسی اور طرف دھیان جائے۔"

انہوں نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ عفیفہ چپ کی چپ رہ گئی۔ اس نے تو سنا تھا کہ ساسیں نئی نویلی بہوؤں کو تیار دیکھ کر مسرت اور خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن یہاں الٹا معاملہ درپیش تھا۔

"عاشر کے ابا کے آنے میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ دوپہر کا کھانا اگر وقت پر تیار نہ ہو تو کتنا ناراض ہوتے ہیں وہ۔" زبیدہ خاتون مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

"ابا کے آنے سے پہلے کھانا تیار ہو جائے گا امی۔" اس نے یقین دہانی کروائی۔

"آپ نے سبزی بنالی نا بھابھی! کھانا تو میں خود بناؤں گی۔" نائلہ ریموٹ سے ٹی وی آف کرتے ہوئے اٹھ گئی۔

"کوئی مسئلہ نہیں نائلہ! میں بنالوں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے نائلہ کو مخاطب کیا۔

"اُفوہ! آپ کو کیوں کوئی مسئلہ ہونے لگا۔ گھر والوں کو آپ کے ہاتھ کا پکا پسند نہیں آتا۔ بعد میں سب مجھ سے کہتے ہیں کہ بھابھی کو کھانا کیوں پکانے دیا۔ تم خود پکایا کرو۔"

نائلہ کا لہجہ اسے سراسر اپنا مذاق اڑاتا لگا۔ وہ اگر عمر میں اس سے زیادہ چھوٹی نہ تھی مگر رشتے کے اعتبار سے تو چھوٹی تھی۔ کتنا احساس برتری لیے ہوئے تھا اس کا لہجہ۔ آنسو اس کی آنکھوں سے چھلکنے کو بے تاب ہوئے جا رہے تھے اس نے بدقت خود کو سنبھالا۔

"ہاں بہو! نائلہ ٹھیک کہہ رہی ہے تم محسوس نہ کرو مگر سچ یہی ہے، ہم سب کو اس کے ہاتھ کے کھانے کی عادت سی پڑ گئی ہے پھر ماشاء اللہ قدرتی طور پر اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے۔ تم اس کا ہاتھ بٹا دیا کرو سبزی وغیرہ بنا دیا کرو لیکن ہانڈی نائلہ ہی پکائے گی۔" زبیدہ خاتون نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"جی امی!" اس نے بمشکل گردن ہلائی۔

"آپ کچن میں جا کر پیاز کاٹ دیں اور قیمہ نکال رکھیں میں ابھی آتی ہوں۔"

نائلہ نے اسے مخاطب کیا اور اسے تو منظر سے ہٹنے کا بہانہ درکار تھا فوراً" کچن میں چلی آئی۔ فریزر سے قیمہ نکال کر باہر رکھا اور پھر پیاز چھیلنے بیٹھ گئی۔ بے وقت آنے والے آنسوؤں کی پردہ پوشی کا اس سے بہترین طریقہ کوئی اور نہ تھا۔ اپنے گھر میں پندرہ' بیس افراد کا دعوتی کھانا بھی وہ بنا کسی کی مدد کے اکیلے تیار کر لیتی تھی اور سب سے خوب تعریف سمیٹتی تھی۔

اس نے سوچا تو یہ ہی تھا کہ سسرال والوں کے معدوں کے ذریعے دلوں تک راستہ بنالے گی۔ وہ لوگ اتنے تنگ دل واقع ہوں گے۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ شاید عاشر کا اس کے لیے بڑھتا التفات اس کی ماں بہنوں کو عدم تحفظ کا شکار کر رہا تھا۔ لیکن اس میں عفیفہ کا تو کوئی قصور نہ تھا۔

وہ حتی الامکان کوشش کرتی کہ سب کے سامنے عاشر اور وہ "ریزرو" رہیں لیکن عاشر کے لیے یہ اس کا گھر تھا سسرال نہیں۔ اسے "محتاط" طرز عمل اپنانے کی کیا ضرورت تھی۔ سہاگ رات اس نے بیوی کو اپنے گھر والوں کا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی لیکن وہ خود اپنے گھر والوں کے مزاج کے برعکس رویہ اپنائے ہوئے تھا۔

روز شام کو وہ بیوی کے لیے گجرے لاتا اور سب کے سامنے ہی گجروں کا لفافہ اس کے ہاتھ میں اس تاکید سے تھماتا کہ فٹافٹ انہیں ہاتھوں میں پہن لو وہ "مجبوراً" شوہر کی خواہش کی تکمیل کرتی۔ ساس نندوں کے منہ کے بگڑے زاویے اسے تو نظر آجاتے۔ جانے عاشر کو کیوں نہ دکھائی دیتے اور زبیدہ خاتون اور نائلہ نے کسی نہ کسی بہانے تو اس سے اپنی ناراضی کا اظہار کرنا ہی تھا سو کھانے کا چارج اس سے واپس لے لیا گیا۔

وہ سبزی بناتی۔ لہسن ادرک پیس کر رکھتی۔ مسالے کے ڈبے نکال کر شلف پر ترتیب سے رکھتی اور نائلہ کسی کوکنگ شو کی میزبان کی طرح وقت مقررہ پر کچن میں آکر کھانا تیار کر دیتی۔

آٹا گوندھ کر روٹی پکانا عفیفہ کی ہی ذمہ داری تھی۔

اس نے اپنی روٹین سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ہاں کبھی کبھار اپنی بے وقعتی پر آنکھیں چھلک جاتیں۔ "عموماً" پیاز چھیلتے کاٹتے ہوئے وہ اپنے کب سے رکے ہوئے آنسوؤں کو بہنے کا موقع دے دیتی۔

"آپ کی آنکھوں سے تو پیاز کاٹتے ہوئے بہت ہی پانی آتا ہے۔ ایسی بھی کیا نازک مزاجی۔ لگتا ہے' آپ اپنے گھر میں ایسے کاموں کی عادی نہ تھیں۔"

نائلہ اکثر و بیشتر طنز کا تیر چلاتی۔ وہ نم آنکھوں سے محض مسکرانے پر اکتفا کرتی۔ نائلہ اب اس گھر میں واقعی چند دن کی مہمان تھی وہ اس کی باتوں کو درگزر کر دیتی۔ اس کے سسرال والوں کو شادی کی تاریخ دے دی گئی تھی اور آج کل گھر میں نائلہ کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ اس پر اضافی کاموں کا بوجھ بڑھ گیا تھا مگر وہ صبر و شکر کو ہتھیار بنائے چپ چاپ اپنی ذمہ داریاں نبھاتی رہی۔

نائلہ کی شادی پر اس نے اتنا کام کیا کہ گھر آئے مہمان تک اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ زبیدہ خاتون ایسی باتوں کو سُنی ان سُنی کر دیتیں۔ البتہ نائلہ کی شادی کے بعد کچن کی ذمہ داری عفیفہ کو سونپ دی گئی۔ زبیدہ خاتون کے لیے کچن میں دو گھڑی رکنا بھی ممکن نہ ہوتا تھا سو عفیفہ کے پکائے کھانوں پر اعتراض کا سلسلہ بھی رک گیا تھا شاید جب تک نائلہ تھی تو وہ ماں کی توجہ بہت سی ایسی باتوں کی طرف دلاتی رہتی تھی جن کی طرف ان کا خود دھیان نہ جاتا۔

اس کے جانے کے بعد زبیدہ خاتون کا رویہ قدرے بہتر ہو گیا تھا اور پھر جب ننھے مہمان کی خوش خبری ملی تو گویا عفیفہ کے قدم گھر میں مضبوطی سے جم گئے۔ اب وہ پہلے والی سہمی سہمی سی عفیفہ نہ تھی۔ جانے اس میں کہاں سے اتنا اعتماد آگیا تھا۔ وہ اب بھی زبیدہ خاتون کی کسی غلط بات کا پلٹ کر بدتمیزی سے جواب تو نہ دیتی البتہ شائستگی سے اپنا موقف بھی پیش کر دیتی۔

زبیدہ خاتون اس کا پُراعتماد انداز دیکھ کر جی ہی جی میں حیران تو ہوتیں مگر آگے سے کچھ نہ بولتیں۔ عفیفہ کو کبھی کبھار عروج کی بات سچ لگتی کہ جو جتنا زیادہ دبتا ہے اُسے اتنا ہی دبایا جاتا ہے۔ عروج کے مشورے تو خیر اور بھی بہت تھے لیکن عفیفہ نے اپنی جانب سے ساس کے احترام میں کوئی کمی نہ رکھی۔ کچھ بھی تھا وہ عاشر کی ماں تھیں اور سچ تو یہ تھا کہ نائلہ کی شادی کے بعد ان کے مزاج میں وہ پہلے والا طنطنہ باقی نہ رہا تھا۔

نائلہ بھرے پرے سسرال میں بیاہی تھی۔ ایک ہی شہر میں ہونے کے باوجود اسے میکے کا چکر لگائے ایک مدت گزر جاتی۔ میاں کے ساتھ آتی بھی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی۔ شادی کے بعد شروع شروع میں نائلہ پر بہت روپ چڑھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا ستارے بھر گئے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ نائلہ کا رنگ روپ ماند پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بجھی بجھی سی رہنے لگی تھی قدرے کمزور بھی ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً" ماں کے سامنے اپنے دکھڑے روتی تھی تاہم جب بھی عفیفہ آتی دونوں ماں' بیٹی گفتگو کا موضوع بدل دیتیں۔

نائلہ کے جانے کے بعد زبیدہ خاتون جب کی چادر

اوڑھ لیتیں۔ ان کی پریشانی اور رنجیدگی واضح محسوس ہوتی تھی۔ عفیفہ کو اب ان پر ترس آنے لگا تھا۔ اس روز بھی زبیدہ خاتون بہت اداس دکھائی دے رہی تھیں۔

"کتنے دن ہوگئے' نائلہ نے چکر نہیں لگایا۔" عفیفہ انہیں چائے دینے گئی تو انہوں نے بہو سے ہی اداسی شیئر کرڈالی۔

"عاشر کی چھٹی میں بھی بہت دن پڑے ہیں ورنہ اسی کے ساتھ چکر لگالیتی۔"

انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ عاشر کی آج کل آفس میں مصروفیت بڑھی ہوئی تھی وہ اکثر رات گئے لوٹتا تھا۔

"امی! اگر آپ کو نائلہ زیادہ یاد آرہی ہے تو ہم دونوں اس کے گھر چلے چلتے ہیں۔" اس نے ساس کی اداسی کا خیال کرکے تجویز پیش کی۔

"ہم دونوں؟" انہوں نے حیرانی سے بہو کو دیکھا۔

"جی امی! ہم دونوں۔ رکشہ یا ٹیکسی کرکے چلے چلتے ہیں۔ موسم بھی آج اچھا ہے۔ رات کو جو بریانی بنائی تھی۔ وہ بہت ساری بچی ہوئی ہے۔ آلو گوشت کا شوربا بھی فریج میں ہے۔ میں ابا کی دو روٹیاں ڈال کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دیتی ہوں۔ ثاقب وغیرہ آئیں گے تو دو دن میں بریانی گرم کرکے کھالیں گے۔ ابا کے پاس چابی تو ہوتی ہے۔ آپ انہیں فون کرکے بتادیں کہ ہم نائلہ کی طرف جارہے ہیں۔" اس نے جھٹ پٹ پروگرام ترتیب دے ڈالا۔

"ہاں' یہ ٹھیک کہا تم نے۔ عاشر کا انتظار کب تک کروں۔ ہم ماں بیٹی ہی چلے جاتے ہیں۔" وہ اس تجویز پر خوش ہوگئی تھیں۔

"میرے تو کپڑے ٹھیک ہیں۔ تم نے کپڑے بدلنے ہوں تو جلدی سے تیار ہوجاؤ۔" انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"جی امی! میں دو منٹ میں تیار ہوتی ہوں۔ بس پہلے ابا کی روٹیاں ڈال دوں۔" اس نے مستعدی سے کہا۔

"تمہارے ابا کی روٹیاں میں بنادیتی ہوں' دو روٹیاں بنانے میں کتنی دیر لگے گی۔"

زبیدہ خاتون نے اسے زبردستی تیار ہونے کے لیے کمرے میں بھیجا۔ اس نے واقعی تیار ہونے میں دس منٹ لگائے تھے۔ زبیدہ خاتون اس سے پہلے چادر اوڑھے تیار کھڑی تھیں۔

"کیک یا مٹھائی راستے میں سے ہی لے لیں گے۔" عفیفہ نے انہیں مخاطب کیا۔

"جیتی رہو بیٹی! میرے تو ذہن نے ہی کام کرنا چھوڑ دیا۔ یہ بات میرے ذہن میں نہ آئی تھی۔" انہوں نے اس کی عقل مندی کو سراہا تھا۔

اور جب وہ نائلہ کی پسند کا چاکلیٹ کیک لے کر اس کے سسرال پہنچیں تو نائلہ انہیں غیر متوقع طور پر اپنے گھر دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"اف امی! میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ آپ سے ملنے کا میرا کتنا دل کررہا تھا۔" وہ ماں سے لپٹ گئی۔

"تو بھابھی! آپ پر کوئی پابندی تو نہیں لگا رکھی۔ جب جی چاہتا ہے آنٹی سے ملنے چلی تو جاتی ہیں۔" نائلہ کی نند نے بظاہر مسکرا کر کہا تھا۔ مگر نائلہ چپ کی چپ رہ گئی۔

"یوں دوپہر میں آنا کچھ نامناسب سا تو لگتا ہے۔ لیکن ہم نے اچھے موسم کا فائدہ اٹھایا۔ میرا اور امی کا نائلہ سے ملنے کا بہت جی چاہ رہا تھا۔ بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔" عفیفہ نے خوش دلی سے کہتے ہوئے ماحول پر چھائی خاموشی توڑی۔

"ہاں ہاں' بہت اچھا کیا۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب وقت مرضی چاہیں آئیں۔" نائلہ کی ساس نے بھی جواباً" خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"میں تو خود اتنے دنوں سے نائلہ سے کہہ رہی تھی کہ میکے کا چکر لگا آئے لیکن بلال کی آفس ٹائمنگ ایسی ہے کہ چاہنے کے باوجود وقت نہیں نکال پاتا۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ بیٹا! اپنے بھائی کو بلوالو اس کے ساتھ میکے چلی جانا دو چار دن وہاں گزار لینا لیکن آج کل کے بچے۔ ان کا ایک دوسرے کے بغیر جی بھی تو نہیں لگتا۔ نائلہ نے ہی منع کردیا کہ آنٹی بلال کے ساتھ ہی جاؤں گی اور گھر والوں سے مل کر واپس آجاؤں گی۔"

اس کی ساس مسکراتے ہوئے جانے وضاحت دے رہی تھیں یا کچھ جتا رہی تھیں' تاہم عفیفہ جانتی تھی کہ یہ غلط بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ ہر لڑکی کی طرح نائلہ بھی میکے جاکر رہنا چاہتی تھی تاہم سسرال والوں کے موڈ بگڑنے کے ڈر سے وہ دل کی خواہش دل میں دبا لیتی تھی۔

عفیفہ چاہنے کے باوجود نائلہ کی ساس کو اس کی غلط بیانی پر نہ ٹوک سکی۔ زبیدہ خاتون بھی چپ رہنے پر مجبور تھیں۔ نائلہ جھٹ پٹ کولڈ ڈرنک کے گلاس ٹرے میں سجائے لے آئی اور پھر "کچن کا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے میں ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر کچن میں گھس گئی۔

گلاس خالی ہوئے تو عفیفہ انہیں ٹرے میں رکھ کر کچن میں رکھنے چلی گئی۔ نائلہ پیاز کاٹ رہی تھی۔

"آپ رہنے دیتیں بھابھی! میں اٹھا لیتی گلاس۔" اس نے عفیفہ کے ہاتھ سے ٹرے لے کر رکھی۔

"اگر تمہارا ہمارے ساتھ چلنے کا پروگرام ہو تو بلال کو فون کرکے پوچھ لو۔ تمہاری ساس سے ہم پوچھ لیں گے۔" اس نے دھیمے لہجے میں نائلہ سے پوچھا تھا۔

"جانے کو دل تو بہت کررہا ہے بھابھی مگر۔" وہ متذبذب تھی اتنے میں۔ اس کی نند بھی کچن میں آگئی۔

"عفیفہ بھابھی! آپ اتنی گرمی میں کیا کررہی ہیں نائلہ بھابھی کا کام بس ختم ہونے کو ہے پھر یہ آپ کے پاس آکر بیٹھتی ہیں۔"

"ہاں' میں تو بس یہ گلاس رکھنے آئی تھی۔" عفیفہ نے جیسے وضاحت دی۔ شبانہ نے مسکرا کر اثبات میں سرہلایا پھر نائلہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پیاز کم ہے بھابھی! ایک دو اور کاٹ دیں اور گوشت نہیں دھویا ابھی تک۔"

"نہیں۔ بس ابھی دھو دیتی ہوں۔" نائلہ نے جلدی سے جواب دیا۔

"نائلہ بھابھی بہت سست ہیں۔ سبزی وغیرہ بنانے میں ہی اتنی دیر کردیتی ہیں حالانکہ کھانا سارا میں پکاتی ہوں۔ ان کے ذمے تو بس یہ اوپر نیچے کے چھوٹے موٹے کام ہی ہیں۔"

شبانہ جتا رہی تھی۔ عفیفہ کی نگاہیں بے ساختہ نائلہ کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی پیاز نے آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کا پردہ رکھ لیا تھا۔ عفیفہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ فطرتاً" بہت حساس اور صاف دل کی لڑکی تھی۔

نائلہ کی شادی کے بعد جب سے زبیدہ خاتون کا رویہ اس سے بہتر ہوا تھا اس نے ماضی کی تمام تلخ باتیں فراموش کردی تھیں۔ شادی کے بعد نائلہ اس سے بہت تمیز سے پیش آنے لگی تھی۔ اسے اب نائلہ سے کوئی شکایت نہ تھی۔ لیکن اس وقت نائلہ کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو اسے ماضی میں لے گئے تھے۔

کاش ہر لڑکی اس حقیقت کو سمجھ لے کہ خونی رشتوں سے محبت تو ایک فطری امر ہے لیکن وہ رشتے جو آپ کے پیاروں کی ذات کے حوالے سے آپ کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ بھی اسی عزت' محبت اور اپنائیت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کا خمیازہ تو شاید ہر فرد کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر بھگتنا پڑتا ہے لڑکیوں کی زندگی میں "سسرال" کی صورت میں وہ موڑ بہت جلد آجاتا ہے۔

عفیفہ کی طرح شاید نائلہ بھی ماضی میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی آنسو۔ بھری آنکھوں میں معذرت کے رنگ باآسانی دیکھے جاسکتے تھے۔ اس نے محبت سے مسکرا کر نائلہ کو دیکھا۔ صدق دل سے اس کی ہنستی بستی زندگی کے لیے دعا کی' ساتھ ہی شبانہ کے طرز عمل میں بہتری کے لیے بھی۔

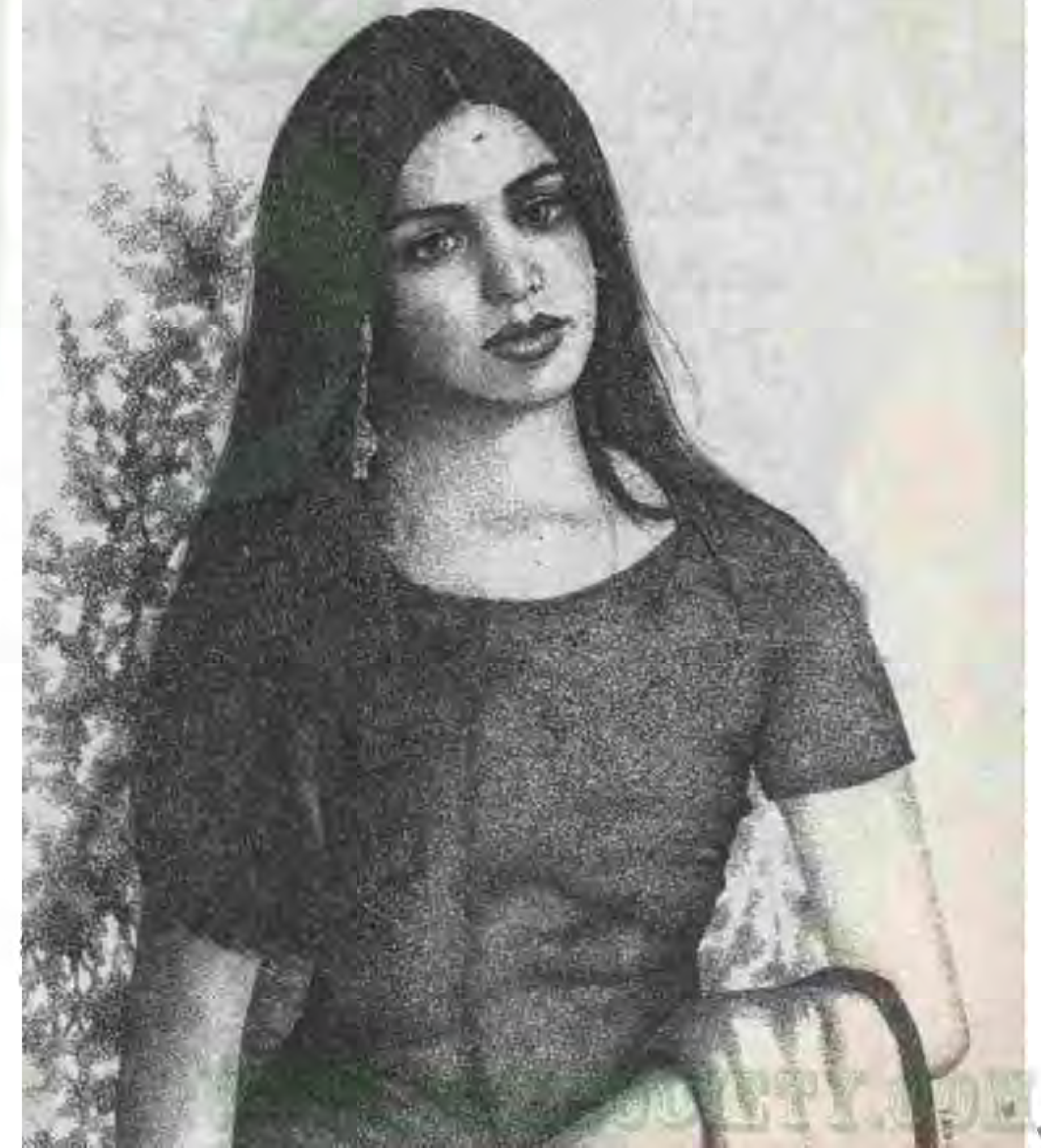
کیا ہی اچھا ہو جو شبانہ کو اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس اسی گھر میں ہوجائے ورنہ جلد یا بدیر اسے بھی ماں باپ کے عافیت کدے سے نکل کر سسرال کی بھٹی میں آزمائش کے لیے اترنا ہی تھا۔ عفیفہ ہر دو کے لیے دعاگو تھی۔

☆

فرحین اظفر

بہار کی دستک

ناولٹ



اتوار کا دن تھا‘ چھوٹے سے لان کے کونے میں لگے پیپل کے چوڑے پتے دھوپ کی شرارت پہ تالیاں بجاتے چمک رہے تھے‘ ٹھنڈی ہوا بہت مدھم سی تھی۔

وہ بڑی محویت سے کیاریوں کی مٹی نرم کرکے نئی پنیریاں لگا رہی تھی۔ ہری مرچ‘ ٹماٹر‘ دھنیا اور اس جیسی دوسری عام سی گرما کی سبزیاں جنہیں لگانے کا مقصد انہیں گھر میں استعمال کرنا نہیں‘ بلکہ محض دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

دن بھر کے کاموں سے فراغت کے بعد اس کے بس یہ ہی دو مشاغل تھے۔

باغبانی اور مطالعہ۔

دونوں ہی شوق ابا میاں سے اس کے اندر خود منتقل ہو گئے تھے۔

نہ کسی نے کبھی ٹوکا‘ نہ اس کا اپنا دل ہی کبھی بھرا۔ اس وقت بھی اس نے نئے بیج بوئے‘ بچوں کی طرح پودوں سے باتیں کرتے‘ گوڈی کرتے‘ گھنٹہ بھر ہو چکا تھا۔

رجو دوبار ناشتے کے لیے آئی‘ مگر... وہ ہنوز اپنے میں گم تھی۔ عمر نہ آتا تو یقیناً“ وہ وہیں بیٹھی شام کر دیتی۔

اس نے قریب جا کر زور سے ہاؤ کر دیا۔

مہرالنسا کے ہاتھ ایک دم کانپ گئے‘ پھر وہ ہنس دی۔

”تمہارا بچپنا کب جائے گا عمر!“ وہ اٹھ کر نلکے کے پاس ہاتھ دھونے چلی گئی۔

”جب میں آپ کے برابر ہو جاؤں گا۔“

”اور تمہیں پتا ہے‘ تم کبھی میرے برابر نہیں ہو گے‘ یہ تین سال کا فرق ہمیشہ ہمارے درمیان رہے گا۔“ وہ اس کے ساتھ اندر کی طرف آتے ہوئے ہنس کر بولی۔

”تو پھر میں بھی کبھی بڑا نہیں ہوں گا۔“

اس نے محبت سے اپنے تایازاد کو دیکھا۔ خدا کی بنائی ہوئی اتنی بڑی کائنات میں ایک وہ ہی تو اس کا

اور مخلص دوست تھا۔

"کالج کیسا چل رہا ہے۔"

"فرسٹ کلاس' ناشتا کرو گے؟"

"نہیں' آج خالہ جان نے کروا دیا تھا۔ چائے پی لوں گا۔"

وہ ڈائننگ ٹیبل پر اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ وہ ناشتا کرتے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ تعطیل کے روز ناشتے پر ہفتے بھر کی تازہ ترین خبریں سننا اور سنانا' چاہے وہ ملکی حالات کے بارے میں ہوں یا خاندانی' دونوں کا معمول تھا' باسی خبروں پر تبادلہ خیال اور تبصرہ و تجزیہ بھی ان ہی اوقات میں فرصت سے نمٹایا جاتا تھا۔

اگر وہ پورا ہفتہ اس سے بات نہ کرپاتا تو یہ بیٹھک طویل ہو جایا کرتی تھی۔

مہر النسا اپنی پٹاری میں سے گرلز کالج کے نت نئے قصے نکال کر اسے سناتی اور وہ اپنے ان باکس میں سے تقریباً" تمام ہی میسجز پڑھ ڈالتا۔

کبھی کسی مزے دار لطیفے پر وہ ہنس ہنس کر دہری ہو جاتی اور عمر کمنٹس دیے ہی چلا جاتا' اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔

ہنس ہنس کر مہر النسا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا' جب ایک آواز پر دونوں کو بریک لگا۔

"عمر!" دروازے میں سنجیدہ صورت بنائے نتاشا کھڑی تھی۔

"آؤ آؤ تاشو! تم بھی ہمیں جوائن کرو نا' دیکھو کتنے مزے مزے کے میسج سنا رہا ہوں۔" عمر نے مڑ کر دیکھا تو فورا" آواز دے ڈالی۔

"نہیں ابھی نہیں' تمہیں امی بلا رہی ہیں فورا"۔ کوئی کام ہے شاید۔" وہ وہیں سے پلٹ گئی۔

عمر کھسیا سا گیا' نتاشا کے انداز میں ناگواری کی واضح جھلک تھی۔

"جاؤ' کیا پتا سچ مچ کوئی کام ہو۔"

مہر النسا نے اپنے تئیں اس کی شرمندگی کم کرنا چاہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اکرام اللہ' انوار اللہ اور سمیع اللہ' تینوں بھائی اس وسیع و عریض گھر کے اہم ستون تھے۔

اکرام اللہ نے اپنے بڑے صاحبزادے باسط اکرام اللہ سے اپنے بھائی کی بیٹی مہر النسا کی بات طے کر رکھی تھی' چھوٹے عمر اکرام اللہ تھا۔

مہر النسا جو باسط اکرام اللہ سے منسوب تھی۔ سمیع اللہ کی بیٹی تھی' اس سے بڑا سہیل سمیع اللہ تھا۔ جو اسلام آباد میں رہائش پذیر تھا۔ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔

نتاشا انوار اللہ سب سے چھوٹے بھائی کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کا اس گھر سے دہرا رشتہ تھا' ننھیالی بھی اور ددھیالی بھی۔ وہ اکرام اللہ کی بیگم ناصرہ کی چھوٹی بہن زبیدہ کی اولاد تھی جو اکرام اللہ کے بھائی' انوار اللہ سے ان کی اپنی پسند پر بیاہ کر اس گھر میں لائی گئی تھیں۔

اکلوتی اور سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے نتاشا انوار اللہ کو اس گھر کے بچوں میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ کم و بیش یہی حال عمر کا تھا۔ اسے بھی ماں اور خالہ کا پیار اور خصوصی توجہ حاصل تھی۔ مستقبل قریب میں ان دونوں کا آپس میں رشتہ کرنے کا ارادہ بھی دونوں' بہنوں نے محبت اور خیر سگالی کے جذبات مزید فروغ دینے کے لیے ہی طے کر رکھا تھا۔

گھر کافی بڑا تھا۔ سب کی فیملیز اور ضروریات کے لحاظ سے پورشنز میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

مہر النسا نے اپنے شوق اور خوشی سے گھر کا سب سے چھوٹا اور پچھلا حصہ لے رکھا تھا۔

وہ اپنے گھر میں تھی بھی تنہا۔

امی اور بابا تو بہت بچپن میں چل بسے تھے۔ بھائی بھی شادی کے بعد اسلام آباد کا ہو رہا۔

ابا میاں' اکرام اللہ نے مہر النسا کو اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر چاہا تھا۔ باسط کے بیرون ملک جانے سے پہلے طے کی جانے والی نسبت ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھی' جو ناصرہ کی رضامندی لیے بغیر صرف اور صرف

ابا میاں کی خواہش پر طے کی گئی تھی۔ باسط بھی اس رشتے سے کچھ خاص خوش نہ تھے۔ البتہ مہر النسا کی بات الگ تھی۔ اس نے بچپن سے ہی فرماں برداری کا سبق پڑھا' یاد کیا اور اس پر ہمیشہ عمل بھی کیا تھا۔

باسط گئے تو پانچ سال کے لیے تھے' مگر پھر یہ عرصہ دراز ہو گیا۔ اب آٹھ سال ہونے کو آئے تھے۔ پچھلے تین سال سے ان کا گھر والوں سے صرف ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ چار سال پہلے وہ آخری بار پاکستان آئے تھے۔

ابا میاں کئی بار ان سے مہو کی رخصتی کے لیے کہہ چکے تھے' مگر وہ مسلسل ٹال مٹول میں لگے تھے' ان کے ارادے اور مستقبل کے بارے میں خیالات کچھ بھی دو ٹوک اور واضح نہ تھے۔

مہو اپنی عمر عزیز کی تیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔

سارے خاندان کو علم تھا کہ وہ اپنے' تایازاد باسط سے منسوب ہے' اس لیے رشتوں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ جاری حصول علم کا سلسلہ ذرا سا راستہ بدل کر چل نکلا' پہلے وہ علم حاصل کر رہی تھی' بعد میں اتنی ہی لگن سے بانٹنے لگی۔ ہاں' لیکن کبھی جب ابا میاں اسے اداس یا خاموش دیکھ لیتے تو کئی راتوں تک ٹھیک سے سو نہ پاتے تھے۔

مہر النسا جب بالکل ننھی سی تھی اتنی ننھی کہ پونیوں میں سرخ ربن ڈال کر اسکول جایا کرتی تھی۔

تب صبح سویرے تیار ہو کر ابا میاں کے خاص مرتبان سے گرما میں ٹافیاں اور سرما میں خشک میوہ جات بطور انعام (اور اس انعام کے دیے جانے کی کبھی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی تھی) لینے جاتی تھی۔ یہ انعام اسے روز صبح سویرے اٹھ کر نہا دھو کر اسکول کی تیاری کے لیے ملا کرتا تھا۔

اسی انعام کے لالچ میں وہ ایک دن کی بھی چھٹی نہیں کرتی تھی۔ اس کا یہ معمول ہفتہ وار تعطیل کے دن بھی یوں ہی جاری و ساری رہتا تھا۔ بس اتنا فرق پڑتا تھا کہ اس روز یونیفارم کے بجائے گھر کی سلی ہوئی رنگ برنگی فراک میں ملبوس ہوتی' جبکہ اس کے ساتھ ہی اسکول جانے والا عمر اکرام اللہ اپنے نرم بستر میں محو خواب ہوتا۔

تب سے اب تک زندگی میں کتنی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ زندگی بھی اور وہ خود بھی سراپا بدل چکی تھی۔

نہ بدلا تو اس کا معمول یا پھر ابا میاں کی محبتیں' جو روز اول سے اس کے لیے یوں ہی قائم و دائم تھیں۔

تب سے جب وہ خود طالب علم تھی۔ اب تک' جبکہ وہ خود اپنے علم سے دوسروں کو فیض یاب کرتی' علم کی شمعیں گھر گھر روشن کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سہ پہر کا وقت تھا۔

دیواروں پر اونگھتی دھوپ پیلی پڑ رہی تھی۔ شدید گرمی اور دھوپ کی تمازت سے درختوں اور ننھے پودوں کے پتے زمین کی طرف سر نیہوڑائے کھڑے تھے۔ وہ غسل کرنے کا ارادہ کرتی کمرے سے نکلی تو عمر بمع پیغام کے حاضر تھا۔

"ابا میاں نے بلوایا ہے آپ کو۔" اس نے سن کر تعجب کیا۔

"پتا نہیں کیوں۔" وہ جلدی میں تھا۔

اس نے سوچا' صبح جب وہ ابا میاں کو سلام کرنے گئی تھی تو وہ کمرے میں نہیں تھے۔ اسے دیر ہو رہی تھی تو وہ یوں ہی واپس آگئی تھی۔ شاید اسی لیے بلوایا ہو۔

جلدی جلدی نہا کر کپڑے تبدیل کیے اور ان کی طرف چلی آئی۔

"صبح مجھے دیر ہو رہی تھی اور آپ کمرے میں نہیں تھے تو...."

وہ سب سے پہلے یہ ہی بات واضح کرنا چاہتی تھی۔ مگر... جھجک کر رک گئی۔

اسٹڈی میں کوئی اور بھی موجود تھا۔ اجنبی چہرہ مگر بے تکلف انداز۔

"آیئے آیئے' استانی صاحبہ! آج تو ہمیں آپ سے کام آن پڑا ہے' ان سے ملیے۔"

ابامیاں کا انداز جدا تھا' لہجے میں ترنگ سی تھی۔

"اپنے خالد چچا یاد ہیں آپ کو؟ وہ ہی جو آپ کے بچپن میں ہم سے روز ملنے آیا کرتے تھے۔"

مہر النسا نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے ابامیاں کو دیکھا۔ ان کا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہورہا تھا۔

"ان کے صاحبزادے ہیں یہ۔ معید میاں' ماشاءاللہ سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لے رکھی ہے لندن سے۔ کئی سال سے سعودیہ میں تھے۔ حال ہی میں پاکستان لوٹے ہیں' اور آتے ہی ہم سے ملنے چلے آئے' ماشاءاللہ۔"

مہر النسا سر جھکائے بیٹھی اس پورے پیراگراف میں سے ابامیاں کے خوشی کے کئی پہلو ڈھونڈ چکی تھی۔

پرانے دوست سے بحال ہوتے مراسم۔

نوجوان نسل کے کسی فرد کے طرف سے دی جانے والی عزت' جو خال خال ہی کسی کا نصیب بنتی ہے۔

موصوف کی تعلیمی قابلیت۔

اور سب سے بڑھ کے کسی ہم وطن کا پرائے دیس سے واپس لوٹنا۔

وہ چپ چاپ سنتی گئی۔ جز بز ہونے کا موقع تب آیا جب ابامیاں نے اس کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ اسے مخواہ مخواہ شرمندگی ہونے لگی۔

بلاوجہ ہی اتنی تعریفیں۔۔۔ کیا ہوا جو ڈبل ایم اے کرلیا۔ آرٹس تو کوئی بھی پڑھ اور پڑھا سکتا ہے اور وہ بھی اتنے سادہ مضامین میں ' اردو اور انگریزی ادب۔

اسے خوامخواہ ہی احساس کمتری نے آگھیرا۔

ان صاحب کو چند ایک کتابیں درکار تھیں' جو فی الوقت ابامیاں کے پاس موجود نہیں تھیں۔ انگریزی ادب سے متعلق وہ کتابیں مہر النسا کے ننھے سے ذخیرے کا حصہ تھیں۔

"جی میں لادیتی ہوں۔" ابامیاں نے اسے اسی کام سے بلایا تھا۔

"میں بھی اب چلوں گا' کافی دیر ہوچکی ہے' امی انتظار کررہی ہوں گی' چچا جان! وہیں سے بکس لیتا ہوا نکل جاؤں گا۔"

وہ ساتھ ساتھ ہی اٹھے اور ساتھ ساتھ ہی باہر نکلے۔

مہر النسا مڑکر ان پر توجہ دیے بغیر سیدھی اپنے پورشن کی سمت بڑھتی چلی گئی اور جب واپس ہوئی تو وہ محویت سے داہنی دیوار کی جانب کیاریوں میں جانے کیا تلاش کررہے تھے۔

اس نے الجھی نظروں سے کتابیں چپ چاپ ان کی طرف بڑھادیں۔

"بہت اچھا مین ٹین کر رکھا ہے آپ نے اپنے پلانٹس کو۔"

مہر النسا کو ان کے بے تکلفانہ تبصرے نے الجھن میں ڈال دیا۔

"وہ اس طرف کی کیاریاں خالی کیوں ہیں؟"

وہ مضطرب سی ہوئی' مگر سامنے جواب کا انتظار تھا۔

"وہاں ابھی بیج ڈالے ہیں' ایک' دو ہفتے میں ان شاء کونپلیں آجائیں گی۔"

"اچھا! کس چیز کے بیج؟"

"کچھ خاص نہیں' موسمی سبزیاں اور بس۔"

"گارڈننگ سے کافی دلچسپی لگتی ہے آپ کو۔"

سب سے پہلے کرنے والی بات سب سے آخر میں کرکے وہ جواب لیے بغیر واپس چلے گئے۔

"پھر ملاقات ہوگی ان شاءاللہ۔"

مہر النسا ان کے جانے کے بعد بھی وہیں کھڑی رہی۔

"اوہیں۔ پھر ملاقات ہوگی۔"

دیواروں پر سرکتی اونگھتی پیلی دھوپ' کسی کے چپکے سے اتر کر مغرب کے سرمگیں آنچل میں جا چھپ چکی تھی۔ وہ جلدی سے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی مغرب ادا کرنے چل دی۔

☼ ☼ ☼

دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ لیپ ٹاپ پر تھرکتی انگلیاں ذرا کی ذرا تھمیں۔

"آپ اب تک جاگ رہی ہیں امی!"

امی کے ہاتھ میں پکڑا دودھ کا گلاس دیکھ کر وہ بے اختیار وال کلاک کی طرف متوجہ ہوا۔

"ظاہر ہے جب تک میری جگہ تمہارے لیے کوئی اور جاگنے والی نہ آجائے۔ یہ کام مجھے ہی کرنا ہے۔"

چہرے کے برعکس ان کی طبیعت اور آواز میں شگفتگی چھلک رہی تھی۔

"اچھا!" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"میں یہ ہی کہنے آئی ہوں' اس عید پر تمہاری شادی کی تاریخ رکھ دوں تو کیسا رہے گا؟"

اس نے امی کا چہرہ دیکھ کر ان کی سنجیدگی کا اندازہ لگانا چاہا۔

"بہت اچھا رہے گا امی!" امی خوش ہوگئیں' وہ چاہتا بھی یہ ہی تھا۔

"پھر بقر عید کے فوراً" بعد کی ڈیٹ لے لوں؟"

اس نے دودھ کا گلاس خالی کرکے میز پر رکھا۔

"ابھی جاکے ڈیٹ لے لیں نا' کیا پتا خالہ جان جاگ رہی ہوں۔"

عمر نے ڈھائی بجاتی گھڑی کو دیکھا۔

"اور رمضان سے پہلے ہی اس اہم فریضے سے نمٹ جائیں تو چھٹی ہوجائے گی۔"

امی چند لمحے منہ کھولے اسے دیکھتی رہیں' پھر اس کی شرارتی شکل دیکھ کر چپت لگاتی باہر چلی گئیں۔

"ناٹی! آر یو ڈیئر!" اسے فوراً" ہی مبارک باد دینے کا خیال ستانے لگا۔

☼ ☼ ☼

رمضان کے بابرکت مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی نفلی عبادات اور قرآن کی تلاوت میں اضافہ ہوا اور باقاعدگی بھی آگئی۔

کالج سے واپسی بھی جلد ہونے لگی۔

وہ رمضان کے پورے مہینے ابامیاں کے لیے افطار میں چند چیزوں کا اہتمام ضرور کیا کرتی تھی۔

کالج سے واپسی پر عصر تک' ظہر کی نماز کے بعد کا

سارا وقت نیند پوری کرتی' پھر عصر کے بعد افطار کی مختصر سی تیاری میں لگ جاتی۔

ابا میاں کی پسند کے پکوڑے اور بنا شکر کی فروٹ چاٹ تیار کرتی' عمر بھی اس کے ہاتھ کے پکوڑے اور چنا چاٹ شوق سے کھاتا تھا۔ اور وہ ان دونوں ہی کی پسند کا بہت خیال رکھتی تھی۔

"ابا میاں نے کہلوایا ہے کہ کوئی مہمان ان کے ساتھ ہیں' افطار میں تھوڑا اہتمام کر دیجیے گا۔ وہ افطار اپنے پڑھائی والے کمرے میں ہی کریں گے' وہیں بھجوا دیجیے گا۔" گھر میں بیگم اور دیگر خواتین کی موجودگی کے باوجود ابا میاں کا رجو کے ہاتھ اسے بھجوایا گیا پیغام ان کے اعتماد کا آئینہ دار نہیں تو اور کیا تھا۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔"

"پتا نہیں کون مہمان ہیں' اور کتنا اہتمام کرنا چاہیے۔"

ابا میاں کے ملنے والوں میں اچھی حیثیت کے لوگ بھی شامل تھے۔

لمبی لمبی گاڑیوں میں' ڈرائیور سمیت' کبھی کاٹن کے کڑکڑاتے شلوار قمیص اور کبھی سوٹڈ بوٹڈ' اعلا عہدوں کو پہنچ جانے والے کسی زمانے کے ابا میاں کے طالب علم' ان کے یونیورسٹی کے احباب' بڑے اداروں کے اعلا عہدے داران۔

زیادہ تر ابا میاں کے لیے کتابوں اور میگزینز کے خاص ایڈیشن' بطور تحفہ لے کر آتے اور کبھی کوئی ترجمے کے لیے بھی حاضر ہو جاتا کہ ابا میاں کو انگریزی اور اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ٹھیک ٹھاک عبور حاصل تھا اور حساب کی مہارت علیحدہ تھی۔ وہ پرانے وقتوں کے پوسٹ گریجویٹ تھے۔ جب حصول علم صحیح معنوں میں شوق مانگتا تھا۔ نہ تو صحافت کے میدان میں ڈگریاں آسانی سے ملتی تھیں' نہ سیاست دانوں کو چند کاغذ کے ٹکڑوں کے عوض' بخشی جاتی تھیں۔

"اب سب لوگ افطار میں یہ پکوڑے' فروٹ چاٹ اور چنے تو نہیں کھاتے ہوں گے۔"

اس نے دھیان کی ڈور کو حالیہ صورت حال سے باندھا اور جھٹ پٹ چوکیدار کو دوڑا کر چکن پیٹز اور گرم گرم جلیبیاں منگوالیں۔ فریز کیے ہوئے کباب بھی تل دیے۔ روایتی اہتمام الگ تھا۔

"ہاں..... اب ذرا بہتر ہے۔" دو منزلہ ٹرالی بھری بھری سی لگنے لگی۔

اس نے رجو کے ہاتھ ٹرالی بھجوا دی اور خود اپنی ڈائننگ ٹیبل پر چیزیں سیٹ کرنے لگی۔

آج ابا میاں اسٹڈی میں تھے تو اسے افطار اپنے پورشن میں اکیلے ہی کرنی تھی۔ اس نے وہاں منتظر عمر کو نظر انداز کر کے سوچا' لیکن شاید وہ ایسا نہ کر سکا۔

"اللہ اکبر!" کی اولین صداؤں کے ساتھ ہی وہ کھجوریں ہاتھ میں تھامے چلا آرہا تھا۔

"میں نے سوچا' آپ اکیلی ہوں گی تو ساتھ دے دوں۔"

اس کا دل سرشار ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

نرم و نازک پنیریاں کچی زمین کی نمی سے پھوٹ نکلی تھیں۔

وہ خوشی خوشی رجو کو دکھانے لگی ٹماٹر' ہری مرچیں' بھنڈی۔

وہی عام سی سبزیاں جو وہ ہر سال گرما کے آغاز پر لگاتی تھی۔ اور ہر بار ایک نئی کونپل نکلنے پر اس کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔

سہیل بھائی نے فون کیا تھا۔

"ہم نے سوچا ہے' اس بار عید' ہم اسلام آباد میں ہی کریں گے۔" اس کے مسکراتے لب سکڑ گئے۔ بھائی بھاوج' بھتیجوں سے ملنے کی آس' پر اوس پڑ گئی۔

"مگر تم اداس مت ہونا' اس بار تم آؤ گی ہمارے پاس۔"

"میں! میں کیسے آسکتی ہوں۔" خوش گوار حیرت نے سر اٹھایا۔

"کیوں نہیں آسکتیں تم' مجھے اس بار چھٹیاں نہیں

مل سکیں' تم لے لو نا' کبھی تم بھی تو آؤ' پھر ہم خوب انجوائے کریں گے' گھومیں گے' پھریں گے۔"

فون اب اس کی بھابھی کے پاس تھا۔

خوشی کی شبنم قطرہ قطرہ دل کو بھگونے لگی' کوئی اور بھی تھا اسے یاد رکھنے والا اور خوشیوں میں شریک کر کے خوش ہونے والا۔

"اچھا۔ ابا میاں سے پوچھ کر بتاؤں گی۔"

اس نے گہری سانس لے کر فون رکھا اور مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

اگلے صحن میں دھوپ نے اپنے پر حدت پر پھیلا رکھے تھے۔

برآمدے میں بچھے تخت پر ناصرہ بیگم سامنے کریلے پھیلائے ایک ایک کریلا چھیل کر زبیدہ انوار اللہ کو پکڑا رہی تھیں۔ رات کے کھانے اور سحری کے لیے کریلے پکائے جانے تھے۔

"میں نے پوچھ لیا ہے عمر سے' اسے کیا اعتراض ہونا ہے بھلا۔"

وہ خوشی خوشی اپنی بہن کو بتا رہی تھیں۔

اکلوتی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے خیال نے ان کے ہاتھوں میں الگ ہی پھرتی بھر دی تھی۔

"میں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ بس عید کے بعد ہی کی کوئی تاریخ رکھ دوں گی۔"

ناصرہ بیگم ان کی طرف جھک کر رازدارانہ ___ کہہ رہی تھیں۔ گو کہ کسی کے سن لینے سے ___ کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر بہن سے راز و نیاز کرنے کی عادت' جن میں غیبت اور دنیا جہان کی برائیاں بھی شامل تھیں' اس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ معمول کی باتیں کرتے وقت بھی انداز ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ اس وقت تو پھر بھی بہت حساس موضوع چل رہا تھا۔

"پر میں ایک بات کہوں آپا' برا مت مانئے گا' ابھی یہ بات بھائی صاحب کے کانوں میں ڈالنے کی ضرورت نہیں' پتا ہے نا آپ کو' ادھر ان کو بتایا' ادھر اس تک پہنچی۔"

انہوں نے ناگواری سے بھنویں اچکا کر پچھلے پورشن کی طرف اشارہ کیا۔

"اے ہاں ہاں۔ سب پتا ہے مجھے' ساری دنیا میں ایک وہ ہی تو لاڈلی' چہیتی ہے ان کی۔"

انہوں نے چھیلا ہوا کریلا زبیدہ بیگم کے ہاتھ میں پٹخ سا دیا۔

"پھر بھی میں نے سوچا احتیاطاً" خبردار کر دوں۔"

جب ہی ناصرہ بیگم کی نظر اس طرف آتی مہو پر پڑی۔

"لو آگئی منحوس' توبہ روزہ خراب کرائے گی۔"

انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ منحوس کہنے سے روزہ خراب ہو جائے گا۔

"السلام علیکم!" اس نے نزدیک آکر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! خیریت۔ تم آج دن میں ادھر۔"

"جی! میں عمر کا پوچھنے آئی تھی۔"

"وہ تو گھر پر نہیں ہے۔"

زبیدہ بہکے بول پڑیں۔ حالانکہ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہی تھا۔ مگر.....

"اب فوراً" واپس نہ چل دینا' ہم بھی کچھ لگتے ہیں تمہارے۔"

اس سے بات کرتے ہوئے خاص طور پر اکیلے میں دونوں کا انداز ہی اور ہو تا تھا۔ اس لیے مہر النسا ہمیشہ ہی ان کا سامنا کرنے سے گھبراتی تھی۔

وہ اپنی چچی اور تائی کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ پل میں تولہ' پل میں ماشہ فطرتوں کی حامل۔ ایک جملے سے کئی کئی مطلب نکالنے اور کئی کئی معنی لپیٹ کر ایک ہی جملے میں حساب چکتا کر دینے کی ماہر۔

اس وقت بھی وہ بادل نخواستہ رکی تھی۔

"کل بڑی خاطر کی تم نے معید میاں کی۔"

ناصرہ بڑی محویت سے کریلے چھیلنے میں مگن تھیں' جیسے اس سے زیادہ ضروری کوئی کام نہ تھا۔ مگر یہ بھی ان ہی کا انداز تھا۔ جتنی گہری کھوج' اتنا سرسری

لہجہ۔

"جی! کون' معید میاں؟" اس کے حافظے میں دور' دور تک یہ نام و نشان نہ تھا۔

"اے لو! وہ ہی تمہارے ابا میاں کے دوست کے صاحبزادے' وہ تو آتے جاتے رہتے ہیں تمہارے پاس۔"

"جی۔۔۔" وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"نہیں' نہیں۔ وہ تو ایک ہی بار آئے تھے۔ مجھے تو ان کا نام تک نہیں پتا۔" اس نے بلاوجہ صفائی پیش کی۔

"اچھا! لیکن میں نے تو خود دیکھا ہے انہیں' پچھلے دالان سے نکلتے اس دن۔"

"جی جی۔ وہ تو ایک ہی بار' ابا میاں نے خود بھیجا تھا' کچھ کتابیں چاہیے تھیں انہیں۔" اس کا گھگھیایا ہوا انداز ہنوز تھا۔

"لو! ایک تو یہ تمہارے ابا میاں بھی بڑے بھولے ہیں' پتا ہی ہے زمانہ کس طرف جا رہا ہے' لے کے بھیج دیا ایک جوان جہان مرد کو اکیلی لڑکی کے پاس۔"

ناصرہ بیگم نے گویا اس کے دل پر تیر دے مارا۔

"انہوں نے میرے پاس نہیں بھیجا تھا' وہ تو میرے ساتھ ہی۔۔۔ بس یہیں برآمدے سے پلٹ گئے تھے وہ۔" اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ اتر آئی۔

یہ لوگ کس قدر معمولی واقعے کو کس طرف لے جا رہی تھیں۔ اس کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔

ناصرہ بیگم کو اس پر رحم آیا تھا یا چولہے پر چڑھا ہوا کچھ یاد آ گیا۔ وہ کریلوں کی ٹوکری اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔

مہر النسا سر جھکائے یوں بیٹھی تھی گویا موقع ملتے ہی بھاگ نکلے گی۔

"ویسے کافی معقول آدمی ہے وہ۔" زبیدہ بیگم کا لہجہ اور انداز حیرت انگیز طور پر بدل گئے۔

"جی۔" اس نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بظاہر تو کوئی برائی نظر نہیں آتی' میری مانو تو کسی طرح معاملہ سیٹ کر لو۔"

اس کا منہ کھل گیا۔

اپنے گھر کی لڑکی کو کوئی ماں کے برابر درجہ رکھنے والی عورت ایسا مشورہ بھی دے سکتی ہے۔

"اب دیکھو نا' تمہاری صحیح رشتوں اور شادی کی عمر تو یوں ہی باسط کے آسرے میں گزار دی بھائی صاحب نے' اب تم کب تک دوسروں کے منہ دیکھو گی' کسی کو کوئی خیال ہے تمہارا۔"

وہ بظاہر بڑی ہمدردی سے جھک کر اس سے رازداری سے بولیں۔

"آج بھی باسط میاں کا فون آیا تھا۔ آنے کا کوئی ارادہ نہیں دور دور تک۔ خاک ڈالو اس پر' تم تو اپنا گھر بساؤ ہنسی خوشی۔"

وہ یوں بولیں گویا معید نکاح نامہ ہاتھ میں لیے اس کے منتظر ہوں۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"کریلے پک رہے ہیں' رات کو کھانا مت پکانا' میں بھجوا دوں گی۔"

انہوں نے اپنا پن جتا کر کہا اور وہ کمان سے نکلے تیر کی مانند وہاں سے اڑتی ہوئی واپس گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ افسوس سے اس کا بھیگا سرخ چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ اسے بتانا نہیں چاہتی تھی' مگر اس کے اصرار کے آگے ہار ماننا پڑی۔

"یقین نہیں آتا کہ خالہ جان اس طرح کی بات بھی کر سکتی ہیں۔ وہ بھی یہ جانتے ہوئے کہ آپ باسط بھائی کی امانت ہیں۔"

"پلیز عمر! تم کیوں مجھے بار بار یہ رشتہ یاد دلاتے ہو' میں بھول جانا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟" عمر کی حیرت بجا تھی۔

"کوئی عقل کا اندھا ہی ہو گا جو باسط کا گریز نہ سمجھ سکے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھے کبھی نہیں اپنائیں گے۔"

عمر منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔

"جب آپ کو یقین ہے تو آپ نے شادی کیوں نہیں کر لی؟"

وہ چپ چاپ آنکھوں میں آئی نمی رگڑنے لگی' کیا کہتی' کوئی رشتہ تبھی تو ہو۔

یہ حقیقت تھی کہ سالہا سال باسط سے منسوب رہنے کے بعد دل میں جیون ساتھی کا اگر کوئی خاکہ تھا تو وہ صرف باسط کا ہی تھا' لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اس لاحاصل انتظار سے تھکنے لگی تھی۔

پورے خاندان میں ایک طویل عرصے تک اسے باسط کی ہونے والی بیوی کے حوالے سے متعارف کروایا جاتا رہا' کوئی اب بھی تردید کو تیار نہ تھا' تو بھلا اس کے مستقبل کو زیر بحث لاتے بھی کیسے۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ ابا میاں کو کیسے سمجھاتی' جو کھلی آنکھوں سے نہ صرف خود کو بلکہ اسے بھی فریب دینے پر تلے تھے۔

اس بات سے بے خبر کہ بچپن میں ان سے ٹافیاں لے کر کھانے والی بھتیجی اب ٹافیاں تو کیا فریب کھانے کی عمر کو بھی پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

دل دکھا ہوا تھا' سو افطار اکیلے ہی کر لی' یوں بھی دونوں خواتین کو اتنی جلد دوبارہ دیکھنے کی ہمت اس میں تھی ہی نہیں۔

خاموشی اور ان گنت سوچوں کے جال میں الجھے دھیان کے دھاگے سلجھاتے ہوئے نماز سے فارغ ہو کر جب وہ چائے بنانے کچن میں گئی تو عمر کو پھر سامنے پایا۔

"آؤ عمر! خیریت تم اس وقت کیسے؟"

یہ وقت اس کی اور نتاشا کی مشترکہ مصروفیت کا ہوتا تھا۔

"بس آپ کی تنہائی کا خیال اور چائے پینے کا دل۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ مسکرا کر کیتلی میں پانی ڈالنے لگی۔

"مہرو!" وہ چند لمحے گہری نظروں سے اس کی پشت دیکھتا رہا' پھر اچانک کچن کے اندر آ گیا۔

"ایک بات کہوں آپ سے۔"

وہ حیران سی ہو گئی۔ اس کی آواز' تیور' انداز' لہجہ سب کچھ ایک معنی خیزی میں لپٹا ہوا تھا۔

"آپ کب تک یوں تنہا زندگی گزاریں گی؟"

"جب تک قسمت میں لکھا ہے۔" وہ دانستہ رخ موڑ کر سنک میں پڑی پلیٹ دھونے لگی۔

"تو قسمت کو بدل لیں نا۔"

"قسمتیں بدلنا انسان کے اختیار میں ہوتا تو۔۔۔"

وہ گہری سانس لے کر کپ نکالنے لگی۔

عمر اس کے شفاف ہاتھوں کو دیکھے گیا۔

"اور پھر قسمت بدلنے کے لیے کسی کا ساتھ بھی تو ہو' میری ساتھی تو یہ ہی تنہائی ہے۔"

چھلنی سے گزر کر مرحلہ وار شفاف ہوتی سرخ چائے کو دیکھتے ہوئے جانے کیوں اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

عمر کو لگا اس کے ہموار لہجے میں کہیں نہ کہیں حسرت و تشنگی کی گہری کھائیاں ہیں۔ وہ یک دم کسی کمزور لمحے کی گرفت میں جکڑا گیا۔

"اور اگر میں بانٹ لوں آپ کی تنہائی تو۔۔۔"

وہ تو اکثر ہی اس کی تنہائی بانٹنے آتا تھا' پھر اب۔۔۔

اس کے لبوں سے نکلے زہریلے تیر سنسناتے ہوئے سماعتوں میں پیوست ہو گئے۔

چائے چھلک کر مہر النسا کا ہاتھ جلا گئی۔

"سی۔۔۔ ی۔۔۔ ی۔"

اس کے اندر تاب نہ بچی کہ پلٹ کر اسے دیکھ سکے' مگر وہ تو آج جانے کیا سوچ کر آیا تھا۔

بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نرمی سے سہلانے لگا' دل کا کوئی نہاں گوشہ سکون پا رہا تھا۔

"ہاں مہرو' اگر آپ چاہیں تو۔۔۔"

اگلے ہی لمحے مہر النسا کا ہاتھ اس کی گرفت سے نکل کر پوری قوت سے اس کے چہرے پر پڑا تھا۔

"مہرو۔" اس کا گال دہک اٹھا۔ چند لمحوں میں سرخی ثبت ہو گئی۔

"ہوش میں ہو تم' کیا چاہتے ہو؟"

وہ بنا کچھ کہے اس کا اشتعال انگیز انداز دیکھتا رہا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" داغ لگانا چاہتے ہو' میرے

کردار پر؟ برسوں سے سنبھال کر رکھی گئی عزت پر؟ اپنے اور میرے رشتے پر' ابامیاں کے اعتبار پر؟"

وہ بے قابو ہو کر پھٹ پڑی۔

"چلے جاؤ یہاں سے اور آج کے بعد کبھی شکل مت دکھانا۔"

"میری بات تو....."

"جاؤ۔" وہ آواز دبا کر اتنی قطعیت سے چیخی کہ عمر کو لگا اگر وہ وہاں سے ہٹا نہیں تو اگلے ہی لمحے وہ اسے دھکے دینا شروع کر دے گی۔

وہ تیزی سے وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

وہ قطرہ قطرہ سلیب سے نیچے ٹپکتی چائے کو دیکھنے لگی۔ وہ بے بسی اور دکھ کے شدید احساس تلے وہیں بکھرتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! اللہ ہر حال میں' ہر مشکل کی گھڑی میں' مایوسی کے اندھیروں میں روشنی کی کوئی ایک کرن آنے کا کوئی ایک راستہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔"

وہ افطار کے بعد ابامیاں کے کمرے میں بیٹھی تھی۔

آج کافی دنوں بعد بریانی پکائی تھی تو ابامیاں کے لیے لے کر آئی تھی۔ عمر تو اب اس فہرست سے خود بخود ہی خارج ہو چکا تھا۔ اس دن کی جرات کے بعد سے ان دونوں کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

باقی لوگ اس کے وجود کو ہی درخور اعتناء — نہیں جانتے تھے تو ان معمولی چیزوں کی کیا اوقات۔

"رمضان میں تو افطاری سے ہی پیٹ بھر جاتا ہے۔"

گھر کی تینوں خواتین نے خوشبودار بھاپ اڑاتے چاولوں کی ڈش ایک جانب سرکا دی تھی اور وہ بھی برا مانے بنا ابامیاں کے پاس چلی آئی تھی۔

"جس طرح مایوسی کفر ہے' اسی طرح خدا تعالیٰ سے نیک امید رکھنا بھی ایمان کا ہی ایک حصہ ہے۔"

وہ خاموشی سے سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آج اس خاص گفتگو کا مقصد کیا ہے۔

یوں تو ابامیاں اکثر ہی ایمان افروز باتیں کرتے تھے مگر آج جس طرح خاص طور پر مایوسی سے بچنے اور اچھی امیدیں رکھنے کا ذکر ہو رہا تھا' وہ قابل غور ہی تھا۔

"دیکھو ذرا باتوں باتوں میں جماعت کا وقت ہو گیا اور پتا ہی نہیں چلا۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔

"خدا کو یاد کرنے کے لیے کسی خاص ماحول' جگہ یا وقت کی ضرورت نہیں ہوتی' اللہ تو دلوں میں رہتا ہے' کامل ایمان کے ساتھ خدا کی وحدانیت کے اقرار اور اس کی رحمتوں کے نور سے روشن دل' اللہ کا گھر ہوتا ہے اور اس سے خوف کھانے کے لیے' چلتی سانسوں کا محض ایک چھینک سے بند ہو جانا ہی کافی ہے' چاہے لمحہ بھر کو ہی سہی۔"

وہ گفتگو کو اختتام کی سمت موڑتے ہوئے رکے۔

"سہیل نہیں آیا اب تک' فون تو آیا ہو گا اس کا۔ کب تک آئے گا؟ عید تو نزدیک آچکی ہے۔"

اس نے بھائی کے ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو انہیں سنا دی۔

"اور سب دنیاوی — جھنجٹوں سے نجات پا کر' خواب غفلت میں کھونے سے پہلے' چند لمحوں کے لیے اللہ رب ذوالجلال سے راز و نیاز کر لیے جائیں' تو جو سکون اور خوشی اس میں ہے' وہ تو دونوں جہان لٹا کر بھی نہیں مل سکتی۔"

وہ سوچتی ہوئی سر جھکائے وہاں سے نکل کر سیدھی اپنے پورشن کی سمت آئی تھی' جب برآمدے کا موڑ مڑتے ہی سرے پر معید کھڑے دکھائی دیے۔

"آپ یہاں؟"

وہ یوں سراسیمہ ہوئی جیسے بھوت دیکھا ہو' سلام سے بھی گئی۔

"جی! میں آیا تو اکرام چچا سے ملنے کے لیے تھا' لیکن یہ آپ کے لیے لایا تھا تو سوچا پہلے دے دوں۔"

انہوں نے ذرا پرے ہو کر زمین کی طرف دیکھا۔

بے حد خوب صورت پیلے' زرد اور نارنجی رنگوں کے امتزاج سے سجا پھول کا ننھا سا پودا گملے میں مسکرا

رہا تھا۔

"بہت قیمتی پودا ہے' کراچی میں شاید ہی کہیں ملے' میں نے خود لاہور سے منگوا کر اپنے لان میں لگوایا تھا۔"

وہ شوق سے بتاتے چلے گئے۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"اتنا قیمتی تھا تو میرے لیے لانے کی کیا تک تھی بھلا۔"

پوچھنے کی ہمت کس کی تھی' بس وہ وہیں سے واپس پلٹ کر سرے پر گم ہو گئے۔ وہ غائب دماغی سے گملا اٹھا کر لائی اور سیڑھیوں کے پاس کونے میں یوں ہی ڈال دیا۔

اور تو کچھ خاص نہیں' بس یہ ہوا کہ رات کے اس پہر وہ اپنے رب کے ذکر میں جس سکون کی متلاشی تھی' وہ ندارد تھا۔

توجہ کا ارتکاز بار بار بھٹک کر کسی غیر متعلقہ شخص کی طرف جاتا رہا۔

☼ ☼ ☼

اس بار رمضان ٹھیک ٹھاک گرمی میں آئے تھے۔ دوپہر کے وقت جب سر پہ تپتے سورج کا پہرہ ہوتا تو حلق میں پیاس سے کانٹے اگ آتے۔ سوکھے لبوں پر بار بار زبان پھیر کر خشک کرنے کی کوششیں بے سود ہو جاتیں۔

اسے کالج سے نکلنے میں خاصی دیر ہو چکی تھی۔

مین گیٹ کے باہر چھٹی کے ٹائم کی مخصوص افراتفری اور رش ختم ہو چکا تھا۔ جب ہی دور گاڑی میں بیٹھا عمر ایک نظر میں دکھائی دے گیا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

وہ تیز قدموں سے چلتی اس تک پہنچی تھی' یہ ہی بہتر تھا' ورنہ اس سے بعید نہ تھا کہ گاڑی لے کر پیچھے آجاتا۔

"آپ کو لینے آیا ہوں' سوچا گرمی میں کہاں خوار ہوں گی۔"

وہ چند لمحے غصے اور سنجیدگی سے اسے دیکھتی رہی' جس کے چہرے پر چند دن پہلے والی بدتمیزی کا کوئی رنگ نہ تھا۔

گاڑی میں اس کے بیٹھنے کے بعد بھی حرکت نہ ہوئی تھی۔

وہ جانتی تھی' وہ آج اس سے ملنے کیوں آیا ہے ورنہ گرمی تو ہر روز' بڑھ کر ہو رہی تھی۔

"مہو! آئی ایم سوری۔"

اس کے لہجے میں سچائی کی مہک اور ندامت کا دکھ تھا۔

اس نے شیشے میں ایک شکوہ کناں نظر اس پر ڈالی۔

"اگر آپ کی عزت اور ابامیاں کے اعتبار کا پاس نہ ہوتا تو میں کبھی اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹتا۔"

مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے اس نے مہر النسا کے چہرے پر حیرت امڈتے دیکھی۔

"اس لیے بتا رہا ہوں کہ کہیں آپ مجھے کردار کا کچا نہ سمجھ لیں۔ میں اگر وعدہ کر لوں تو اسے نبھانا اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"خدا کے لیے چپ ہو جاؤ عمر! اگر مزید کچھ کہا تو میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر جاؤ گے۔" اس کے دل میں اذیت کی لہریں اٹھنے لگیں۔

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔

"مجھے ہمیشہ ہر حال میں آپ کی فکر اور پروا رہے گی' اسی لیے چپ ہوتا ہوں کہ آپ کو میری بات ناگوار گزر رہی ہے۔"

"اگر آئندہ تم نے ایسی کوئی بات کی تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

رندھے گلے سے بولتی ہوئی وہ سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔

گاڑی یقیناً" نتاشا کے کالج کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی آٹھہری۔

وہ مہر النسا کو لینے آیا تھا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اسے لیے بغیر چلا جاتا۔ نتاشا جو اس کی منگیتر تھی' ان دونوں کے درمیان جنم لینے والے اس نئے اور خوب صورت

رشتے کے علاوہ بھی اخلاقی تقاضے یہ ہی کہتے تھے کہ جب وہ اسے پک کرنے آگیا ہے تو لازما" دوسرے فرد کو بھی لیتا جائے گا۔

"اتنی دیر عمر! پینتالیس منٹ ہو گئے مجھے یہاں دھوپ میں جلتے ہوئے۔"

مگر دوسرا فرد یقیناً" کوئی بھی اخلاقی فریضہ نبھانے کے موڈ میں نہ تھا۔

مہر النساء کو دیکھ کر جہاں نتاشا کی چلتی زبان کو بریک لگا وہیں تیوری پر بل بھی نمایاں ہو گئے۔

وہ سرخ چہرہ گڑتی ہوئی خود میں چور بن گئی۔

نتاشا سارا وقت منہ بنا کر بیٹھی رہی اور گاڑی رکتے ہی تیر کی طرح اندر کی طرف بڑھ گئی۔

مہر النسا کے وجود میں تھکن اتر آئی۔

باسط سے نسبت کے ناکردہ جرم میں' اگر تائی امی باسط کی ماں ہونے کے ناتے اس سے خفا رہتی بھی تھیں تو وہ ہرگز برا نہ مانتی۔ مگر..... یہ چھوٹی سی لڑکی ... اسے اس قدر ناگواری جتانے کا حق کس نے دیا تھا بھلا۔

یقیناً" گھر کے بااثر بزرگوں نے۔

اس نے اسلام آباد روانگی کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ بھائی' بھابھی اور بچوں کے لیے تحائف لینے کے لیے بازار جانا تھا۔ مگر عمر سے ہونے والی بات کے بعد یہ پروگرام از خود ختم ہوتا لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

عمر آچکا تھا' اس نے ابا میاں سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تھا' انہوں نے ہی اسے بھیجا تھا۔

دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے' مگر وہ واقعی اپنی بات کا پکا تھا' ابا میاں کو پوری شاپنگ اطمینان سے کروانے کا کہہ کر آیا تھا سو' اسے ساتھ لے کر بازار میں جگہ جگہ اس کی پسند کی چیزوں کے لیے پھرتا رہا' اس کے انداز میں' اس دن کی لغزش اور صبح والی باتوں کا شائبہ تک نہ تھا۔

عید کا مہینہ اور بازاروں کا رش الامان۔

تین گھنٹے تو گویا چٹکی بجاتے گزر گئے۔ وہ بے حد تھکن سے چور اپنے پورشن کی سمت جا رہی تھی' تب عمر نے اسے یہ تکلیف دہ خبر سنائی تھی۔

"ابا میاں کے پاس جو معید بھائی آتے رہتے ہیں نا! انہوں نے آپ کا پروپوزل دیا ہے' ابا میاں نے کہا تھا' آپ کو بتا دوں' شاید وہ اس پروپوزل پر غور کر رہے ہیں۔"

وہ حیرت کے مارے اگلی بات بھول گئی۔

"سوری' اگر میں جانے سے پہلے بتا دیتا تو شاید آپ کی شاپنگ رہ جاتی۔"

وہ شاپرز کمرے میں رکھ کے پلٹ گیا۔

مہر النساء فورا" اسٹڈی کی طرف آئی' اسے یقین تھا' وہ جاگ رہے ہوں گے اور آج تو خاص طور پر اسٹڈی میں ہی اس کے منتظر ہوں گے۔

ایک ایک کر کے اٹھتے قدموں کے ساتھ دل و دماغ میں اٹھتی غصے کی لہریں بھی بتدریج بڑھتی گئیں۔

"میں کسی ایسے شخص سے تعلق قائم کرنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتی ہوں' جس سے ایک بار بات کرنے کے جرم میں میرا کردار مشکوک ہو گیا تھا۔ ان سے تعلق جوڑنے کا مطلب ہے اپنی طرف اٹھتی نگاہوں کو زبان دے دوں۔"

برآمدے میں کھلنے والی ابا میاں کے کمرے کی کھڑکی جو گرمیوں میں اے سی کی ٹھنڈک محفوظ کرنے کے لیے زیادہ تر وقت بند رہتی تھی۔ آج اتفاقا" کھلی تھی یا شاید کھولی گئی تھی' لوڈشیڈنگ کی مہربانی سے۔

فی الوقت تو وہ صرف وہاں اپنا نام سن کر ٹھہری تھی۔

"مہر النسا سے بھی جان چھوٹ جائے گی' ہائے زبیدہ! کتنے سالوں بعد میرے دل کی مراد پوری ہونے جا رہی ہے' میں بتا نہیں سکتی' میں کتنی خوش ہوں۔"

تائی امی کی بھیگی بھیگی آواز میں رچی خوشی کی وجہ معید کا رشتہ نہیں ہو سکتا تھا' یہ تو کسی اور ہی خوشی کے آنسو تھے۔

"تین سال بعد بیٹے کی شکل دیکھوں گی' اللہ نے

میری دعائیں سن لیں۔ ورنہ مجھے تو لگتا تھا رو' رو کر میری آنکھیں بینائی کھو دیں گی۔"

آج تو وہ خوشی کے مارے آواز میں آتی تیزی بھی فراموش کر گئی تھیں۔ فضا میں چھائے سناٹے کے باعث ان کی آواز واضح طور پر سنی جا رہی تھی۔

"لیکن وہ مان کیسے گیا' ابھی ہفتہ بھر پہلے تک تو..."

چچی جان کی آواز میں خوشی کی بہ نسبت حیرت کا عنصر زیادہ تھا۔

"ارے بس مت پوچھو' بڑی مشکل سے معید کے رشتے کی بابت بتا کر راضی کیا ہے' میں نے تو آؤ دیکھا' نہ تاؤ' فوراً" سے پہلے تمہارے بھائی صاحب سے کہہ ڈالا' اب اگر اللہ راستہ دکھا رہا ہے تو چلتا کرو اسے۔ باسط سے بھی یہ ہی کہا کہ اس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ عمر کے ساتھ ہی ان شاء اللہ بقر عید میں شادی ہوگی' تب ہی شکل دکھانے پر راضی ہوا۔"

مہر النسا کے دل و دماغ پر قیامت گزر گئی۔ اسے لگا وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔

وہ مرے مرے قدموں سے وہیں سے واپسی کے لیے مڑ گئی۔ اور کمرے میں آکر عمر کو میسج کیا۔

"ابا میاں کو کہہ دیجیے' مجھے ان کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔"

٭ ٭ ٭

معید دوسرے ہی دن خاندان کے ایک بزرگ کے ساتھ آکر رسمی کارروائی پوری کر گئے تھے۔

ابا میاں جو کئی سالوں سے باسط کے انتظار میں تھے' اس بار رسمی سا سوچنے کا وقت بھی نہ مانگ سکے۔

ناصرہ بیگم نے واشگاف انداز میں انہیں جتا دیا تھا کہ باسط کو انہوں نے اسی ضمانت پر واپسی کے لیے رضامند کیا ہے کہ وہ مہر النسا کو بقر عید تک ہر حال میں رخصت کر دیں گی۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔

معید اور مہر النسا کے درمیان کوئی رابطہ نہ تھا۔ مہر النسا نے خود ہی نہ چاہا' ہرچند کہ سالوں پہلے اگر باسط سے کوئی جذباتی یا دلی لگاؤ تھا بھی تو اب ختم ہو چکا تھا' بلکہ اس کی جگہ ایک شرمندگی بھری ندامت نے لے لی تھی۔

وہ قصوروار نہ تھی' پھر بھی معتوب ٹھہرائی گئی۔

اس نے پائپ لگا کر نل کھولا اور پانی کی دھار اگلتے پائپ کا منہ کیاری کی جانب کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ روزمرہ کے معمولات کا سب سے پسندیدہ کام آج نرا بوجھ لگ رہا تھا۔ ایک بوجھل سے انداز میں انجام دیا جا رہا تھا۔

پورے پورشن میں جگہ جگہ جالے لگ گئے تھے۔ گھر تفصیلی صفائی مانگ رہا تھا۔ کچن الگ اس کی توجہ کا متقاضی تھا اور اس کا دل تھا کہ بار بار اچاٹ جاتا۔

اس نے بے دلی سے بوچھاڑ ڈال کر پائپ کیاری میں ہی چھوڑ دیا اور نہایت دھیمے قدموں سے اندر بڑھ گئی۔

سیڑھیوں کے پاس گملے میں رکھا کسی کا زرد و نارنجی تحفہ بھی کملایا ہوا لگ رہا تھا۔ مگر اس کو تو اس نے پہلے بھی کبھی توجہ کے قابل نہ سمجھا تھا۔

"قیمتی پودا! یہاں قیمتی بلکہ انمول انسانوں کی کوئی قدر نہیں' تو پودوں کو کون پوچھے۔"

پچھلے چار روز سے اس نے عمر کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے لگتا اب وہ پہلے جیسی دوستی اور بے تکلفی والی بات نہیں رہی۔ عمر کی چند لمحوں کی جذباتی لغزش نے اسے محتاط بھی کر دیا تھا اور دکھی بھی۔

وہ یقیناً" نتاشا کو شاپنگ کروانے میں مصروف تھا۔ اس کی شادی کی تاریخ بھی تو ساتھ ساتھ رکھی جانی تھی' جہاں دل ملتے ہوں وہاں ایسے ہی خوشیاں کھلتی ہیں۔

یہاں تو یہ عالم تھا کہ طاق راتیں مرحوم والدین کی یاد میں آنسو بہاتے اور انہیں بخشتے گزر گئیں۔

سہیل کا اسلام آباد سے فون آیا اور اس نے رشتے کے بارے میں معلومات لے کر اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ بڑے بھائی' بہنوں کے ہونے والے رشتوں کے متعلق چھان بین کرتے ہیں' ان کی شخصیت پرکھتے اور نوکری' تنخواہ کی معلومات کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر کردار دیکھتے ہیں' مگر وہاں کمال اطمینان تھا' شاید ابا میاں اور عمر پر اندھا اعتماد بھی۔

"تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے مہو' مجھے باسط سے اس درجہ ڈھٹائی کی امید نہ تھی۔ اور کیا' جب اسے پروا نہیں تو تم کیوں اپنی زندگی برباد کرو۔"

اس نے اسلام آباد آنے سے منع کر دیا تھا' انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔

"ٹھیک ہے پھر ہم ایک' دو دن کے لیے پنڈی چلے جائیں گے۔" پنڈی میں ان کا سسرال تھا۔

ان کا لیکچر دیر تک چلا وہ' جامد کیفیت کے ساتھ سنتی رہی۔

٭ ٭ ٭

انتیسویں کا خم کھایا' باریک چاند اس کی پلکوں پر ستارے ٹانکنے لگا۔

"چاند رات کو بھی کوئی ایسے تنہا ہوتا ہے میری طرح۔"

وہ مایوس کن سوچوں میں گھری دیر تک اپنے رب سے دل کا سکون مانگتی رہی۔

"باجی... ی... ی۔" رجو دور سے آوازیں دیتی بھاگی چلی آ رہی تھی۔

"وہ جی! باسط بھائی آ گئے ہیں باہر ملک سے بالکل اچانک' بڑے صاحب بلاتے ہیں۔"

وہ جتنی تیزی سے آئی تھی' اس کی سماعتیں مفلوج کرتی اتنی ہی تیزی سے واپس چلی گئی۔

مہر النسا سوچوں اور کشمکش و پیچ میں گھری وہیں کھڑی رہ گئی۔

"مجھے جانا چاہیے یا نہیں' فوراً" جانا چاہیے یا ٹھہر کر یا پھر کل' آج ابھی بھلا کون منتظر ہوگا میرا وہاں' ابا میاں بھی نہیں' عمر تو بھائی کی آمد کی خوشی میں مجھے بھول چکا ہوگا۔ اور مجھے اس کے انتظار سے کیا لینا ہے اور باقی رہیں خواتین تو شاید انہیں میرا وہاں جانا پسند نہ آئے۔"

سوچتے سوچتے دل کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ لاؤنج کے دروازے تک تو پہنچ ہی گئی۔

لیکن اندر باسط اکیلے نہیں تھے' ان کی فیملی تھی' بیوی' بیٹا' مکمل خاندان خوشیوں بھرا۔

فقط ایک جھلک ہی اندازہ لگانے کے لیے کافی تھی کہ وہاں اس کے علاوہ کوئی بھی انہیں دیکھ کر حیران نہیں تھا۔ یہ ہی آگہی اس کے لیے واپسی کا زادِ راہ بن گئی۔

اسٹڈی سے معید نکل کر مین گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔

"ارے آپ!" اسے دیکھ کر خوشی سے بولے۔

"میں چچا جان کو عید کی مبارک باد دینے آیا تھا' مگر وہ مصروف ہیں... آ... اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

اس کی طرف سے وضاحت کا تقاضا تو نہیں تھا' مگر وہ بن کہے پورا کر رہے تھے۔

انہیں محسوس ہوا کہ آج انہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آئی تھی۔

"عید مبارک۔"

اس نے ایک لمحہ رک کر سنجیدگی سے پلکیں جھکا لیں اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

معید وہیں کھڑے اس وقت تک اسے دیکھتے رہے جب تک وہ نظر آتی رہی۔

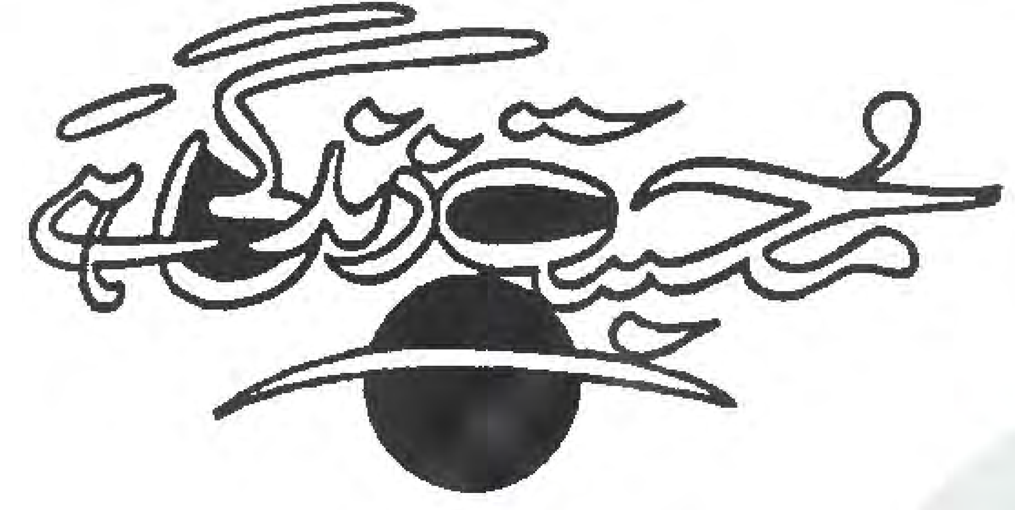
٭ ٭ ٭

عید کی صبح سب سے پہلے عمر ہی عید مبارک کہنے آیا تھا۔ مہر النسا تلاوت میں مصروف تھی۔

وہ سورج کی روشنی پھیلنے تک بیٹھا رہا' مگر وہ آج جانے خدا سے جانے کون سے راز و نیاز میں مشغول تھی۔ اس کی طرف ایک نظر تک نہ کی۔ وہ کچھ اداس سا باہر نکلا تو دیکھا۔

کچی مٹی کے گیلے پن سے سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ پنیریاں اجڑ گئی تھیں۔ مگر زمین کی زرخیزی سے بہت خوب صورت زرد و نارنجی پھول مسکراتے ہوئے پنپ رہے تھے۔

نسرین خالد



کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کاش! میرے پاس جادو کا برش آجائے اور میں جو پینٹ کروں' وہ سب حقیقت ہوجائے... یا پھر ایسا قلم مل جائے جس سے جو بھی لکھوں حقیقت بن جائے...

کیسی عجیب و غریب باتیں سوچتی ہوں نا میں؟

بھلا ایسا بھی کبھی ہوتا ہے...؟ جو قسمت میں نہ ہو' وہ کیسے مل سکتا ہے۔ تقدیر پر تو کسی کا بس نہیں چلتا مگر...

شایان واسطی تو کہتا ہے کہ وہ اپنی قسمت خود بنائے گا اور واقعی... وہ جو چاہ رہا ہے' وہی ہو رہا ہے۔ وہ مجھے ٹھکرا کر عبیرہ احمد سے شادی کر رہا ہے۔

سدرہ کہتی ہے کہ وہ عبیرہ سے شادی صرف احمد حنان کی دولت کی وجہ سے کر رہا ہے کیونکہ وہ احمد حنان کی اکلوتی بیٹی ہے۔

میں... میں عبیرہ احمد سے زیادہ خوب صورت ہوں مگر... میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں احمد حنان کی بیٹی نہیں ہوں۔

شایان واسطی کہتا ہے۔ "تمکین زیدی! مجھے بولڈ' حالات کے مطابق چلنے والی' حقیقت کو فیس کرنے والی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں اور تم نہ تو بولڈ ہو اور نہ ہی تم کو زمانے کے ساتھ چلنے کا فن آتا ہے۔"

وہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔ عبیرہ احمد میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔

اور میں... مجھ میں کہاں اتنا حوصلہ ہے کہ حقیقت کو' لوگوں کو فیس کرسکوں۔ یا اپنا حق لے سکوں...

جب شایان واسطی نے مجھ سے منگنی ختم کی تھی' مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس سے یہ پوچھ سکوں کہ کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا... میرا قصور کیا ہے...؟

وہ میرے سامنے منگنی کی انگوٹھی رکھ کر جا رہا تھا اور میں خاموشی سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پوچھتی۔

"شایان واسطی! آج سے چھ مہینے پہلے تم نے میرا جینا دوبھر کردیا تھا کہ مجھ سے شادی کرلو' میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا اور اب... اب مجھے مار کر جا رہے ہو...؟"

وہ چلا گیا اور میں اسے روک بھی نہیں سکی تھی۔ سدرہ مجھ سے خوب لڑی تھی کہ تم نے اسے روکا کیوں نہیں۔ میں اسے کیسے روکتی' بھلا عبیرہ احمد کے سامنے تمکین زیدی کی کیا حیثیت ہے۔

ورکنگ وومن ہاسٹل میں رہنے والی تمکین زیدی جس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ وہ احمد حنان کی بیٹی کے سامنے کچھ بھی تو نہیں ہے۔

میں نے اپنے سامنے پڑے کارڈ کو تیسری بار دیکھا۔ کل شایان واسطی اور عبیرہ احمد کی شادی ہے۔

عبیرہ احمد نے بطور خاص مجھے کارڈ بھیجا ہے۔

سدرہ نے مجھ سے کہا ہے کہ جب اس نے مجھے بلایا ہے تو مجھے جا کر ان دونوں کو حیران کردینا چاہیے مگر مجھ میں کہاں اتنا حوصلہ ہے کہ ان دونوں کا سامنا کرسکوں۔

سدرہ کہتی ہے۔ "تمکین زیدی! بہادر بنو' نہیں تو دنیا تمہیں بیچ کھائے گی دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھو' تم تنہا ہو' تمہارے پاس ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے' جو تپتی دھوپ میں سائبان بن جائے۔ تمہیں جو کرنا ہے خود کرنا ہے۔ اپنے حق کے لیے لڑنا سیکھو۔"

"تم ہو نا میرے حق کے لیے لڑنے والی۔" میں نے اسے بس اتنا ہی کہا۔

"نہیں... میں کب تک تمہارے لیے لڑ سکتی ہوں؟ جب تک تم خود اپنا حق لینے میں انٹرسٹڈ نہیں ہو۔ تم... تم کل ضرور جاؤ گی۔ شایان کی شادی میں جانا اور اپنی محبت پر فاتحہ پڑھ کر آنا۔"

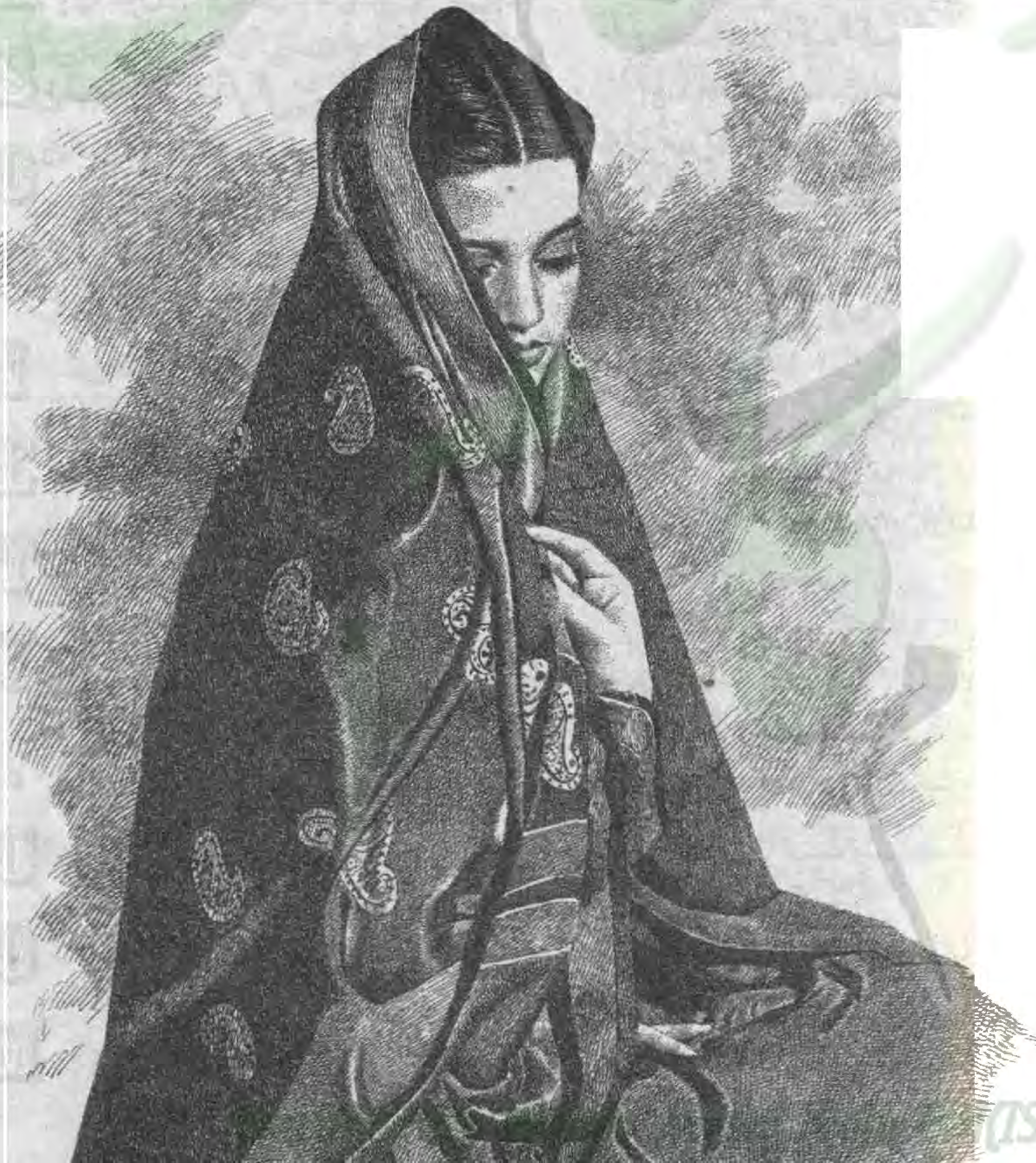
میں نہیں جانا چاہتی مگر اس نے مجھ سے وعدہ لے لیا حالانکہ وہ جانتی ہے کہ مجھے تکلیف ہوگی شایان اور عبیرہ کو ساتھ بیٹھے دیکھ کر۔ مگر وہ چاہتی ہے کہ میں اس تکلیف کو برداشت کروں اور میں... اس کی خوشی کے لیے یہ تکلیف برداشت کروں گی۔ کیونکہ ایک وہی تو ہے میری اپنی' میری غمگسار' میری دوست سدرہ جمال۔



"آج آفس نہیں جا رہیں؟" سدرہ نے مجھے آرام سے بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا تو میں نے



جھوٹ بولا۔

"سر میں درد ہے۔"

"اچھا پھر ایسا کرو ٹیبلٹ لے کر دوبارہ سو جاؤ پھر شام میں تمہیں شادی میں بھی جانا ہے۔" اس نے مجھے ہدایات جاری کیں اور آفس چل دی۔

میں ہمت کر کے اٹھی اور شام کے لیے اچھا سا سوٹ استری کیا۔

"ہائے شایان واسطی! کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ تمہیں بددعا دے دوں کہ جیسے تم نے میرا مذاق بنایا ہے تقدیر بھی ایسے ہی تمہارا مذاق بنا دے مگر نہیں۔ میں تمہیں بددعا نہیں دے سکتی کیونکہ جن سے محبت ہو ان کے لیے بددعا نہیں کی جا سکتی۔

ہاں شایان واسطی! میں تمکین زیدی تمہیں بددعا نہیں دے سکتی کیونکہ آج سے چھ ماہ پہلے جب میں نے تمہارے نام کی انگوٹھی پہنی تھی تو بدقسمتی سے تم سے محبت بھی کر بیٹھی تھی اور یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔

اے محبت تیرے انجام پر رونا آیا
جانے کیوں آج تیرے نام پر رونا آیا

میں نے آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو بالکل نہیں روکا کیونکہ یہ سارے آنسو آج ہی بہہ جائیں تو اچھا ہے۔

☆ ☆ ☆

میں نے جیسے ہی کاجل لگایا۔ آنکھیں بھیگنے کی وجہ سے کاجل پھر پھیل گیا۔ "میرا خیال ہے مجھے کاجل لگانا ہی نہیں چاہیے۔" میں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے سوچا۔

"تمکین بی بی! جتنی بھی کوشش کر لو کاجل لگاؤ یا نہ لگاؤ یہ راز تو افشا ہو ہی جاتا ہے کہ تم رو رہی ہو۔" میں جیسے ہی منہ دھو کر آئی تو سدرہ بولی۔

میں نے ایک نظر کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی سدرہ کو دیکھا اور پھر سے اپنا میک اپ کرنے لگی۔

میک اپ سے فارغ ہو کر میں جیسے ہی ہوٹل جانے کے لیے نکل رہی تھی سدرہ نے آگے بڑھ کر کچھ نوٹ میرے اوپر سے وارے تو میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"لگتا ہے تمکین زیدی! آج تم قیامت ڈھانے جا رہی ہو۔"

اس کی بات پر میں صرف مسکرا ہی سکی پھر ٹیکسی سے ہوٹل پہنچی۔ بارات پہنچ چکی تھی مگر عبیرہ احمد ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

شایان واسطی کچھ دیر اسٹیج پر اکیلا بیٹھنے کے بعد اب اپنے دوستوں کے بیچ کھڑا تھا۔ میں نے اسے دور سے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ اپنی وجاہت کے باعث لوگوں میں ہمیشہ نمایاں رہتا تھا اور آج تو اس کی شادی تھی۔

اسے دیکھ کر دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور کوشش کے باوجود میں اپنے آنسو نہ روک پائی۔ میں نے اپنے آنسو صاف کیے اور ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد لوگوں میں بے چینی پھیلنا شروع ہو گئی کہ "دلہن کہاں ہے؟"

پھر کہیں سے سننے میں آیا کہ "عبیرہ احمد گھر چھوڑ کر چلی گئی۔"

اس خبر نے میرے ہوش اڑا دیے۔ بھلا عبیرہ احمد کو کیا ضرورت پڑ گئی تھی گھر چھوڑ کر جانے کی۔ شایان سے اس کی شادی اس کی مکمل رضامندی سے ہو رہی تھی۔ مجھے اس خبر پر یقین نہیں آیا۔

دوسرا گھنٹہ گزرنے کے بعد شایان واسطی مسز احمد کے سامنے کھڑا تھا۔

"آنٹی! آخر آپ مجھے بتاتی کیوں نہیں ہیں کہ عبیرہ کہاں ہے؟ میں اس کا نمبر بھی ٹرائی کر رہا ہوں مگر اس کا موبائل آف ہے اور انکل بھی کال اٹینڈ نہیں کر رہے۔" شایان جھنجلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

کچھ دیر تو مسز احمد نے بہانے بنانے کی کوشش کی مگر پھر حقیقت بیان کر دی۔

"وہ کل رات... اپنے بابا سے ناراض ہو گئی تھی تو غصے میں پتا نہیں کہاں چلی گئی...؟ تم فکر مت کرو۔ اس کے پاپا اسے ڈھونڈنے گئے ہیں..."

مسز احمد کی بات سن کر میں نے دھواں دھواں

ہوتے شایان کو دیکھا۔ اپنی اتنی بے عزتی پر جیسے اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔

شایان کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی میرے دل کو کچھ ہوا۔ اس کی نظروں میں جانے کیا تھا کہ مجھے اپنا آپ مجرم لگا۔

شایان واسطی! خدا گواہ ہے میں نے تمہیں بددعا نہیں دی۔ میں تو تمہیں بددعا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟

شاید محبت اپنے ٹھکرائے جانے کا بدلہ خود لیتی ہے۔

وہ بارات کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ مسز احمد نے روکنا چاہا تو وہ بس اتنا ہی بولا۔

"شایان واسطی کو اپنی یہ عزت افزائی ہمیشہ یاد رہے گی۔" اس کی آواز میں جانے کیا تھا۔ میرا دل دکھی ہو گیا۔

بارات چلی گئی تو میں بھی ہاسٹل کے لیے چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

تین دن بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے معاف کر دو تمکین! میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔ تمہارے ساتھ برا کرنے کے بعد مجھے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں... میں آج بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔"

وہی جملہ جو آج سے چھ ماہ دس دن پہلے کہا گیا تھا۔ مجھے آنسو صاف کرتے ہی یاد آیا۔

میں اس کے قریب سے گزر کر ہاسٹل کے اندر جا رہی تھی تب... تب اس نے میرے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ دیے۔ حیرت سے میری آنکھیں پھٹنے کو ہو گئیں کہ شایان واسطی میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"تمکین! کچھ بھی ہو جائے۔ اسے معاف مت کرنا۔ اسے بھی ایسے ہی ٹھکرا دینا جیسے اس نے تمہیں ٹھکرایا تھا۔"

میرے کانوں میں سدرہ کے جملے گونج رہے تھے۔

"مجھے جو چاہے سزا دے دو مگر خدا کے لیے مجھے ٹھکرانا مت۔"

ہاتھ جوڑے التجا کرتا شایان واسطی کہہ رہا تھا جو کہتا تھا کہ "اپنی قسمت میں خود لکھوں گا۔"

اگر شایان واسطی اپنی قسمت خود لکھتا تو اس کی زندگی میں یہ المیہ کبھی نہیں ہوتا۔

"کچھ تو بولو تمکین! تمہاری خاموشی مجھے مار دے گی۔"

"اس خاموشی نے تمہیں اس وقت کیوں نہیں مارا جب تم منگنی توڑ کر جا رہے تھے؟" میرا دل چاہا اس سے پوچھوں۔ مگر میں آج بھی چپ تھی۔

"تمکین! مجھے کوئی بھی سزا دے لو مگر پلیز میری محبت کو ٹھکرانا نہیں۔"

"معاف مت کرنا تمکین...!" سدرہ کی آواز گونجی۔

"فیصلہ سناؤ تمکین!" وہ منت کر رہا تھا۔

اور پھر میں نے فیصلہ سنا دیا۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔ وہ تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں مر کر بھی تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔"

مجھے اب سدرہ کی فکر تھی جو میرا یہ فیصلہ سن کر مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ بہت لڑے گی مجھ سے۔ پھر میں اسے بتاؤں گی کہ شایان واسطی کو ہاتھ جوڑے کھڑے دیکھ کر میرے دل کو کتنی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں اسے بتاؤں گی کہ محبت کو ٹھکرانے والے کبھی سکون سے نہیں رہتے... محبت خود ان سے انتقام لے لیتی ہے... محبت انہیں بددعا دے دیتی ہے اور اگر وہ بددعا لگ جائے تو شایان واسطی جیسا شخص تمکین زیدی کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہو جاتا ہے اور میں اسی بات سے ڈرتی ہوں کیونکہ... میں نے بھی محبت کی ہے۔



مریم ساجد

آنگن میں اترے چاند

"اصول تو یہ ہونا چاہیے کہ جو سالن بنائے اسے ہی برتن بھی دھونے چاہئیں۔" سنک پر جھکا وجود' جو جلی ہوئی دیگچی مانجھتے مانجھتے خود بھی جل بھن رہا تھا۔ جھنجھلا کر بولا۔

"بالکل ٹھیک! اور جو گند ڈالے اسے ہی فرش چمکانا چاہیے۔" فرش پر رگڑ رگڑ کر پونچھا لگاتے ہوئے وجود نے بھی دہائی دی۔

"ہاں! سب کو اپنے اپنے کپڑے بھی خود ہی دھونے چاہئیں!" کچن کے پچھلے دروازے کے پاس واشنگ مشین لگائے ایک اور وجود بھی میدان میں کودا۔

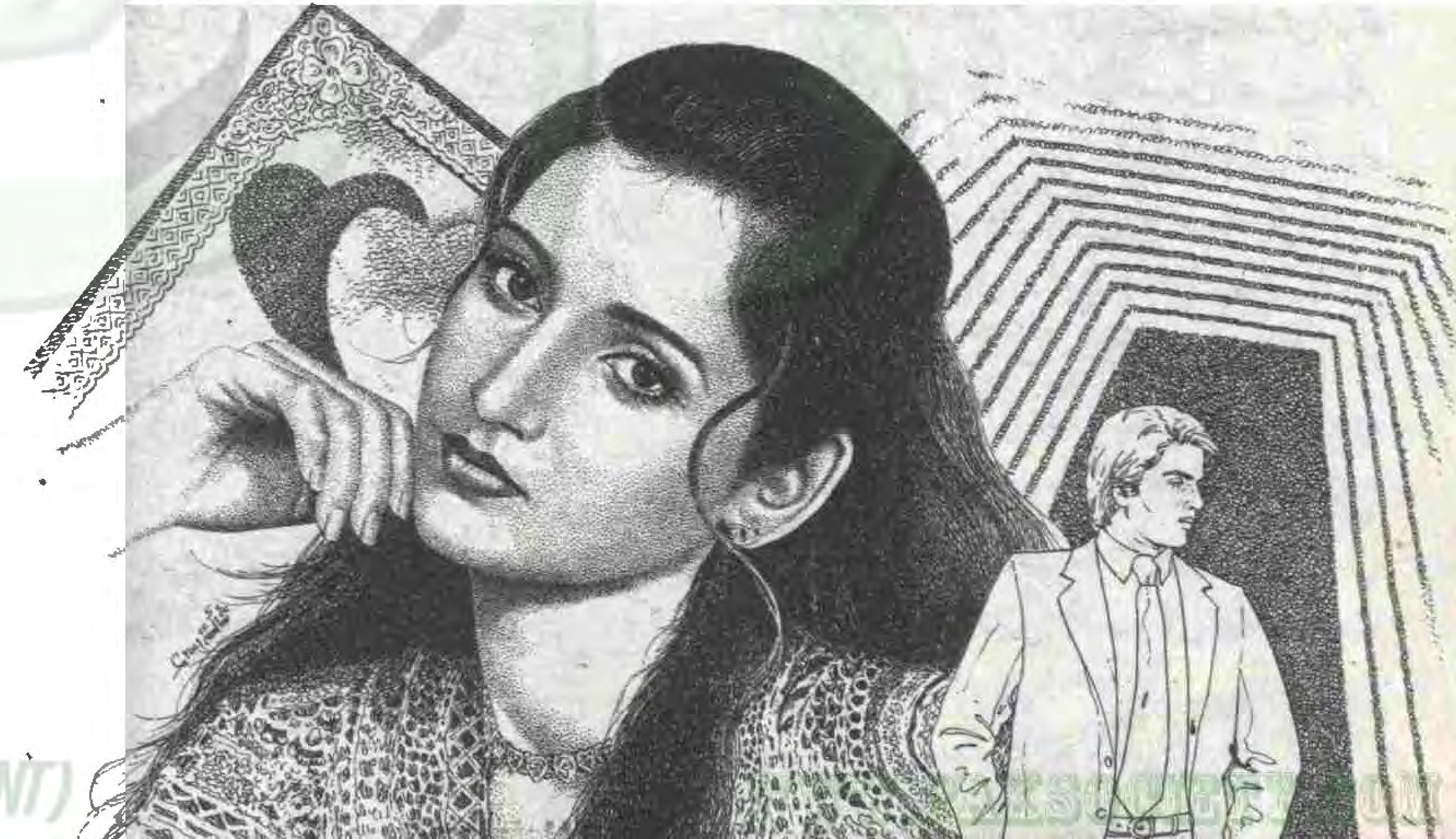
"کیوں' کیوں' کیوں؟" ڈسٹنگ کرتا ہوا وجود تڑپ کر سیدھا ہوا۔ یہ اس کے لیے سب سے زیادہ ناپسندیدہ کام تھا۔

"ارے! تم لوگوں نے ابھی تک اپنا کام ختم نہیں کیا؟" اوپر کی سیڑھیوں سے مزید تین افراد نیچے آئے۔

"دیکھ لو! ہم جیت گئے حالانکہ ہماری تعداد کم تھی۔"

"بڑا تیر مار لیا ہے تم لوگوں نے تو' ہمارا کام دیکھو اور اپنا کام۔" برتن دھوتا ہوا وجود تو کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ آدھے برتن چھوڑ کر لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز

مکمل ناول



ہوگیا۔

”ماسی مصیبتے! تمہیں تو ہر کام ہی بڑا لگتا ہے۔“ اوپر سے آئے افراد میں سے ایک بولا تو دوسرے نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”ہر کام نہیں بلکہ صرف وہ کام جو اس نے کرنا ہو۔“

”آ۔۔۔ اچھا!“ صوفے پر نیم دراز وجود تڑپ کر سیدھا ہوا۔

”تو پھر ٹھیک ہے کل سے برتن تم دھونا۔“

”اوکے! اور کل سے اوپر کے سارے کمروں کی ڈسٹنگ اور ہر اتوار کو تمام کمروں کے باتھ رومز اور وارڈروب آپ کے ذمے۔“

”ارے واہ! میں کیوں کروں یہ سارے کام؟“

”کیونکہ میرے ذمے بھی یہی کام ہیں۔ اب اگر آپ کے حصے کے کام میں نے لیے ہیں تو میرے حصے کے سارے کام آپ کو کرنے ہیں اور ہاں! ساتھ میں شام کی چائے بھی بنانی ہے۔ ہفتے میں چار دن۔“ اس نے ساری تفصیل بتائی۔

”بس، بس! میرے ذمے جو کام ہے وہی بہت ہے۔“ سواری مرے مرے قدموں سے اٹھ کر چلتی ہوئی واپس کچن میں غروب ہوگئی۔

”اوہو! بھئی یہ تو ان کا روز کا معمول ہے۔ چلیے! ان سے تعارف حاصل کرتے ہیں اور مکمل تعارف کے لیے آپ کو گھر سے باہر آنا پڑے گا۔

ہاں جی! تو یہ جو سلور گرے کلر کا گیٹ ہے نا۔۔۔ چلیے بسم اللہ کریں اور اندر قدم رکھیں۔۔۔ سرخ پتھروں کی طویل روش۔۔۔ یہ اس گیٹ سے شروع ہوتی ہے اور دوسرے گیٹ تک جا پہنچتی ہے۔

”وہ دیکھیے ذرا وہ بنگلے کے دائیں جانب کون ہے بھلا! چلیں پہلے ان سے ہی تعارف حاصل کرتے ہیں۔“

”بس آئندہ میں نے کپڑے نہیں دھونے۔ غضب خدا کا پورے ہفتے کے کپڑے دھونا کوئی آسان بات ہے اور وہ بھی پورے آٹھ لوگوں کے بس ختم۔“

یہ اعلان کرنے والے وڑائچ صاحب کے چوتھے نمبر والے بیٹے عمیر صاحب ہیں۔ جو خالص دھوبیوں والے انداز میں کپڑے پٹخ رہے ہیں اور ساتھ ساتھ زور و شور سے بڑبڑا رہے ہیں، چلیے آگے چلتے ہیں۔

یہ تو کچن ہے اور برتنوں پہ اپنا غصہ نکالتے ہوئے اس گھر کے دوسرے نمبر والے سپوت شہریار صاحب۔۔۔ برتنوں سے انہیں خدا واسطے کا بیر ہے مگر یہ کام چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ کیوں؟ یہ تو شہریار صاحب ہی جانیں۔

چلیں اور آگے چلتے ہیں۔ یہ تیسرے نمبر والے موصوف فہد وڑائچ ہیں۔ گندگی ان سے بالکل برداشت نہیں ہوتی۔ سو پوچھا لگانا ان کی پارٹ ٹائم ہابی ہے۔

اور یہ جو لاؤنج میں صوفوں پر افراد بیٹھے ہیں ان میں دائیں ہاتھ پر چینل سرچنگ کرتے ہوئے موصوف وڑائچ صاحب کے ولی عہد اور سب سے بڑے صاحب زادے آفاق وڑائچ ہیں۔

ان کے ساتھ ہی یہ جو کیمسٹری کی کتاب میں منہ گھسیڑے رٹا لگانے میں مصروف ہیں یہ سب سے چھوٹے میاں یعنی سب سے چھوٹے صاحب زادے عاصم وڑائچ ہیں اور یہ جو دوسرے صوفے پر بیٹھے ہوئے مسلسل میگزین کو کھنگال رہے ہیں۔ یہ قاسم وڑائچ نہایت منہ پھٹ واقع ہوئے ہیں موصوف۔

ارے ارے ذرا دیکھ کر۔۔۔ کوئی ڈنڈا لے کر ہے۔۔۔ ڈریں نہیں۔۔۔ ارے بھئی جالے اتارنے اس ڈنڈے سے، آپ کو تھوڑی مارنا ہے۔ لیکن یہ کون! آں ہاں! اب سمجھ آئی آپ کی حیرانی کی وجہ عمیر صاحب اتنے اچھے نہیں ہیں کہ ایک وقت میں دو، دو کام کریں۔ بھئی یہ تو اپنے عذیر صاحب ہیں۔۔۔ عمیر کے جڑواں بھائی۔ صرف چند منٹ چھوٹے ہیں عمیر صاحب سے۔۔۔ سوان کا نمبر پانچواں بنا ہے۔ شکلاً“ بھی جڑواں اور عادتاً“ بھی جڑواں۔۔۔ حد سے زیادہ شیطانی دماغ رکھتے ہیں یہ دونوں بھائی اور قاسم سے ان دونوں کی نہیں بنتی کیونکہ قاسم صاحب کو تو مرض لاحق ہے ہر راز بیچ چوراہے پر پھوڑنے کا تو بھلا ایسے بندے کے ساتھ ان کا گزارا ہو سکتا ہے؟

”گھسڑ گھسڑ گھسڑ سڑپ گھسڑ!“ ارے یہ تو دیکھیے بھلا یہ کون ہیں؟ قمیص دھوتی کے ساتھ ہوائی چپل پہنے ہوئے۔ ایک بازو میں اچار والا مرتبان ایسے جکڑے ہوئے جیسے اگر ذرا سی گرفت ڈھیلی ہوئی تو مرتبان صاحب چھلانگ لگا کر یہ جا وہ جا ہو جائیں گے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی دھوتی کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف۔۔۔ اوں ہوں۔۔۔ کچھ غلط مت سوچیے۔

باادب! باملاحظہ ہوشیار۔

یہ ہیں اس گھر کے سربراہ چوہدری شیراز وڑائچ۔

ارے! آپ تو بے ہوش ہونے لگے یہ تو بھئی ایسے ہی ہیں۔

یہ تو تھے اس گھر کے جملہ افراد۔

آں۔۔۔ صنف نازک کے نام پر اس گھر میں چند ماہ پہلے ایک عدد بوا رہتی تھیں۔ مگر پھر ان کا انتقال ہوگیا اور یہ گھر صنف نازک سے محروم ہوگیا۔۔۔ چوہدری صاحب کی بیگم کا تو عاصم کی پیدائش پر ہی انتقال ہوگیا تھا۔ سو اب اس گھر کا صنف نازک سے تعلق صرف نام کی حد تک ہی تھا یعنی قصر لاائلہ۔

آج اتوار تھا۔ اس لیے یہ سب اس حلیے میں نظر آرہے تھے۔ ورنہ چوہدری شیراز صاحب اس شہر کے مشہور بزنس مین ہیں اور آفاق بھی ان کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ جبکہ شہریار ایک ذہین انجینئر ہے۔ البتہ یہ ذہانت اور قابلیت صرف انجینئرنگ تک ہی ہے۔ ورنہ گھر کے کام کاج میں خاصا پھوہڑ قسم کا مرد ہے۔

فہد وڑائچ ایک قابل ڈاکٹر ہیں اور شہر کے مشہور اسپتال سے وابستہ ہیں۔ خاصے مصلح جو قسم کے ہیں۔ مگر ان کی ایک خامی ان کی سب خوبیوں پر بھاری ہے۔ وہ یہ کہ موصوف ڈاکٹر تو بن گئے ہیں۔ مگر بلا کے بھلکڑ ہیں۔۔۔ اور اپنی اس عادت سے وہ خود بھی عاجز ہیں اور دوسروں کو بھی عاجز کیے رکھتے ہیں۔

عمیر اور عذیر دونوں ایم بی اے کے فائنل ایر کے نہایت ذہین طالب علم ہیں۔ قاسم، شہریار کے نقش قدم پر چلتا ہوا اب انجینئرنگ کے پہلے سال میں تھا۔ جبکہ عاصم اپنے فہد بھائی کو آئیڈیلائز کرتا ہوا پری میڈیکل فرسٹ ایر میں تھا۔

شیراز صاحب نے ان سب لڑکوں کو حقیقتاً“ ماں بن کر پالا تھا۔ صبح صبح اٹھ کر سب کے لیے ناشتا بنانا، لنچ بنا کر بیگ میں ڈالنا۔ قاسم اور عاصم کو اسکول کے لیے تیار کرنا، پھر رات کا کھانا تیار کرنا، ان لوگوں کو ہوم ورک کروانا، پیرنٹس ٹیچر میٹنگ بھگتانا، غرض کہ شیراز صاحب نے حقیقتاً“ بہت ٹف اینڈ ٹائٹ زندگی گزاری تھی۔ ملازم رکھنا وہ افورڈ تو کر سکتے تھے، مگر کوئی ٹکے بھی تو سہی۔

ان لڑکوں کے بیچ گھن چکر بن کر ہر نوکر ایک ماہ بھی بمشکل گزار پاتا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

اگر ایک کو چائے چاہیے تو دوسرے کو کافی' تیسرے کو جوس' چوتھے کو دودھ' پانچویں کو کچھ اور' ملازم بے چارہ تو چکرا کر رہ جاتا۔ پھر کچھ ماہ پہلے شیراز ایک بوڑھی عورت کو نہ جانے کہاں سے لے آئے تو آہستہ آہستہ گھر کا نظام درست ہونے لگا۔ لڑکے بھی بوا کے ساتھ مانوس ہوگئے۔ اب ہر کام وقت پر ہونے لگا' سب کو اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں آرام سے ملنے لگیں۔ اگر بوا ان سب کا خیال رکھتی تھیں تو یہ سب بھی بوا کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی ضروریات' ان کی ادویات اور ان کا ریگولر چیک اپ' غرض کہ بوا کی حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی تھی۔

مگر یہ پرامن دور بھی بہت مختصر ٹھہرا۔ بوا کے انتقال کی وجہ سے قصر لائلہ کا نظام ایک دفعہ پھر درہم برہم ہوگیا۔ پہلے پہل تو سب نے بڑھ چڑھ کر گھر کے کاموں میں دلچسپی لی۔ مگر جب مستقل طور پر کام سب کے ذمہ لگ گئے تو وہ جھنجلا اٹھے۔ شیراز صاحب نے بھی اب پورا گھر ان کے حوالے کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"او یار خدا کے لیے' کسی ایک چینل پر لگا رہنے دے۔" فہد نے شہریار کے ہاتھ سے ریموٹ چھیننے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی سنبھل کر بیٹھا ہوا تھا۔

"اس کے ہاتھ میں تو خارش ہوتی رہتی ہے۔" آفاق نے بے زاری سے کہا۔ پاکستان اور انڈیا کا میچ لگا ہوا تھا اور ریموٹ شہریار کے ہاتھ میں تھا۔ اشتہارات کے دوران وہ چینل تبدیل کردیتا اور وہ سب بدمزا ہوجاتے۔

اس وقت وہ سب لاؤنج میں بیٹھے میچ دیکھ رہے تھے۔ شیراز صاحب اپنے کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ جبکہ عمیر ابھی ابھی باہر گیا تھا اور عاصم اکیڈمی میں تھا۔

"تم لوگ اپنی چونچیں بند کروگے' یا میں ٹی وی بند کردوں؟" آخر کار آفاق کو بڑے بھائی والا کردار ادا کرنا پڑا۔

"ایکسکیوز می!" اس صدا پر سب کی نظریں اور گردنیں مشینی انداز میں گھومیں۔

ٹی وی لاؤنج کے آخری سرے پر پورے اعتماد سے کھڑی سیلز گرل۔۔۔ وہ میچ بھول گئے۔

"جی فرمایئے!" باقی سب کا سکتے سے نکلنے کا ابھی کوئی امکان نہیں تھا سو آفاق کو ہی پہل کرنی پڑی۔

"ایم سوری! وہ گیٹ کھلا ہوا تھا تو میں اندر آگئی' میں پنک روز کمپنی کی طرف سے آئی ہوں' ہماری کمپنی لپ اسٹک۔۔۔ آئی شیڈو۔" وہ اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائے مختلف پروڈکس کے نام گنوانے لگی۔

"مس! آپ کھڑی کیوں ہیں' آئیں بیٹھیں ناں!" عذیر نے فوراً" اپنی جگہ خالی کی تو سیلز گرل ایک لمحے کے لیے کنفیوز ہوگئی۔

"کائنڈلی آپ اپنے گھر کی خواتین۔۔۔"

"ارے! آپ پہلے بیٹھیں تو سہی۔" آفاق کے گھورنے کے باوجود عذیر نے اسے بیٹھنے کی پیشکش کردی۔

"لیکن۔۔۔" اب وہ بے چاری گھبرا گئی۔

"ارے! لیکن ویکن چھوڑیں۔ بیٹھیں پلیز۔۔۔ پلیز!" شہریار نے بھی اصرار کیا تو وہ بیٹھ گئی مگر اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی تھی۔ اس نے اپنا بیگ سنٹرل ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"جی تو مس! کھولیں اپنی پٹاری!" فہد نے جھانک کر اس کے بیگ میں دیکھا۔

"لیکن یہ تو۔۔۔" اس نے ایک دفعہ پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن قاسم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ایک تو آپ "لیکن" کا استعمال بہت ہی زیادہ کرتی ہیں۔"

"دیکھیں پلیز آپ پہلے گھر کی لیڈیز کو۔۔۔" وہ بولی۔

"ارے گولی ماریں گھر کی لیڈیز کو۔۔۔ پہلے ہمیں تو نبٹالیں۔" شہریار اپنی مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"پلیز! آپ گھر کی لیڈیز کو بلوائیں گے یا میں جاؤں؟" وہ کھڑی ہوگئی۔

"لیکن یہاں تو کوئی لیڈی ہے ہی نہیں سوائے آپ کے!" شہریار نے گویا اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

"ک۔۔۔ ک۔۔۔ کیا مطلب!" رنگت تو پہلے ہی اڑی ہوئی تھی' اب تو چہرے پر ہوائیاں بھی اڑنے لگیں۔

"مطلب بالکل وہی ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔" عذیر نے اس کے تاثرات سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر بھاگی مگر شومئی قسمت اندر آتے عمیر سے بری طرح ٹکرا گئی۔ سر تو چکرایا ہوا ہی تھا لیکن عمیر کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

"ابھی تو وہ وہاں تھا اندر۔۔۔ تو یہاں کیسے۔۔۔ یہ بھوت بنگلہ۔" اپنے اڑتے ہوئے حواس کو قابو میں کیا اور پوری رفتار سے عمیر کے پاؤں کو کچلتے ہوئے باہر کی طرف بھاگی۔

عمیر جو ابھی ٹکر سے ہی سنبھل نہ پایا تھا' پاؤں پر ہونے والے ستم نے اسے ایک ٹانگ پر ناچنے پر مجبور کردیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کون تھی؟" بالآخر اپنا بریک ڈانس روک کر اس نے پوچھا۔

"سیلز گرل۔" قاسم نے جواب دیا' وہ سب بھی اس کے اس طرح اٹھ کر بھاگنے پر حیران تھے۔

"لیکن یہ اس طرح کیوں بھاگی تھی؟" وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنے پاؤں کا معائنہ کرنے لگا۔

"پتا نہیں! شاید۔۔۔" فہد کچھ کہتے کہتے رک گیا' اس کی نظروں کے سامنے اس لڑکی کا گھبرایا ہوا چہرہ گھوم گیا۔

"ارے۔۔۔ یہ اس کا بیگ تو یہیں رہ گیا۔" شہریار نے کہا تو سب کی نظریں اس طرف گئیں صوفے کے پاس' نیچے کارپٹ پر ایک چھوٹا سا بیگ پڑا تھا۔ شاید بھاگتے ہوئے اسے اٹھانا بھول گئی تھی۔

"ہاں! جلدی سے کھول کر دیکھو' کہیں کوئی بم وم نہ ہو!" قاسم چھلانگ لگا کر دور ہٹ گیا۔

"ہوں ہو! اتنے سے بیگ میں کیا بم ہوتا ہے۔" آفاق نے کہا۔

"ویسے کھول کر دیکھ لو' شاید کوئی کانٹیکٹ نمبر وغیرہ ہو تو واپس کر آنا۔" شہریار کہہ کر میچ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

فہد نے بیگ کھول کر دیکھا۔

آدھا برگر' ایک پانی کی بوتل' ایک سو تیس روپوں اور آئی ڈی کارڈ کے علاوہ اس کے بیگ سے کوئی قابل ذکر چیز برآمد نہیں ہوئی تھی' آئی ڈی کارڈ پر جو پتا لکھا تھا' اس جگہ کا نام تو اس نے سنا ہوا تھا مگر کبھی وہاں گیا نہیں تھا۔

"چلو اسپتال سے واپسی پر چلا جاؤں گا۔" اس نے سوچا اور پھر میچ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

جوتا ٹوٹنے والا تھا' پاؤں پر جوتے کی گرفت ڈھیلی ہوتی جارہی تھی سو اب وہ پاؤں گھسیٹ کر چل رہی تھی تاکہ کسی طرح گھر پہنچ جائے مگر۔۔۔ گھر پہنچ کر کیا ہونا تھا کل پھر اس جوتے کے ساتھ اسے نکلنا تھا کام کے لیے۔

گھر کا خیال آتے ہی اس کی مدھم رفتار اور سست ہوگئی۔ اس سے پیچھے آنے والے لوگ کب کے اس سے آگے نکل گئے تھے مگر وہ۔۔۔ ہاں ایسا ہی تو زندگی میں اس کے ساتھ ہوا تھا۔ اماں کی وفات کے بعد جب ابا نے دوسری شادی کی تو وہ بھی زندگی کی دوڑ میں اسی طرح پیچھے رہ گئی' سوتیلی ماں نے نہایت ایمان داری سے اپنا سوتیلا پن دکھایا۔ ابا کے ہوتے ہوئے اس نے دس جماعتیں پاس کرلیں مگر جب وہ فرسٹ ایر میں تھی تب ابا نے آنکھیں بند کرلیں اور ابا کے ہونے سے واحد عیاشی جو وہ کررہی تھی وہ بھی بند ہوگئی۔

"تیرا باپ کوئی لمبی چوڑی جائیداد نہیں چھوڑ کر گیا جو تیرے شوق پورے کروں' آرام سے گھر بیٹھ۔"

اور پہلی دفعہ اس نے احتجاج کیا جو اسے بہت مہنگا پڑا۔ نیلوں نیل جسم کے ساتھ سخت سردی میں وہ رات اس نے اپنے ہی گھر کے باہر اماں کی منتیں کرتے ہوئے

گزاری۔ صبح محلے والوں کے سمجھانے پر وہ بڑی مشکلوں سے اسے گھر میں رکھنے پر راضی ہوئیں۔

اماں کا مزاج پل میں تولہ پل میں ماشہ جیسا تھا‘ کچھ عرصے بعد وہ اسے گھر میں بیٹھ کر مفت روٹیاں توڑنے کے طعنے دینے لگیں‘ نہ تعلیم تھی نہ ہی کوئی ہنر‘ وہ کرتی تو کیا کرتی۔

اس نے اپنا مسئلہ ایک پڑوسن خالہ کے سامنے پیش کیا اور ان کے توسط سے اسے ایک جگہ سیلز گرل کی نوکری مل گئی۔ وہ کبھی گھر سے نکلی ہی نہیں تھی‘ اس کے لیے یوں گھر گھر پھرنا اور چیزیں فروخت کرنا نہایت تکلیف دہ کام تھا‘ مگر زندگی کو بھی تو گزارنا تھا ناں!

ایک ساتھی ورکر کے مشورے پر اس نے پہلے ایف اے اور پھر بی اے کا امتحان بھی دے دیا‘ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد اس نوکری سے چھٹکارا پا کر کوئی قابل عزت نوکری حاصل کرے‘ فی الحال وہ رزلٹ کے انتظار میں تھی۔

آج جو واقعہ ہوا تھا اس نے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اگر کچھ ایسا ویسا ہو جاتا تو اس کے پیچھے کون تھا جو اسے ڈھونڈتا اور اماں نے تو سب سے پہلے اسے گھر سے بے دخل کرنا تھا‘ یہ سوچ ہی اس پر کپکپی طاری کر دیتی اور اس کا پرس بھی وہیں رہ گیا تھا‘ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور اس کے بیگ میں اگلے چھ دن کے لنچ کے پیسے اور بس کا کرایہ تھا۔

گھر کی چوکھٹ پار کرتے ہی اس کی نظر سعدیہ پہ پڑی‘ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی۔

”ارے آپی! آج آپ جلدی آ گئیں۔“

سوتیلے رشتوں میں صرف سعدیہ کے دم سے ہی اپنائیت کا ایک احساس باقی تھا ورنہ اماں کے پانچ بچے صرف نام کے ہی اس کے بہن بھائی تھے۔

”آپ بیٹھیں! میں پانی لے کر آتی ہوں۔“ وہ کچن کی طرف لپکی۔

”ہاں ہاں! پلاؤ پانی! ہل جوت کر آ رہی ہیں ناں! پتا نہیں کہاں کہاں منہ ماری کر کے آتی ہیں محترمہ......“ اماں کی تیز آواز اندر کے کمرے سے آئی اور دن بھر کی تھکن پھر سے اس پر غالب آ گئی۔ ایک نظر اس اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے پر ڈالی اور آنسو چپکے سے کی چادر میں گم ہو گیا۔

✲ ✲ ✲

بچپن سے ہی ان دونوں نے محلے والوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا‘ جڑواں ہونے کا وہ بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے‘ اسکول میں بھی وہ کسی پل چین سے نہیں رہتے تھے۔ کلاس فیلوز تو کلاس فیلوز انہوں نے تو ٹیچرز کو نہیں چھوڑا تھا۔ ہم شکل ہونے کے انہوں نے بہت جائز اور ناجائز فائدے اٹھائے تھے۔

پرچے کے دوران وہ دونوں اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھتے‘ پانی پیا‘ اور واپس جا کر بیٹھ گئے‘ بظاہر کچھ بھی نہیں ہوا تھا مگر رزلٹ دونوں کا ایک جیسا ہی آیا‘ دونوں کی اپنی جماعت میں پہلی پوزیشن آئی تھی‘ ساتویں کلاس تک یہی ہوتا رہا مگر ساتویں جماعت میں ایک نئے سر نے انہیں پکڑ ہی لیا۔

ہوا کچھ یوں کہ وہ پچھلے تین پیپرز میں ان کا یہ دیکھتے رہے کہ دونوں ہی اکٹھے اٹھتے‘ کبھی پانی پینے کے بہانے‘ کبھی کچھ پوچھنے کے لیے یا پھر کسی بھی وجہ سے اور پھر واپس اپنی اپنی جگہ پر چلے جاتے۔ انہیں کسی چیز کا احساس ہوا لہٰذا چوتھے پیپر والے دن انہوں نے پیپر پر دستخط کرتے ہوئے ایک لائن اپنے پین سے ایک کی شرٹ پر لگا دی۔

جیسے ہی حسب سابق دونوں اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے‘ دونوں نے اٹھ کر پانی پیا اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد سر ایک کے بینچ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ البتہ ان کے چہرے پر ہلکی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ ”عمیر بیٹا! آپ غلطی سے عذیر کی جگہ پر بیٹھ گئے ہیں۔“

وہ پہلے تو بوکھلایا مگر پھر اعتماد سے جواب دیا۔

”سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے‘ میں عذیر ہی ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”بیٹا! غلط فہمی مجھے نہیں‘ آپ کو ہوئی ہے‘ یہ دیکھیں ذرا‘ یہ میں نے ہی عمیر کی شرٹ پر لگایا تھا۔“ انہوں نے اسے اس کے کندھے پر لگا ہوا نشان دکھایا۔

”لیکن سر!“ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کوئی بہانہ ہی ذہن میں نہیں آیا‘ سر نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔

پرنسپل صاحب نے شیراز صاحب کو بلوایا اور ان دونوں کو وارننگ دی‘ شیراز صاحب وہاں سے تو چپ چاپ اٹھ کر آ گئے مگر گھر آ کر وہ پہلی دفعہ ان دونوں پر برسے اور ان سے بات چیت بند کر دی۔

”سوری ڈیڈی۔“ رات گئے وہ شیراز صاحب کے کمرے میں تھے‘ شیراز صاحب ابھی تک جاگ رہے تھے‘ وہ دونوں سر جھکائے ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

”تم لوگوں کو سوری کہنے کی کیا ضرورت ہے؟“ ان کا لہجہ سنجیدہ اور سرد تھا۔

”بلکہ سوری تو مجھے کہنا چاہیے‘ شاید میری تربیت میں ہی کچھ کمی تھی‘ میں تم لوگوں کو ویسی توجہ نہیں دے سکا جیسی مجھے دینی چاہیے تھی‘ حالانکہ میں نے تو اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی تھی لیکن... اس سب کے لیے ویری ویری سوری بیٹا۔“ انہوں نے گلاسز اتار کر ٹیبل پر رکھے اور آنکھیں موند لیں‘ یہ ان کا انتہائی ناراضی کا انداز تھا۔

”سوری ڈیڈی...! پلیز! اس دفعہ معاف کر دیں... پلیز ڈیڈی!“ وہ دونوں اکٹھے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

انہوں نے ایک نظر اپنے بیٹوں کو دیکھا‘ جن کی شکلوں سے ہی ندامت ظاہر ہو رہی تھی۔

”اوکے! بٹ دس از فرسٹ اینڈ لاسٹ وارننگ... انڈر اسٹینڈ؟“

اس کے بعد انہوں نے ایسی تمام شرارتیں بند کر دیں جو کہ ان کے نزدیک انہیں یا کسی اور کو نقصان پہنچانے کا سبب بن سکتی تھیں۔

مگر... دوسروں کو چکرا کر رکھ دینے والی شرارتیں جاری رکھیں۔

یونیورسٹی کے پہلے سال تو انہوں نے پورے ڈیپارٹمنٹ کا جینا حرام کیے رکھا‘ کیا کلاس فیلوز اور کیا سینئرز... سب ہی ان کی شرارتوں کا شکار بنے رہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ سب کو علم ہو گیا لیکن پھر نئے آنے والوں کی شامت آ گئی۔

وہ دونوں زیادہ تر ایک جیسی ڈریسنگ کرتے تھے۔ عمیر کسی جونیئر کو کوئی نوٹس پکڑا کر جاتا‘ عذیر جا کر لے آتا‘ عمیر واپس جا کر طلب کرتا تو جونیئرز کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ کوئی ان سے راستہ پوچھتا‘ تو ایک پہلے ہی اس جگہ پر موجود ہوتا‘ راستہ پوچھ کر جانے والا بے چارہ حیران پریشان رہ جاتا۔

”ایکسکیوز می!“ عمیر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہر نئے چہرے پر تبصرہ کر رہا تھا جب ایک لڑکی نے اسے متوجہ کیا۔

”جی فرمائیے!“ عمیر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا جبکہ اس کے دوستوں نے آنکھیں گھمائیں۔

”وہ مجھے لائبریری... لائبریری کہاں ہے؟“ وہ یقیناً ”نئی“ ہی تھی مگر اس کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ ”کائنڈلی آپ مجھے گائیڈ کر سکتے ہیں؟“

”جی ضرور۔ کیوں نہیں!“ اس نے مسکراہٹ دبائی کیونکہ عذیر لائبریری ہی گیا ہوا تھا‘ اس نے اطمینان سے راستہ بتایا۔

”سو نائس آف یو!“ اس نے مسکرا کر کہا اور چلی گئی۔

عمیر میسج کرنے لگا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد عذیر اس کے سر پر موجود تھا۔

”اوئے کون سا راستہ سمجھایا ہے اسے؟ عالم بالا کا؟... لائبریری تو وہ پہنچی ہی نہیں... بلکہ اس حلیے کی کوئی بھی لڑکی آئی ہی نہیں وہاں!“

”اچھا؟“ عمیر کو مایوسی ہوئی۔ ”سمجھایا تو صحیح تھا... چلو خیر ہے... بچت ہو گئی بے چاری کی۔“

”ہوں!“ عذیر پاؤں پٹختا واپس چل پڑا۔ اتنے اہم نوٹس بنا رہا تھا مگر عمیر کے میسج کی وجہ سے

چھوڑنے پڑے۔

"سنیے؟" ابھی وہ لائبریری پہنچا ہی تھا کہ ایک لڑکی نے اسے روکا۔

"جی!" اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"وہ!" کچھ جھجک سی گئی ہونٹ کاٹتے ہوئے عذیر کی طرف دیکھنے لگی۔

"مارکیٹنگ کی کلاس کس طرف ہوگی؟"

"میرے سر پر!" اس کا دل چاہا کہ کہہ دے مگر شرافت سے اسے بتا دیا۔ کیونکہ یہ اس کا اپنا ہی ڈیپارٹمنٹ تھا۔ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے عمیر کو میسج کردیا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

عذیر جلدی فارغ ہو کر واپس آگیا تھا۔ اب آرام سے ٹی وی کے آگے بیٹھا ہوا تھا۔ عمیر آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔

"تم... تم بدتمیز انسان..." غصے کی وجہ سے اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا عذیر نے اطمینان سے اسے دیکھا اور ٹی وی کا والیوم تھوڑا کم کردیا۔

"کیا ہوا ہے؟" اس کے اطمینان کو دیکھ کر عمیر کو تو آگ ہی لگ گئی تھی۔

"پاگل سمجھا ہوا ہے مجھے؟ الو کا پٹھا ہوں' گدھا ہوں میں...؟"

"جو بھی سمجھ لو!... اب میں تو کچھ نہیں کہہ رہا نا!" وہ مسکرایا اور پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ لڑکی ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی طرف آرہی ہے..." وہ کمر پر ہاتھ ٹکا کر اس کے عین سامنے کھڑا ہوگیا۔

"ہاں تو پھر؟"

"جھوٹ کیوں بولا تم نے؟"

"میں نے جھوٹ نہیں بولا' وہ سچ میں مجھ سے پوچھ کر گئی تھی' ہوسکتا ہے' راستہ سمجھ میں نہ آیا ہو۔"

"تم نے بدلہ لیا ہے نا مجھ سے؟" عمیر کو یقین نہیں آیا تھا۔

"کس بات کا؟" عذیر نے ناسمجھی سے اس طرف دیکھا۔

"جو لڑکی میں تمہاری طرف بھیجی تھی' وہ تک نہیں پہنچی اس لیے!" اس نے مشکوک سے عزیر کو گھورا۔

"اوہو!" عذیر سر پر ہاتھ مار کر اٹھ بیٹھا۔

"نہیں بھئی! میں نے کوئی بدلہ نہیں لیا۔ ایک پرپل اور وائٹ کپڑوں والی لڑکی نے مجھ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھا تھا۔"

"حیرت ہے پھر وہ تجھے نظر کیوں نہیں آئی!" عم حیران پریشان تھا۔

☆ ☆ ☆

آج وہ اسپتال سے جلدی فارغ ہوگیا تو اسے ذ آیا کہ اس نے اس دن والی سیلز گرل کی چیزیں وا کرنی تھیں۔

"او شٹ!" اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ

"ہوسکتا ہے اسے ان چیزوں کی ضرورت ہو اور میں کر بیٹھا ہوا ہوں۔"

اس نے گاڑی میں ہی بیگ رکھا ہوا تھا تاکہ بھی وقت ملے تو وہ اسے لوٹا سکے۔ اس نے ہاتھ بڑ پچھلی سیٹ سے بیگ اٹھایا اور اس کا آئی ڈی کارڈ کر ایڈریس دیکھنے لگا۔

اس علاقے کا اس نے صرف نام ہی سنا ہوا تھا گنجان آباد علاقہ تھا اسے ڈرائیونگ میں مشکل آرہی تھی۔ کئی دفعہ اس کا دل چاہا کہ بھاڑ میں اس کی چیزیں مگر اس کی فطرت نے اسے ایسا کر دیا۔

آخر کار راستہ پوچھ پوچھ کر وہ اس محلے تک تو مگر گھر ڈھونڈنے میں اسے ابھی تک دشواری کا تھا گاڑی اسے کافی دور ہی روکنی پڑی تھی۔

یہاں وہ جس سے بھی صبا کے گھر کا پوچھتا' وہ ایک منٹ کے لیے سر سے پاؤں تک گھورتا

آگے بڑھ جاتا۔

بالآخر اسے مطلوبہ مکان مل ہی گیا۔ وہ دروازے پر پہنچا تو وہاں پندرہ' سولہ سال کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ فہد نے اس سے پوچھا۔

"مس صبا یہیں رہتی ہیں؟"

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر عجیب سی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ فہد کو الجھن محسوس ہوئی۔ اس نے پھر کہا۔

"مجھے مس صبا سے ملنا ہے۔"

لڑکا اندر چلا گیا۔ اسے گئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ فہد کو گھر کے اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ابھی وہ اس پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک اسی گھر کے دروازے سے ایک عورت نے ایک لڑکی کو بری طرح دھکا دے کر باہر پھینکا۔ وہ لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی فہد کے قدموں میں آگری۔

فہد گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ عورت اس لڑکی پر بری طرح چیخ چلا رہی تھی۔ گالیوں اور کوسنوں کا ایک طوفان تھا جو برس رہا تھا۔ اسی دوران اس کی آوازیں سن کر محلے کے کچھ لوگ بھی جمع ہوگئے تھے۔ ان میں ہر عمر کی عورتیں اور مرد شامل تھے۔

فہد جھکا۔ اس نے لڑکی کو کندھوں سے تھام کر اٹھایا۔ وہ لڑکی بری طرح رو رہی تھی۔ گرنے سے اس کی پیشانی زخمی ہوگئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔

فہد اسے پہچان گیا۔ وہ صبا تھی۔ اس کے جسم پر مزید کئی چوٹوں کے نشان بھی تھے۔ اس عورت نے اسے دھکا دینے سے پہلے غالباً" اس پر خاصا تشدد بھی کیا تھا۔

"بے غیرت' بے حیا! تو اسی کے لیے میرے بھائی سے شادی نہیں کر رہی تھی۔" عورت نے دانت پیس کر فہد کی طرف اشارہ کیا۔

فہد بوکھلا گیا۔ وہ ابھی تک صبا کو پکڑے کھڑا تھا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹائے۔ مجمع عجیب سی نظروں سے فہد کو دیکھ رہا تھا۔ فہد کو کچھ ملی جلی سی آوازیں سی سنائی دیں۔

"صورت سے تو بڑا شریف دکھتا ہے۔" فہد کا حلق خشک ہوگیا۔ اس نے بے بسی سے مجمع اور پھر اس عورت کی طرف دیکھا۔

"جانے جا اپنی سگی کو... میرے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔" اس عورت نے صبا کو دھکا دیا۔ اور گھر کا دروازہ بند کرنے لگی۔ صبا بجلی کی طرح اس کی طرف بڑھی۔

"خدا کے لیے اماں! ایسا نہ کرو... رحم کرو مجھ پر... اماں! مجھے نہ نکالو۔" وہ اس عورت کی ٹانگوں سے لپٹ گئی مگر اس عورت نے اسے پھر اتنے زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور ماتھے پر ایک اور کٹ لگ گیا۔ وہ چکرا کر گری اور ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگئی۔

"پرے مر۔" اسے ایک موٹی سی گالی دے کر اس عورت نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ فہد کی برداشت بس اتنی ہی تھی۔

"یہ... یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" اس کی آواز پر سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس عورت کا ہاتھ بھی رک گیا۔

"دیکھا میں کہتی تھی نا' یہ آوارہ' بدچلن... کہیں نہ کہیں منہ کالا کر کے آئی ہے' اب دیکھ لیا نا سب نے... اپنی آنکھوں سے... آگیا اس کا سگا۔" وہ عورت تقریر کرنے والے انداز میں جیسے پورے مجمع سے خطاب فرما رہی تھی۔

فہد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

"محترمہ! اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھیں... یہ نہ ہو کہ..." فہد کا غصے سے برا حال تھا۔ خوامخواہ یہ عورت صبا کو اس کے ساتھ نتھی کر رہی تھی۔ اس نے پھر ایک نظر صبا کو دیکھا۔

"میری برداشت ختم ہو جائے گی۔"

"برداشت تو میری ختم ہو چکی ہے... لے جاؤ اب اپنی اس...!" اس مرتبہ موٹی سی ایک اور گالی اس لڑکی

نصیب نہ ہی۔

''بس...'' فہد زور سے چلایا۔

''خبردار! اب ایک لفظ بھی اور کہا!'' اس نے انگلی اٹھا کر اسے خبردار کیا تو وہ عورت جو پہلے ہی اس کے حلیے سے مرعوب تھی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

''اور تم لوگ؟ صرف تماشا دیکھنے کے لیے آئے ہو؟ کوئی روکتا کیوں نہیں انہیں...؟ انسانیت نام کی کوئی چیز ہے تم لوگوں میں یا نہیں؟ لیکن نہیں... تم لوگ تو انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں ہو' بے حس... اونہہ!'' اس نے مڑ کر پورے مجمع کو لتاڑا تو لوگ الٹا اس پر چڑھ دوڑے۔

''تم اس طرح ایک لڑکی کی عزت سے نہیں کھیل سکتے۔'' ایک بزرگ گرجے۔ ''اگر جان عزیز ہے تو اس سے ابھی نکاح کرو۔'' فہد بوکھلا گیا۔ عجیب جاہل لوگ تھے کوئی اسے سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

''جی... ی... ی...'' اس نے ایک بے بس سی نظر بے ہوش پڑی صبا پر ڈالی۔ وہ ہوش میں ہوتی تو ان کی غلط فہمی دور بھی کرتی۔

''ہاں' ہاں! تم سمجھتے ہو اس لڑکی کا کوئی نہیں ہے تو تم جو چاہے کر سکتے ہو۔ نکاح تو تمہیں ابھی اور اسی وقت کرنا ہو گا۔'' ایک اور آواز آئی۔

''م... مگر میں تو انہیں جانتا تک نہیں۔'' اس نے کمزور سی صدائے احتجاج بلند کی۔

''جانتا نہیں تو اس کے گھر کیوں آیا تھا؟ میں نے تجھے خود اس کے دروازے پر کھڑا دیکھا ہے۔ بول! کیوں آیا تھا؟''

ایک جوشیلے نوجوان نے فہد کو کالر سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو فہد کے ہاتھوں سے صبا کا والٹ گر گیا۔ گرنے کے ساتھ ہی والٹ کھل گیا اور صبا کا شناختی کارڈ باہر جھانکنے لگا۔ اب یہ فہد کی بد قسمتی ہی تھی کہ شناختی کارڈ کا جو حصہ باہر آیا تھا اس پر صبا کی تصویر جگمگا رہی تھی۔ نوجوان نے فہد کا گریبان چھوڑ دیا۔ اس نے جھک کر شناختی کارڈ اٹھایا اور صبا کی تصویر اس کی

انھوں نے اسے ہر[...] بولا۔

''اب بھی کہو گے۔ اسے نہیں جانتے؟''

''وہ... میں یہ ہی تو... واپس کرنے آیا تھا۔'' ہکلانے لگا۔

''اور یہ تیرے پاس جادو سے چل کر تھا۔'' نوجوان نے پھر شناختی کارڈ لہرایا۔

''اب شرافت سے نکاح کر لے ورنہ اپنے قد پر چل کے جانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

فہد کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ نکاح کے انتظا[...] ہونے لگے۔ اسی دوران صبا کو ہوش آ گیا تھا' مگر [...] نے اس کا احتجاج بھی نہیں سنا۔ ناچار دونوں کو نکل[...] ہی پڑا۔

صرف تین گھنٹے گزرے تھے اور اس کی زندگی[...] کیسے پلٹا کھایا تھا کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا تھا' اس[...] کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح کے حالات [...] کے ساتھ پیش آ سکتے ہیں... صبا سے نکاح تو اس[...] کر لیا تھا مگر اس کے آگے کا اس نے نہیں سوچا تھا۔

آتے وقت وہ اکیلا تھا اور جاتے وقت...

اس نے ایک نظر اسے دیکھا جو رخ موڑے با[...] دیکھ رہی تھی' کون کہہ سکتا تھا کہ گاڑی میں سفر کر[...] یہ وجود کسی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ اجنبیوں کی طرح تھے۔ وہ اسے لے کر سیدھا ایک پرائیویٹ اسپتال میں گیا۔

''ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' صبا نے پوچھا اور پہلی بات تھی جو اس نے اس سے کی تھی۔ وہ گا[...] سے اترتے اترتے رک گیا۔ پھر دوسری طرف آ کر اسے سہارا دے کر اتارتے ہوئے بولا۔

''کیونکہ محترمہ! فی الحال آپ کے لیے یہی سوٹ ایبل ہے اس کے بعد کہیں اور کا سوچ[...] گے۔'' آخر میں اس کا لہجہ خود بخود شریر سا ہو گیا جس[...] وہ خود بھی حیران تھا۔

اس پرائیویٹ اسپتال میں اس کا ڈاکٹر ہونا کام [...] ورنہ صبا کو جتنی چوٹیں آئی تھیں' اچھا خاصا پو[...] کیس بن سکتا تھا اسے اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا[...]

مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں جب قاسم کی کال آئی۔

"بھائی! آپ کہاں ہیں؟" اور۔۔۔ آپ کہاں ہیں؟ کے جواب نے اسے پریشان کردیا' فوری طور پر اس نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ اس وقت کسی دوست کے ساتھ ہے۔

مگر اب ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے سامنے تھا صبا کی صورت میں۔۔۔

وہ پریشانی کے عالم میں روم میں ہی ٹہلنے لگا۔

"آپ میری وجہ سے پریشان ہیں جی؟" صبا جو کافی دیر سے اسے ٹہلتا ہوا دیکھ رہی تھی پوچھ ہی بیٹھی۔

"ہوں؟" وہ چونکا۔

"نہیں تو۔۔۔ ہاں۔۔۔ نہیں وہ!" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ صبا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"دراصل میں۔۔۔" اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتادے۔

"میرے بارے میں تو تمہیں کچھ نہیں معلوم۔۔۔ ہم لوگ سات بھائی ہیں۔۔۔ ہماری مما کا انتقال کافی عرصہ پہلے ہوگیا تھا اور ڈیڈ نے ہمیں ماں اور باپ بن کر پالا ہے' ماشاء اللہ ہم سب بھائی ان ہی کی وجہ سے اپنی اپنی فیلڈز میں کامیاب ہوئے ہیں' میں خود ایک ڈاکٹر ہوں۔۔۔ ہم سب بھائی کوئی کام بھی ان کے علم میں لائے بغیر نہیں کرتے۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ "اور کجا یہ کہ شادی ہی کرلیں۔۔۔" اس نے اپنی پریشانی بتادی۔

"پھر اب؟" صبا نے پوچھا۔

"وہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔" صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی پیشانی مسلی۔

"میں آپ کو ایک مشورہ دوں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تو فہد سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

"اگر آپ مجھے کسی دارالامان میں چھوڑ آئیں' ابھی تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔۔۔ اور کسی کو معلوم ہوگا بھی نہیں۔۔۔!" وہ رک رک کر نظریں جھکا کر اپنی بات مکمل کررہی تھی۔

"جسٹ آمنٹ!" فہد نے اسے ٹوکا۔

"پلیز! اپنے ذہن سے یہ خیال تو نکال دو کہ تمہیں چھوڑ دوں گا۔۔۔ اب تم کو میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔ سو اس کے علاوہ اگر کوئی حل ہے تو بتاؤ!"

فہد کی اس بات پر وہ پوری آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی' اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اس شہزادے نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرلیا ہے وہ بھی بخوشی۔۔۔ اس لیے اس نے ایسا مشورہ دیا تھا مگر فہد کے جواب نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا' گویا شہزادے ابھی بھی اپنی بات نبھانے والے تھے۔

"ہیلو مسز! مانا کہ ہینڈسم ہوں مگر اتنا ہوں کہ میری اپنی مسز ہی مجھے دیکھ کر کھو جائے' یہ مجھے آج پتا چلا ہے۔" فہد نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو اس کی بات پر صبا جھینپ گئی۔

"اوکے مسز! پھر کل ملتے ہیں!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

✲ ✲ ✲

"دو دن رہ گئے ہیں رمضان آنے میں۔۔۔ اور تم نے کوئی تیاری ہی نہیں کی۔" عمیر نے کہا۔ اس وقت وہ لاؤنج میں تھے' عمیر پیاز کاٹ رہا تھا' عاصم لہسن چھیل رہا تھا جبکہ شہریار آلو چھیل رہا تھا۔

"اس رمضان کی کون سی تیاری کی جاتی ہے؟ تیاری تو عید کی ہوتی ہے۔" عذیر نے حیرت سے کہا۔

"سب لوگ کرتے ہیں۔۔۔ ہم کیوں نہیں کرتے پھر؟" وہی مرغی کی ایک ٹانگ کی مانند عمیر نے اپنا سوال دہرایا مگر ذرا گھما کر۔۔۔ ساتھ ہی اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"او بھائی میرے کون سی تیاری کرنی ہے رمضان کی۔" شہریار نے اکتا کر پوچھا۔

"السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے بھئی!" فہد لاؤنج میں داخل ہوا تو وہ تینوں اسے گھور کر رہ گئے۔

"کہاں تھے اتنی دیر سے؟ آج تو جلدی فری تھا نا تمہیں؟" شہریار نے پوچھا۔

"ایک کام نکل آیا تھا' اس لیے دیر ہوئی۔" اس نے جواب دیا اور صوفے پہ ڈھیر ہوگیا۔

"تمہیں یاد ہے کہ آج سالن بنانے کی باری تمہاری تھی؟" آفاق نے پوچھا۔

"او! میں بالکل بھول گیا تھا۔۔۔ سو سوری!" اب جاکر اس نے دیکھا کہ وہ کیا کام کررہے ہیں اور ساتھ ہی اسے پیاز کی جلن آنکھوں میں محسوس ہوئی۔

"قاسم نے تمہیں کال بھی کی تھی!" عمیر نے کہا۔

"ہاں آئی تھی کال!۔۔۔ یار! یہ پیاز تو کچن میں ہی کاٹا کرو!" فہد نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو جاکر خود کاٹ لو نا!" اس نے فوراً چھری رکھ دی تو فہد نے منہ بنالیا۔

"میں جب بھی رمضان کی تیاری بات کرتا ہوں ہمیشہ سب موضوع چینج کردیتے ہیں!" عمیر نے دہائی دی۔

"او یار! کون سی تیاری کی بات کررہے ہو' رمضان کی؟ کیا تیاری کرنی ہے' کس قسم کی؟" فہد نے پوچھا۔

"بھئی! جیسے سب کرتے ہیں' گھر صاف کرتے ہیں' کچھ چیزیں بنا کر فریز کرتے ہیں تاکہ رمضان کے ماہ مبارک میں زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزار سکیں!" ان سب بھائیوں کی سب سے اچھی عادت یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی روزہ خور نہیں تھا' عاصم اور شہریار تھوڑا نخرے کرتے تھے مگر روزے چھوڑتے نہیں تھے۔

"یہ اچانک تمہیں کہاں سے ایسا خیال آیا ہے؟" عذیر سے یہ بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔

"وہ میں اس دن حماد کے گھر گیا تھا تو اس کی امی کہہ رہی تھیں!" اس نے بتایا۔

"اوہ! تو تمہیں وہاں سے یہ خیال آیا؟ اچھا تو وہ کیا کیا بنا کر فریز کررہی تھیں؟" شہریار نے پوچھا۔

"سموسے کباب اور بھی بہت کچھ!"

"ہوں!" وہ سب سوچنے لگے جبکہ فہد آلو لہسن اور پیاز اٹھا کر کچن کی طرف چلا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم بھی رمضان کی تیاری کرتے ہیں۔" آفاق نے بولنے میں پہل کی۔

"کل تو چھٹی ہی ہے اور پرسوں خود چھٹی کرتے ہیں اور ان دو دنوں میں ہم سے جو تیاری ہوسکی' وہ کرتے ہیں۔" عذیر نے بھی بھائی کی بات سے اتفاق کیا تھا۔



اگلے دن عمیر اور شہریار بازار گئے' رمضان کی خریداری کے لیے' ان کے پیچھے باقی بھائیوں نے مل کر گھر کی صفائی ستھرائی اور دھلائی کی' پورے قصر لائلہ کی تفصیلی صفائی کی گئی۔ شیراز صاحب اپنے بیٹوں کا جوش و خروش دیکھ کر خوش تھے اور بساط بھر ان کی مدد اور بھرپور حوصلہ افزائی بھی کررہے تھے۔ پانچ چھ گھنٹے لگا کر شہریار اور عمیر واپس آئے تو لدے پھندے تھے۔

"اف! میرا خیال ہے کہ اب کھانے پکانے والا کام کل پر ہی چھوڑ دیا جائے۔" عمیر نے کہا۔ وہ سب اب فریش ہوکر شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"ہوں!" فہد نے تائید کی۔

"بس کل صرف کچن کا کام ہی ہوگا' سب مل کر کریں گے تو جلدی ختم ہوجائے گا۔"

"یار! قسم سے یہ زنانہ قسم کے کام کرکرکے تنگ آگیا ہوں میں تو۔" شہریار نے منہ بنایا۔

"سچی! یہ عورتوں والے کام کرکر کے میں تو خود کو عورت ہی سمجھنے لگا ہوں!"

اور اس وقت فہد کو یاد آیا کہ ایک عدد لڑکی کو وہ بھی اسپتال چھوڑ کر آیا ہوا ہے اور جسے وہ کل شام سے بھولا ہوا ہے۔

"بھائی! املی والی چٹنی بھی بنائیں گے نا؟" اتنی دیر سے خاموش عاصم نے سوال کیا۔

"املی کی چٹنی؟" عذیر نے پوچھا۔

"ہاں نا! مجھے بہت پسند ہے' پلیز بنالیں گے نا!"

"لیکن!" اس نے سب کی طرف دیکھا۔ "ہمیں تو

بنانی ہی نہیں آتی!"

"پھر؟" عاصم نے سوالیہ نظروں سے اپنے بھائیوں کی طرف دیکھا۔

"یار! کسی سے ریسیپی معلوم کرلیتے ہیں نا!" شہریار نے تجویز پیش کی۔

"ہوں!" فہد کو اب اسپتال جانے کی جلدی تھی۔ سو وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

انسان چاہے ساری دنیا بھول جائے مگر اپنی بیوی' وہ بھی نئی نویلی' اگر پرانی ہو تو پھر بھی کوئی بات ہے' مگر نئی بیوی کو کیسے بھول سکتا ہے مگر ڈاکٹر فہد صاحب کچھ ایسے ہی واقع ہوئے تھے اور ابھی ابھی اسے یاد آیا تھا کہ وہ اسے صرف تین کپڑوں میں لایا تھا اور ان کپڑوں کی حالت بھی بہت خراب تھی۔ کم از کم اسے اس کی ضروریات کا خیال تو رکھنا چاہیے تھا' یہی سوچ کر اس نے گاڑی پہلے مارکیٹ کی طرف موڑلی' کپڑے' جوتے' میک اپ' برش اور بھی بہت سی ضروریات کی اشیاء خرید کر وہ اسپتال پہنچا۔

"آئی ایم رئیلی سوری! بالکل ہی بھول گیا تھا۔" کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا۔ وہ کل کی نسبت آج بہتر لگ رہی تھی' دھلے دھلائے منہ کے ساتھ شاید ایسے ہی ہاتھ مار کر بال بھی ٹھیک کیے تھے۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

"یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں!" اس نے سارے شاپر ایک طرف رکھ دیے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس کی آواز میں نمی تھی۔ فہد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا؟ تم رو تی رہی ہو؟"

"آپ بھول گئے اور میں آپ کا انتظار کرتی رہی۔" وہ رو پڑی فہد بوکھلا گیا۔

"صبا! آئم رئیلی سوری' ایکچوئلی آج...." وہ بتاتے بتاتے رک گیا کہ آج پورا دن اس نے کیا کیا ہے۔ جالے اتارے تھے' پنکھے صاف کیے' گملے صاف کیے' ٹیرس دھویا....

"وہ آج میں تھوڑا بزی تھا.... جیسے ہی فری' یہاں آگیا۔" وہ وضاحتیں دے رہا تھا۔ کسی روتی ہوئی لڑکی کو چپ کروانے کا اس کا پہلا تجربہ تھا لہٰذا وہ بری طرح بوکھلایا ہوا تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے....

"دیکھو پلیز! چپ ہوجاؤ!" فہد کی درخواست کو نظر انداز کرکے اس نے اپنا رونا جاری رکھا۔

"پلیز.... چپ ہوجاؤ ورنہ...." ورنہ کی دھمکی کام کرگئی' اس نے سر اٹھا کر دیکھا مگر آنسو پھر بھی بہہ رہے تھے۔

"ورنہ میں بھی رونے لگوں گا!" فہد کی شکل واقعی رونے والی ہوگئی تھی اور اس کی بات سن کر وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی۔

"اوکے! اب میں چلتا ہوں! کل آؤں گا' ہوسکتا ہے کل تمہیں ڈسچارج کردیا جائے.... اللہ حافظ!" دروازے تک جا کر وہ پھر پلٹا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"جی!" صبا پریشان ہوگئی کہ نجانے کیا پوچھنے جارہا ہے۔

"وہ...." وہ کان کھجانے لگا.... "تمہیں املی کی چٹنی بنانی آتی ہے؟"

"جی؟"

"ہاں وہ...." اب وہ اسے کیا بتاتا۔

"آتی تو ہے لیکن۔" اس عجیب سوال پر وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی.... کہ اس وقت سرتاج کو بطور خاص املی کی چٹنی کیوں یاد آئی!

"او ویری گڈ!" وہ خوش ہو کر بولا۔ "ایک پیپر پر لکھ دو!" کہنے کے ساتھ ہی اس نے پیپر کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں لیکن وہ ہوتا تو ملتا نا! کچھ سوچنے کے بعد اس نے موبائل اسے پکڑا دیا۔

"یہ لو.... تم ساری ترکیب تفصیل سے بولتی جاؤ' اس میں ریکارڈ ہوجائے گی۔"

"مگر!" وہ اس انوکھے تقاضے پر ابھی تک حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"مسز! ایک تو تم اگر مگر بہت کرتی ہو.... پلیز.... جلدی سے شروع ہوجاؤ!"

پھر صبا نے ساری ترکیب ریکارڈ کردی۔ بیچ بیچ میں وہ سوال بھی کرتا رہا اور وہ جواب دیتی رہی۔

"چلو عاصم صاحب کا مسئلہ تو حل ہوا!" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"او خدا کے بندے! بس کردے' بس کردے' چھینک چھینک کر میرا برا حال ہوگیا۔ مگر تیرا مصالحہ بن کر نہیں دیا۔" شہریار نے عمیر کو لتاڑا۔

قصرلائلہ کے کچن میں اس وقت رونق لگی ہوئی تھی' ڈاکٹر فہد صاحب سبزیاں کاٹتے ہوئے ان کی افادیت پر خاصا بور قسم کا لیکچر دے رہے تھے اور قاسم' عاصم کو نہ چاہتے ہوئے بھی سننا پڑ رہا تھا کیونکہ وہ تینوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے' آفاق کہنی تک آستینیں فولڈ کیے ہوئے چکن دھو کر رکھ رہا تھا جبکہ شہریار سارے پیس الگ الگ پیکٹوں میں رکھ کر فریزر میں رکھتا جارہا تھا۔ عزیر بیسن چھان کر رکھ رہا تھا۔ جبکہ عمیر رولز کی فلنگ بنا رہا تھا جو تیاری کے تقریباً آخری مرحلے میں تھی' وہ کافی دفعہ چیک کرچکا تھا مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی کمی نکل ہی آتی تھی۔

"بھائی! میری چٹنی۔" عاصم نے اسے یاد دلایا۔

"چٹنی بھی بن جائے گی یار.... پہلے یہ کام تو ختم ہوجائے.... " فہد نے اسے دلاسا دیا.... اور ساتھ ہی اسے چٹنی والی بھی یاد آئی۔

"اوہ! آج تو اس نے ڈسچارج ہونا تھا!" اس نے سوچا۔

"اوہ! شٹ!" اس نے سر پر ہاتھ مار کر کہا تو باقی سارے اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"کیا ہوا؟" آفاق نے پوچھا۔

"بھلکڑ صاحب کو پھر کوئی کام یاد آگیا ہوگا۔" شہریار نے ازراہ مذاق کہا۔

"کسی پیشنٹ کو بھول گئے ہوں گے۔" قاسم نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ (مسٹر پھانکتے ہوئے کہا۔)

"اوہ ہاں! مجھے ابھی جانا ہوگا۔" اس نے فوراً سبزیاں چھوڑیں اور ہاتھ دھونے لگا۔

"بھائی! میری چٹنی!" عاصم نے یاد دلایا۔

"آکر بنادوں گا تمہاری چٹنی!" اس کے اس جملے پر سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جبکہ عاصم منہ بنا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال سے ڈسچارج کروا کے وہ اسے ایک گرلز ہاسٹل میں لے گیا کیونکہ فی الوقت اسے یہی بات سوجھی تھی اور صبا کے لیے مناسب ترین ٹھکانہ بھی یہی لگا تھا۔ اسے ہاسٹل میں داخل کروا کے وہ اپنے تئیں بہت بڑی ذمہ داری سے نجات حاصل کرچکا تھا' وہ خود تو مطمئن ہوگیا تھا جبکہ صبا کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت گھبرائی ہوئی ہے۔

"ارے یار گھبرا کیوں رہی ہو' میں ہر ہفتہ آیا کروں گا تم سے ملنے اور موقع دیکھ کر میں ڈیڈی سے بھی بات کرتا ہوں' پریشان ہونے کی ضرورت بالکل بھی نہیں۔ اوکے' ٹیک کیئر!" وہ ہاتھ ہلاتا ہوا واپس چلا گیا اور وہ وہیں کھڑی سوچتی رہی کہ نجانے اب وہ اسے یاد رہے گی بھی یا نہیں.... عجیب چھلاوا سا بندہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی! یہ کیا کررہے ہیں؟" فہد کچن میں اکیلا ہی مصروف تھا' جب عاصم نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی' مگر وہ کانوں میں ایئر فونز لگائے خلا میں گھور رہا تھا اور ساتھ ساتھ کبھی سامنے رکھی چیزوں کو غور سے دیکھنے لگتا....

"بھائی!" اس نے فہد کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"تم! تم کب آئے!" وہ چونک گیا۔

"یہ آپ کیا کررہے ہیں؟"

"یہ!" فہد نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنے ہاتھوں کو جو پورے کے پورے املی کے رس سے سنے

ہوئے تھے۔

"یہ میں تمہارے لیے املی کی چٹنی بنا رہا ہوں۔۔۔" اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر خود اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"بھائی! یہ اتنے گندے طریقے سے بنتی ہے؟" عاصم نے برا سا منہ بنایا۔

"جیسے بھی بنتی ہو' تم چلے جاؤ اندر' جب بن جائے گی تو آجانا۔" فہد نے اسے وہاں سے ٹالا اور املی کے ملغوبے کو چھوڑ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا' کچھ دیر دیکھنے کے بعد اس نے اپنی ایک انگلی کو زبان سے چکھا۔۔۔

"ہوں۔۔۔ناٹ بیڈ!" اس نے اپنی ساری انگلیاں ہی چاٹ ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی کے پارکنگ ایریا میں صرف ایک گاڑی کی جگہ بچی تھی۔۔۔ آج کوئی سیمینار تھا لہٰذا کافی سارے باہر کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔

آمنے سامنے سے آنے والی دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے بالکل قریب رکیں ایک گاڑی میں ایک لڑکی تھی جبکہ دوسری گاڑی میں عمیر اور عذیر تھے۔ لڑکی نے ہارن بجا کر انہیں گاڑی پیچھے کرنے کے لیے کہا۔

"اوئے! یہ تو وہی ہے جو اس دن لائبریری میں ملی تھی۔" عذیر نے کہا۔ اس کا ہارن سننے کے بجائے وہ دونوں اپنی گفتگو میں لگے ہوئے تھے۔

"اور تجھ سے اپنے ڈیپارٹمنٹ کا پوچھ رہی تھی؟" عمیر نے اسے گھورا۔

"ہاں!" عذیر نے اس کے گھورنے کی پرواہ کیے بغیر سر ہلا دیا۔

"ابے گھامڑ! یہی تو مجھ سے لائبریری کا پوچھنے آئی تھی!" عمیر غصے سے بولا۔

"مسٹر! اگر آپ کو گاڑی میں سونے کا شوق ہے تو یہ شوق کہیں اور جا کر بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔۔۔ پلیز یہاں سے گاڑی ہٹائیں' میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

باتوں باتوں میں انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ لڑکی گاڑی سے اتر کر ان کے سر پر پہنچ چکی تھی' اس نے شیشہ بجایا تو وہ چونکے۔

"تو محترمہ! آپ اپنی گاڑی ذرا پیچھے کریں کہ ہم اپنی گاڑی پارک کر کے آپ کو راستہ دے دیں۔۔۔ ویسے سائیڈ سے آپ کی گاڑی آرام سے گزر سکتی ہے!"

عمیر مزے سے بولا۔

"مجھے راستہ نہیں چاہیے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"تو کیا دل چاہیے؟ یوں کھڑے کھڑے؟" عمیر نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ عذیر نے عمیر کو اس بکواس پر گھورا۔

"واٹ؟ دماغ درست ہے آپ کا؟" وہ لڑکی اچھل ہی پڑی۔

"کیوں آپ کو ٹھیک کرنا آتا ہے؟" عمیر چہکا اور عذیر کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی اس کا دماغ درست کر دے گی کیونکہ اس لڑکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"جی ہاں! بہت اچھی طرح۔۔۔ اور آپ جیسوں کا تو میں فری میں ہی درست کر دیتی ہوں۔"

"آں ہاں!"

"ایڈیٹ! راستہ دو' مجھے گاڑی پارک کرنی ہے!"

"اے ہیلو میڈم! ایڈیٹ کسے بولا؟" عمیر کو بھی غصہ آگیا۔

"کام ڈاون یار!" عذیر نے عمیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا رہنے کے لیے کہا۔

"ایڈیٹ کو ایڈیٹ نہیں کہوں گی تو اور کیا کہوں گی؟" اتنے میں ایک اور جگہ سے گاڑی نکلی تو وہاں جگہ خالی ہو گئی۔

"چل ادھر پارک کر لیتے ہیں۔" عذیر نے کہا کہ عمیر نے ایک غصیلی نظر اس لڑکی پر ڈالی اور آندھی طوفان کی طرح گاڑی اس کے قریب سے لے گیا لڑکی اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"یو ایڈیٹ!" اس نے چلا کر کہا۔

☼ ☼ ☼

"میرا دل کر رہا ہے اس کی گردن مروڑ دوں!" عمر

آکر بھی عمیر کو سکون نہیں مل رہا تھا۔

"تو مروڑ دینی تھی نا!" قاسم نے روزے سے نڈھال ہوتے ہوئے کہا۔ منہ پر کشن رکھ کر وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیند پھر بھی نہیں آرہی تھی۔

"بس بیٹا بس! اتنی انرجی ویسٹ نہ کریں، ہوتا آپ سے کچھ نہیں..... صرف باتیں نہ کیا کریں۔" عذیر نے جلتی پر تیل ڈالا تھا۔

"تم پھاپھا کٹنے! تم ہی نے کہا تھا نا کام ڈاون۔"

"اور تو ہوگیا؟ شاباش، قربان جاؤں تیری فرمانبرداری کے۔"

"اب مجھے وہ ملی نا پھر دیکھنا!" عمیر نے لب بھینچتے ہوئے کہا۔

"کیا کرے گا اس کے پاؤں پڑ جائے گا؟"

"میرا اس وقت تمہارے ساتھ لڑنے کا کوئی موڈ نہیں، اس لیے چپ کر جاؤ، ویسے بھی میں روزے سے ہوں!"

"اچھا تو اس سے لڑنے کا موڈ ہے؟" عذیر صاحب آج زیادہ ہی چہک رہے تھے۔ عمیر نے کشن اٹھا کر اسے مارا اور اوپر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

دو ہفتوں بعد اسے یاد آیا کہ وہ صبا سے ہر ہفتے آنے کا وعدہ کر کے آیا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ کسی دن آپ مجھے ہی بھول جائیں گے کہ صبا نام کی کوئی لڑکی بھی تھی۔"

یہ فہد کے دوستانہ رویے کا کمال تھا جو اس کے منہ سے ایسا شکوہ نکلا تھا۔ ورنہ پہلے دن تو وہ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ فہد کے مخاطب کرنے پر بھی بمشکل جواب دے پاتی کجا اس طرح شکوے شکایت کرنا.....

"ارے بھئی! بھولا تھوڑی تھا، بس ذہن سے نکل گیا تھا۔" انوکھی ہی وضاحت تھی وہ مسکرا دی۔

"اپنی مسز کو کون بھول سکتا ہے۔"

"وہ آپ سے ایک بات کہنی تھی!" وہ کچھ دیر بعد جھجک کر بولی۔

"وہ میں یہاں سارا دن فارغ بیٹھ بیٹھ کر بور ہو جاتی ہوں، یہاں تقریباً" سب لڑکیاں اپنے اپنے کام پر چلی جاتی ہیں۔" وہ رک گئی۔

"ہوں!" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

"تو اگر آپ اجازت دیں تو میں..... میں بھی کوئی جاب کر لوں!" اس نے بہت ... جھجکتے ہوئے اٹک اٹک کر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

"اگر تم سمجھتی ہو کہ جاب کرنے سے تمہارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اسے ابھی تک اس کی "اجازت" لینے والی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیونکہ گھر میں کبھی ایسا ماحول دیکھا ہی نہیں تھا سو اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے اسپیشلی اجازت لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے۔

"وہ... آپ میرے ہزبینڈ ہیں، سو آپ سے ہی تو اجازت لینی تھی!"

"اوکے، اوکے کر لو، مگر کرو گی کہاں؟" فہد کے مان جانے پر صبا کا چہرہ کھل اٹھا۔

"وہ میری روم میٹ ہے، وہاں اس کے اسکول میں ایک ٹیچر کی ضرورت ہے، وہاں!" وہ خوشی خوشی بتانے لگی۔

"ٹھیک! جب تک ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تب تک کر لو۔"

☼ ☼ ☼

وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جا رہا تھا کہ ایک لڑکی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"اوہ!" عذیر اس لڑکی کو پہچان گیا تھا، کچھ دیر پہلے عمیر بھی یہاں سے ہی گزرا تھا اگر یہ اس سے ٹکرا جاتی تو.....

"شکر!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا مگر لڑکی کے چہرے پر شناسائی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

اب وہ جدھر ہوتا، وہ لڑکی بھی ادھر ہو جاتی، کافی دیر یہی ہوتا رہا تو عذیر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

"پہلے آپ چلی جائیں!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تھینکس!" وہ کہہ کر نیچے اترنے لگی۔

"ایکسکیوزمی!" عذیر نے اسے روکا، وہ پلٹی۔

"آج گھر جا کر شکرانے کے نفل ادا کر لیجیے گا۔"

"وہ کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ایکچوئیلی! چند لمحے پہلے یہاں سے میرا بھائی بھی گزر کر گیا ہے۔ جس کی آپ نے اس دن بستی (بے عزتی) کر دی تھی۔ سو اب وہ آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

"لیکن میں نے کب؟" وہ آنکھوں میں حیرانی لیے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ارے! آپ کی یادداشت کافی کمزور ہے۔" لڑکی نے اسے گھورا۔

"اس دن جب آپ اپنی گاڑی پارک..... " وہ یاد دلانے لگا۔

"اوہاں! یاد آگیا۔" وہ اچانک بول پڑی..... حالانکہ اس کے چہرے کے تاثرات اس کے برعکس تھے۔

"تو غلطی بھی آپ کے بھائی ہی کی تھی۔ ایک تو پہلے ہی مجھے دیر ہو گئی تھی اور اوپر سے انہوں نے فضول باتیں شروع کر دی تھیں..... اوکے آئی ہیو ٹو گو ناؤ۔" وہ پلٹی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

"عجیب لڑکی ہے، اس دن کیسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی اور آج..... خیر مجھے کیا۔" وہ پھر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔

"ویسے آج کافی اچھی لگ رہی تھی۔" اس نے سوچا۔

☼ ☼ ☼

رمضان میں سب سے بڑا مسئلہ سحری میں اٹھنے کا تھا۔ باقی سب تو آرام سے اٹھ جاتے تھے مگر عذیر اور شہریار نے سب کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہر پانچ منٹ بعد کوئی نہ کوئی انہیں جگانے آجاتا تھا۔ اور ہر کسی کو وہ پانچ منٹ کے لیے ٹال دیتے۔

آخر کار قاسم کے دماغ نے ہی کام کیا۔ اس نے اپنے سیل میں سائرن والی ٹون ڈاون لوڈ کی۔ اب وہ آدھا گھنٹہ پہلے ہی وہ ٹون لگاتا اور وہ دونوں بند آنکھوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہوتے۔

آج افطاری بنانے کی ذمہ داری شہریار کی تھی۔ روزانہ کچھ سامان بازار سے آتا تھا۔ مگر آج شہریار صاحب سارا کا سارا سامان ہی بازار کا اٹھا لائے تھے۔

"اف..... میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے ہیں۔" بازار سے سامان خرید کر اور اسے کچن تک پہنچانے میں ہی اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنا شروع ہو گئے تھے۔

"بیٹا جی! جب ہم یہ سب بناتے ہیں تو کھاتے ہوئے تمہاری آنکھوں کے آگے تارے نہیں ناچتے؟" آفاق جو ابھی ابھی شاور لے کر آیا تھا بولا۔ گرمیوں کے روزوں نے ویسے ہی سب کی مت ماری ہوئی تھی۔

"یار! قسم سے نازک مزاجی میں تو تو عورتوں کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔" فہد جو ٹی وی دیکھ رہا تھا، نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ویسے آپ کی بیگم کا کیا ہوگا؟" عمیر بولا تو فہد گڑبڑا گیا۔ مگر وہ شہریار سے مخاطب تھا۔

"ہائے! وہ آئے تو سہی۔" شہریار نے آہ بھری۔

"ہاں آئے اور پھر کہے یا اللہ! میرے لیے یہی نمونہ رہ گیا تھا۔" وہ عمیر ہی کیا جو آگے سے جواب نہ دے۔

"تم تو چپ ہی رہو میرے سدا کے دشمن۔"

"میرے سپنوں کی رانی کب آئے گی تو۔" وہ آنکھیں بند کر کے گنگنانے لگا۔

☼ ☼ ☼

"ہم لوگ لائبریری میں ہی ہوں گے۔ تم وہیں آجانا۔" عمیر نے عذیر سے کہا۔ جو اسائنمنٹ لے کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بھاگا تھا۔ وہ لوگ ابھی دروازے سے داخل ہونے ہی والے تھے کہ لڑکیوں کا

ایک گروپ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ عمیر کا ایک دوست سعد اس گروپ کی ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔

"او... ایم ساری!" سعد نے فوراً معذرت کرلی۔ حالانکہ غلطی اس لڑکی کی ہی تھی۔

"اوہ! اٹس!" وہ لڑکی ابھی بولنے ہی لگی تھی کہ ان کے گروپ کی ایک دوسری لڑکی بول پڑی۔

"واٹ سوری؟ ہاں! تم لوگوں کا تو کام ہی..." عمیر کے دماغ میں جیسے جھماکہ سا ہوا "ارے یہ تو وہی ہے۔"

"ہم لوگ تو جو بھی ہیں محترمہ... ذرا اپنا حدود اربعہ بتانا پسند کریں گی؟ ہر کسی سے خوامخواہ فری ہونے کی کوشش کرتی رہتی ہیں... شاید ہابی ہے آپ کی۔" جن بے چاروں کی ٹکر ہوئی تھی' وہ آپس کی معذرت اور بات بھول کر ان دونوں کو خاموش کروانے میں لگ گئے۔

"تم سے فری ہونے کی کوشش... مائی فٹ... شکل دیکھی ہے اپنی... سڑے ہوئے بینگن۔"

"اور تم؟ تم کیا ہو؟ کیڑا لگی بھنڈی۔"

عذیر اسائنمنٹ جمع کروا کر واپس بھی آگیا تھا۔ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے لائبریری کے دروازے کے باہر ایک ہجوم دیکھا۔

"یہ یہاں کون سی کانفرنس ہو رہی ہے۔" وہ حیران ہوتا ہوا آگے بڑھا۔

"تم... تمہاری ہمت... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی؟" وہ لڑکی غصے سے لال' پیلی ہو رہی تھی۔

"اس میں ہمت کی کون سی بات ہے۔ ذرا سی زبان ہی ہلانی تھی۔" عمیر شاید دل کی بھڑاس نکال چکا تھا۔ سو اب اسے زچ کر رہا تھا اور وہ... اس کی آنکھیں... اس لڑکی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عمیر کے ساتھ کیا کر ڈالے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" عذیر نے آگے بڑھ کر عمیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کچھ نہیں یار! یہ عادت سے مجبور ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کندھے اچکا کر بولا۔

"میں... میں عادت سے مجبور ہوں یا..." وہ پھر شروع ہو گئی۔

"پلیز! بس بات ختم کریں... کافی تماشا ہو چکا ہے۔" اس نے عمیر کا ہاتھ پکڑا اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

"توبہ! لڑکی ہے یا پٹاخہ!" سعد تھوڑا آگے جا کر بولا تھا۔

"ایٹم بم ہے پوری!" عمیر ہنسا۔

"لیکن اس دن تو۔" عذیر نے الجھ کر سوچا۔

"ویسے عمیر کی شکل بھی تو ایسی ہے۔ ہاہاہا۔ لیکن میری کون سی الگ ہے۔" وہ دل ہی دل میں ہنسا۔

☼ ☼ ☼

اگلی دفعہ وہ واقعی ایک ہفتے بعد اس سے ملنے پہنچ گیا تھا۔

"اب آپ کی یادداشت کچھ کچھ بہتر ہوتی جا رہی ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔

"بس دیکھ لو! میں نے کہا تھا نا کہ اپنی مسز کو کون بھول سکتا ہے؟" وہ گڑبڑا کر بولا تھا۔ کیونکہ یہ تو اس کا ایک دوست اپنی مسز کی بھاری شاپنگ کی ڈیمانڈ کا رونا نہ روتا تو اسے یاد ہی نہ آتا کہ وہ بھی ایک عدد مسز رکھتا ہے اور پھر فوراً ہی اسے یاد آیا کہ اس نے صبا سے ہفتے کے ہفتے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو وہ اب اس کے سامنے تھا۔

"اور کیسا گزر رہا ہے وقت؟ جاب سے مطمئن ہو؟" اس نے بات برائے بات کی تھی۔

اور آگے سے وہ مکمل اور بھرپور جواب دینے لگی۔ ایک ایک تفصیل کے ساتھ۔ شاید پورے ہفتے کی باتیں جمع کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے پوری توجہ کے ساتھ اسے سن رہا تھا۔ جو بات کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو بھی ہلا ہلا کر بتا رہی تھی اور اس کی آنکھیں... اس کے تاثرات کی مکمل عکاسی کر رہی تھیں۔

آتے ہوئے وہ اسے کافی ساری رقم دے کر آیا۔ تاکہ وہ صرف اپنی تنخواہ ہی کی محتاج نہ رہے۔

☼ ☼ ☼

"یار! ہم لوگ عید کی تیاری کب کریں گے؟" عمیر بولا۔

اپنے اپنے حصے کے کام نپٹا کر وہ اب افطاری کے بعد لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شیراز صاحب اپنے ایک دوست کی طرف جا چکے تھے۔ جبکہ وہ سب چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تراویح کے لیے سب اکٹھے ہی جاتے تھے۔ اگر ایک بھی افطاری کے بعد بیڈ روم میں گھس جاتا تو وہ پھر سحری کے وقت ہی نکلتا تھا۔

"ہائیں!" شہریار اچھل پڑا۔

"کیا کہا تم نے؟ عذیر ذرا اس کی کمپنی چیک کر' پہلے اسے رمضان شریف کی تیاری کرنی تھی اور اب بیسویں روزے کو ہی عید کی تیاری یاد آگئی... عمیر صاحب... سب کچھ ٹھیک ہے نا؟" اس نے مشکوک نظروں سے عمیر کو گھورا۔

"ایک تو تم بھی' ہر بات کا الٹا مطلب لے لیتے ہو۔" عمیر کو چند لمحے ہی لگتے تھے غصے میں آنے کے لیے۔

"تو تم باتیں ہی ایسی کرتے ہو' بندہ شک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"آفاق بھائی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ عید کی شاپنگ کب کریں گے؟" شہریار کی طرف سے رخ موڑ کر وہ اب آفاق کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیوں؟" آفاق نے پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا؟ کرنی تو ہے ہی' پھر جلدی جلدی کرتے ہیں نا! اچھا لگے گا نا' سب اکٹھے ساتھ جائیں گے۔"

"اہم اہم... کیوں بھئی... بچیوں کی جان لینے کا ارادہ ہے۔ سارے شہزادے اکٹھے نکل پڑے تو..." قاسم نے کہا تو سب نے قہقہہ لگایا۔

"ویل سیڈ قاسم!"

"یار! مجھے بتاؤ' تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟" عذیر نے اس سے پوچھا۔

"اس دفعہ یہ سب..."

"بس میں چاہتا ہوں کہ ہمارے گھر بھی ویسی ہی تیاریاں ہوں جیسے سعد وغیرہ کے گھر ہوتی ہیں۔ بازاروں کے چکر' کبھی دوپٹے رنگوانا' کبھی لیسیں وغیرہ کے کلرز' پھر چوڑیاں' مہندی..." ابھی وہ بول ہی رہا تھا کہ شہریار پھر بول پڑا۔

"دیکھا! میں نے کہا تھا نا کہ اس کی کمپنی چیک کرو' مجھے بتاؤ ذرا کہ یہ سعد نے کب سے دوپٹا لینا شروع کر دیا ہے اور یہ چوڑیاں' مہندی... آر یو کریزی؟"

"اور تمہیں اس گھر میں ایسی کوئی مخلوق نظر آتی ہے جو یہ سب چیزیں یوز کرے؟" عذیر نے کہا۔

"تم تو بس!" عمیر نے منہ بنا لیا۔

"عمیر! بی سیریس! تم خود بتاؤ' ہمارے گھر میں یہ سب پہننے والا ہے کون' جو ہم یہ لاتے پھریں؟" آفاق نے پوچھا تو اس نے سر جھکا لیا۔

"تو ہم اپنی شاپنگ..." اسے پھر یاد آیا۔

"وہ ہم چاند رات کو ہی کریں گے۔ اگر پہلے کرلی تو عید کا جو تھوڑا بہت احساس ہوتا ہے نا' وہ بھی جاتا رہے گا۔" آفاق نے کہا تو وہ کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب کچھ تم پہنو گی؟" فہد حیرت سے کبھی اسے اور کبھی وزیٹر روم کے ٹیبل اور صوفے پر دھری چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

"نہیں! محلے والوں کو' بلکہ پورے ہاسٹل کو پہناؤں گی۔" وہ خفگی سے بولی۔

"ظاہر ہے میں لائی ہوں تو میں ہی پہنوں گی نا۔" وہ اتنے شوق سے اپنی عید کی شاپنگ اسے دکھانے کے لیے لائی تھی۔ مگر وہ بجائے تعریف کرنے کے الٹا حیران ہو رہا تھا۔

"مگر مسز! اتنی ساری۔" اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ہلکے سے کام والا انار کلی فراک' جیولری' سینڈل'

مہندی' چوڑیاں اور نہ جانے کیا کیا الا بلا تھا۔
"اتنی ساری کہاں ہیں۔" اس نے منہ بنالیا۔
"صرف ایک دن کی شاپنگ ہے۔ پہلے دن کی۔ باقی دونوں کے لیے تو میں نے پلین سوٹ ہی لیے ہیں۔ آپ آئیں گے نا عید کے دن؟"
"صرف ایک دن" فہد کی آنکھیں حیرت سے کھلی "او مائی گڈنیس' او کے ضرور آؤں گا یہ دیکھنے کے لیے کہ تم ان سب چیزوں کو کیسے اپنے اوپر لادو گی۔" فہد نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اف عمیر جو اس دن بات کر رہا تھا۔ چوڑیاں' مہندی... اگر اسے پتا چل جائے تو؟" اس نے سوچا۔
"نہ جانے ان لوگوں کو کیا ری ایکشن ہو گا' خاص طور پر ڈیڈی کا... عید کے بعد بات کروں گا۔"

☆ ☆ ☆

عمیر اور عاصم چاند رات کو اپنی شاپنگ کے لیے نکلے تھے۔ آفاق اور فہد اکٹھے جاتے تھے۔ بلکہ آفاق ہی ڈیڈی کے لیے بھی شاپنگ کر لیتا تھا۔ جبکہ باقی تینوں اکٹھے جاتے تھے۔
ہر کوئی مہنگائی کا رونا پورے سال روتا رہتا ہے۔ مگر عید تو بہرحال سب نے ہی منانی ہوتی ہے۔ سو سب ہی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق خریداری کرتے ہیں' اسی لیے چاند رات کو خاصا رش تھا۔ کچھ منچلے ایسے بھی تھے جن کو لینا تو کچھ نہیں تھا بس دوسروں کی شاپنگ اور موڈ خراب کرنے کے لیے بازاروں کا رخ کرتے تھے۔
وہ دونوں اپنی ہی دھن میں چلتے جا رہے تھے کہ کوئی بھرپور طریقے سے پہلے عاصم سے اور پھر عمیر سے ٹکرایا۔
"او ایم ساری بھیا!" ٹکرانے والا جلدی سے سنبھلا اور آگے بڑھنے ہی لگا جب عمیر نے اسے کالر سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔
"اب جا تا کدھر ہے۔" عمیر نے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔
"یہ... یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک لیڈیز بیگ بھی تھا۔
"بدتمیزی! وہ تو میں تمہیں ابھی بتاؤں گا... پہلے میرا والٹ نکالو!" عمیر نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔
"دیکھیے! آپ... مم مجھ پر خوامخوا... شک کر..." عمیر کے مکے نے اسے بات مکمل کرنے ہی نہیں دی۔ پھر عاصم اور عمیر نے اس کی دھلائی شروع کر دی۔ ان کے گرد مجمع اکٹھا ہونا شروع ہو گیا۔ مگر انہوں نے اپنا والٹ بھی نکلوایا اور دوسروں کے بھی... اور ساتھ ہی وہ بیگ بھی دے دیا۔
"بھاگ جا! اگر اب نظر آیا نا۔" وہ آدمی معافی مانگتا ہوا لوگوں میں گم ہو گیا اور ساتھ ہی مجمع بھی چھٹ گیا۔
"اب ان کا کیا کرنا ہے بھائی۔" عاصم کا اشارہ ان بٹوؤں کی طرف تھا جو اس آدمی کی جیب سے نکلے تھے اور تعداد میں آٹھ تھے۔
"ڈھونڈتے ہیں یار! یہیں کہیں سے اڑائے ہوں گے سب۔" عمیر والٹ چیک کرنے لگا۔
"اور یہ بیگ۔" عاصم نے اس کی توجہ بیگ کی طرف دلائی جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔
"اوہ!" عمیر نے بیگ عاصم کے ہاتھ سے لے لیا۔ "اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔" ساتھ ہی بیگ کھول کر دیکھنے لگا۔
"نہ جانے کس آنٹی کا ہو گا۔" بیگ میں آئی ڈی کارڈ پڑا ہوا تھا۔ اس کا منہ کھل گیا۔
"اوہ تو یہ... فائزہ!" آئی ڈی کارڈ پر لگی تصویر اسے اپنا منہ چڑاتی محسوس ہوئی۔
"بھائی! آپ جانتے ہیں انہیں۔" عاصم نے پوچھا۔
"ہاں یار... یونیورسٹی فیلو ہے۔" عمیر نے بتایا تو عاصم معنی خیز انداز میں مسکرایا۔
"اوئے! یہ تو کس خوشی میں دانت نکال رہا ہے؟" اس نے اس کی گردن پکڑی۔
"ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ جنگلی بلی تو ہر وقت پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ ابھی تم خود دیکھ لینا اگر یہ ملی تو... توبہ۔" وہ کہہ کر ایک سمت بڑھنے لگا۔
"تو ابھی کدھر جا رہے ہیں؟" عاصم اس کے پیچھے لپکا۔
"سیکورٹی کیبن کی طرف... وہاں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان وغیرہ کروا دیتے ہیں۔" عمیر نے کہا تو عاصم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ اسے وہ نظر آ گئی۔ ایک سیکورٹی آفیسر پر چلاتی ہوئی۔
"اف! یہ بندی... ہر وقت غصے میں رہتی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "کبھی تو یہ مسکرا کر بات کرے۔"
"آپ لوگوں کا کام کیا ہے یہاں؟ ہاں؟ چور اچکے آپ کی نظروں کے سامنے لوگوں کو لوٹ کر لے جاتے ہیں اور آپ یہاں... ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آپ سے تو..." اچھا خاصا مجمع اکٹھا کیا ہوا تھا اس نے اپنے ارد گرد۔
"ایکسکیوز می مس!" اس کی آواز پر اس کی چلتی زبان کو بریک لگ گئے۔
"یہ بیگ شاید..." عمیر کے بیگ آگے کرنے کی دیر تھی' اس نے جھپٹ کر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
"یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گیا؟" اس نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔
"ہاں بھئی! شیر جوان ذرا بتا تا یہ بیگ تمہارے پاس کیا کر رہا ہے؟" کانسٹیبل کی جان میں جان آئی تھی۔ مجرم خود چل کر جو آ گیا تھا۔
"ارے! یہ تو لینے کے دینے پڑ گئے۔" وہ ہڑبڑایا۔
"دیکھیے!" وہ بولنے لگا تو کانسٹیبل نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔
"دیکھ تو ہم خود ہی لیں گے۔"
"اف یہاں تو نیکی کرنا بھی... اب اگر باقی والٹ بھی نکل آئے تو... اونو۔"
"دیکھیے مسٹر۔" عمیر نے جھٹکا دے کر اپنا آپ چھڑایا۔
"یہ بیگ مجھے..." اس نے ساری بات بتا دی اور ساتھ ہی باقی والٹ بھی نکال کر سامنے رکھ دیے۔ اتنے میں دوسرے آفیسرز بھی آ گئے تو بات سنبھل گئی اور وہ لوگ والٹ لے کر واپس کیبن کی طرف مڑ گئے۔
"بھائی! آج تو آپ بال بال بچے ہیں۔" عاصم جو کب سے خاموش تماشائی کی طرح کھڑا تھا بول پڑا۔
"ہاں یار! واقعی! یہ نیکی تو گلے ہی پڑنے والی تھی۔" وہ دونوں آگے بڑھے تو اس نے انہیں آواز دے کر روکا۔
"ایکسکیوز می مسٹر!" عمیر فوراً پلٹ کر بولا۔
"مسٹر عمیر! اور یہ چھوٹا بھائی عاصم ہے۔" عمیر نے لگے ہاتھوں تعارف بھی کروا دیا۔
"نائس ٹو میٹ یو۔" وہ عاصم کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "اینڈ تھینک یو سو مچ عمیر۔" یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گئی اور عمیر جیسے سکتے میں آ گیا۔
"آہم بھائی! وہ چلی گئی ہیں۔" عاصم نے اسے ٹہوکا دیا۔
"ویسے لڑکی بری نہیں ہے اگر غصہ نہ کرے تو۔" اس نے سوچا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے کہا تھا نا کہ آپ بھول جائیں گے۔ بھول گئے نا مجھے؟" وہ رخ موڑے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی اور فہد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میڈیسن کی اتنی موٹی موٹی کتابیں وہ کیسے یاد کر لیتا تھا۔
"پورا دن میں نے آپ کا انتظار کیا۔ اگر نہیں آنا تھا تو کہہ دیتے' دیکھ لیجیے گا' اسی طرح آپ مجھے بھول جائیں گے۔" وہ بیٹھی روتی رہی اور فہد کے پاس کہنے کے لیے ایک لفظ تک نہیں تھا۔ آخر وہ کہتا تو کیا کہتا؟
ڈیڈی سے بات کرنا اسے بھول ہی جاتا تھا... جب وہ سامنے نہیں ہوتی وہ واقعی اسے بھولا رہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

بہت عرصے بعد وہ سب رات کے کھانے پر جمع

ہوئے تھے۔ ورنہ کبھی فہد کی ڈیوٹی ہوتی تو کبھی شہریار کا کوئی پروجیکٹ یا پھر شیراز صاحب یا آفاق کی کوئی میٹنگ ہوتی تھی۔

"ہاں بھئی بچو!" انہوں نے اچانک سب کو مخاطب کیا' تو قاسم اپنے آگے پیچھے دیکھنے لگا۔

"ڈیڈی! بچے کہاں ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"گدھے! تم ہو بچے میرے۔" انہوں نے کہا تو سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"لیکن ڈیڈی! اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔" قاسم نے اس عزت افزائی پر منہ بسورا۔

"یہی تو میں کہنے والا تھا۔ مگر تم اپنی چونچ بند کرو تو!" اس کے ہر بات کے بیچ میں بولنے کی اس عادت پر وہ سب ہی نالاں تھے۔ مگر قاسم صاحب بھی اپنے نام کے ایک ہی تھے۔

"ہاں بھئی! تو میں کہہ رہا تھا کہ اب تم لوگ بڑے ہوگئے ہو اور مجھے لگتا ہے کہ عورت کا وجود اس گھر کے لیے ناگزیر ہوگیا ہے۔" فہد کے کان کھڑے ہوگئے۔ مگر نظریں جھک گئیں۔

"آہم آہم!" اب کے شہریار کو کھانسی ہوئی۔ فہد نے فوراً" اس کی کمر سہلائی۔ مگر چند لمحوں بعد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ کھانسی مصنوعی تھی۔

"تو ڈیڈی۔" عمیر نے محتاط انداز میں بات شروع کی۔ "یہ خیال آپ کو پہلے کیوں نہیں آیا جب ہم چھوٹے تھے؟"

"کیونکہ اس وقت تم لوگ چھوٹے تھے۔" انہوں نے فوراً" کہا۔

"اوکے! ڈیڈی جیسے آپ چاہیں۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔" آفاق نے کہا جو کافی دیر سے خاموش تھا اور شیراز صاحب کا دل باغ باغ ہوگیا۔

"جی ڈیڈ! آپ ہماری طرف سے بالکل فکر نہ کریں اور آپ جس سے چاہیں شادی کرلیں۔" شہریار نے بھی سنجیدگی سے کہا تو شیراز صاحب کو اچھو لگ گیا۔

"واٹ؟" وہ زور سے چلائے' مگر انہیں اور کھانسی ہوئی۔ آفاق نے فوراً" انہیں پانی ڈال کر دیا۔

"ڈیڈی! بالکل.... شہریار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہماری طرف سے آپ...." عذیر نے ابھی بولنا شروع ہی کیا تھا کہ شیراز صاحب دھاڑے۔

"ابے گدھو! نالائقو! مجھے شادی کرنی ہوتی تو اس وقت ہی کرلیتا' جب تم چھوٹے تھے۔"

"کوئی بات نہیں ڈیڈی... آپ یہی سمجھ لیں کہ ہم چھوٹے ہیں تو پرابلم۔" عمیر نے فوراً" کہا۔

"تو پرابلم کے بچے۔" شیراز صاحب کا منہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

"میں اپنی نہیں' آفاق کی شادی کی بات کررہا ہوں۔" ان کی بات پر سب کو سانپ سونگھ گیا اور کچھ لمحوں بعد جب سب کو ہوش آیا تو ڈائننگ روم میں ہلچل مچ گئی۔

"یاہو!" عمیر نے نعرہ لگایا جبکہ شہریار کرسی پر چڑھ کر ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر ڈانس کرنے لگا۔ عذیر' فہد' قاسم اور عاصم اس کا ساتھ دینے لگے۔

" دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا
امڑی دے دل تا سہارا نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا "

آفاق ابھی تک حیران پریشان بیٹھا ہوا تھا۔

"بس کرو بس! آرام سے بیٹھ کر کھانا کھالو۔" کافی دیر انتظار کرتے رہنے کے بعد شیراز صاحب کو انہیں ٹوکنا پڑا تو سب آرام سے اپنی اپنی پوزیشن پر واپس آگئے۔

"مگر ڈیڈ۔" فہد نے سنجیدگی سے کہا۔

"شادی کے لیے ایک عدد لڑکی کا ہونا ضروری ہے۔" اس کی بات پر شیراز صاحب کچھ دیر آفاق کو جانچتی نظروں سے دیکھتے رہے۔ جو فہد کے سوال پر ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"لڑکی ہے تو سہی۔" ان کے اتنا ہی کہنے پر سب نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"اچھا کون ہے؟"

"کیسی ہے؟"

"کہاں ہوتی ہے؟"

اور عاصم کا معصوم مگر معقول سوال "بھابھی کا نام کیا ہے؟"

"آفاق کے چہرے سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ ان تمام سوالوں کے جواب جاننے کے لیے بے تاب ہے۔"

"اس کا نام ضوفشاں ہے' وہ تمہاری مما کے ہی آبائی گاؤں میں رہتی ہے اور تمہارے ماموں کی سالی یعنی اپنی نانی کے پاس رہتی ہے' تمہاری مما کی بھتیجی ہے اور کچھ؟"

"ڈیڈی! وہ گاؤں میں..." شہریار کو حیرت ہوئی۔

"آفاق بھائی کی دلہن گاؤں سے لائیں گے؟" قاسم نے شہریار کی بات مکمل کردی۔

"بالکل! کیوں گاؤں میں انسان نہیں رہتے؟"

"مگر آفاق اور وہ..." شہریار نے کہا تو آفاق وہاں سے اٹھ کر چلا گیا' جب کہ فہد سوچ رہا تھا کہ یہ ضوفشاں تو پھر ان کی کزن ہے اس پر بھی اتنے اعتراض ہو رہے ہیں تو صبا؟

"بھائی کو کیا ہوا ہے؟" قاسم نے پوچھا۔

"بھائی کو شرم آرہی ہے' مشرقی لڑکے ہیں ناں!" عذیر نے اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے ایکٹنگ کی۔

شیراز صاحب تھوڑے پریشان ہوگئے' حالانکہ انہیں اندازہ تھا کہ آفاق کچھ ایسا ہی رد عمل ظاہر کرے گا مگر... وہ جس طرح بن کچھ کہے اٹھ کر گیا تھا۔ وہ اس کے لیے کافی فکر مند ہو چکے تھے' لہٰذا کھانے کے بعد جب سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تو وہ آفاق کے کمرے میں چلے آئے۔

وہ کمپیوٹر آن کیے بیٹھا تھا۔ نظریں تو اس کی کمپیوٹر پر تھیں مگر سوچ کا پنچھی کسی اور ہی جہاں کی سیر کر رہا تھا۔

"میں اندر سکتا ہوں؟ کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہے؟" انہوں نے دروازے پر دستک دے کر پوچھا تو وہ چونکا اور پھر فوراً کھڑا ہوگیا۔

"آیئے ناں ڈیڈی! اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" وہ شرمندہ ہوگیا۔

"ایسے ہی!" وہ آگے بڑھے۔ "جب اولاد جوان ہوجائے تو والدین کو بھی محتاط ہوجانا چاہیے کچھ بھی کرنے یا کہنے سے پہلے اولاد سے پوچھ لینا چاہیے۔"

"ڈیڈی! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ پلیز!" وہ شیراز صاحب کی باتوں سے شرمندہ ہو رہا تھا۔

"بات یہ ہے آفاق بیٹا! یہ رشتہ تمہاری مما نے اپنی زندگی میں طے کیا تھا۔ تمہاری مما اور تمہارے ماموں بس دو ہی بہن بھائی تھے' جب ضوفشاں پیدا ہوئی تو اسی وقت لائبہ نے اسے تمہارے نام کی انگوٹھی پہنا دی تاکہ دونوں بہن بھائی کا رشتہ اور مضبوط ہوجائے مگر پھر تمہارے ماموں اور مامی کی ڈیتھ کے بعد ضوفشاں اور اس کی چھوٹی بہن اپنی نانی کے پاس رہنے لگیں' لائبہ نے بہت کوشش کی کہ وہ ہمارے گھر رہیں مگر تمہاری مامی بھی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی سو انہوں نے اپنی بہن کی نشانیوں کو اپنے پاس رکھنا چاہا' جب تک لائبہ زندہ رہی' وہ ان سے ملنے جاتی رہی مگر اس کی وفات کے بعد... میں یہ ذمہ داری نہ نبھا سکا میں نے یہ سب تمہیں پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ میں نے سوچا کہ بچپن کی باتیں کس نے یاد رکھی ہوں گی۔ لیکن دو دن پہلے ضوفشاں کی نانی کا پیغام مجھے ملا تھا' جس میں انہوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت اور ضوفشاں کی طرف سے فکر مندی کا اظہار کیا تھا اور یہ بھی کہ اب وقت آگیا ہے کہ امانت حق دار تک پہنچ جانی چاہیے۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئے۔

"لیکن ڈیڈی! وہ گاؤں کی..." آفاق کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"بیٹا! تمہاری مما بھی گاؤں کی ہی تھیں مگر شہر کی بہت سی لڑکیوں سے بہت اچھی بیوی اور ماں تھیں۔ خیر! اگر تمہیں اعتراض ہے تو میں ان کو منع کردیتا ہوں' میں تو بس تمہاری ماں کے خیال سے..." شاید وہ واقعی مایوس ہوگئے تھے۔

"زندگی تو تمہیں ہی گزارنی ہے ناں' جو تم مناسب سمجھو!" وہ واپس جانے کے لیے مڑے۔

"ایک منٹ ڈیڈی!" آفاق کی پکار پر انہوں نے اپنے لبوں کی مسکراہٹ دبالی۔

"مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے' ان فیکٹ مما کا بھی۔ لیکن مجھے تھوڑا ٹائم چاہیے ہوگا ایڈجسٹ کرنے کے لیے' باقی آپ جو بھی کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں!" آفاق نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی تو شیراز صاحب نے فوراً" آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

"آئی نو مائی سن! تم کبھی میرا سر نیچا نہیں کرو گے۔"

☼ ☼ ☼

آفاق کی شادی کے لیے انہیں چھٹیاں لینی تھیں' عذیر آج بڑے عرصے بعد اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی طرف آیا تھا۔ یہاں اس کا ایک دوست ہوتا تھا۔ جسے آفاق کی شادی کا کارڈ بھی دینا تھا۔ شادی ویسے تو گاؤں میں ہونی تھی مگر ولیمہ کا فنکشن انہیں شہر میں ہی کرنا تھا۔

اسے سیڑھیوں سے اترتی ہوئی وہ نظر آئی' جیسے ہی اس نے اس کی طرف دیکھا اور ادھر اس کا پاؤں مڑ گیا۔ اس سے پہلے وہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھکتی' وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچا اور اسے سنبھال لیا' وہ بچ تو گئی مگر اب اس سے پاؤں پر وزن نہیں ڈالا جا رہا تھا سو وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"اوہ! آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" یہ تو وہ جانتا تھا کہ اسے چوٹ آئی ہوگی۔ عذیر نے اس کے ہاتھ سے پھسلنے والی تمام چیزیں اکٹھی کیں۔ اس نے جواب دینے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آئی تھنک! پاؤں میں موچ آگئی ہے!" وہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو صاف دیکھ سکتا تھا یہ آنسو اسے ڈسٹرب کر رہے تھے۔

"آیئے! میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں!" اس نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلایا مگر وہ نظر انداز کر گئی۔

"نہیں! میں ٹھیک ہوں!" وہ بمشکل بولی۔

"خاک ٹھیک ہیں آپ؟ آپ سے چلا تک تو جا نہیں رہا' پھر یہ سیڑھیاں کیسے اتریں گی؟" عذیر نے جل کر کہا اور پھر ایک ہاتھ سے اس نے اس کی کتابیں پکڑیں اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا' وہ لڑکی غصے سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"غصہ بعد میں کر لیجیے گا مس؟"

"فائزہ!" وہ ناگواری سے بولی۔

"جی مس فائزہ! یہ غصہ تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے ابھی آپ ڈاکٹر کے پاس چلیں ورنہ آپ کا پاؤں غبارہ بن جائے گا۔" عذیر اس کی توجہ اس کے سوجتے ہوئے پاؤں کی طرف دلائی۔

پھر اسے سیڑھیوں کے پاس کھڑا کر کے خود گاڑی لینے چلا گیا۔

جب وہ واپس آیا تو وہ اچھی خاصی رو چکی تھی اور ساتھ شاید اپنی بہن کو کال کر کے اپنے جانے کا بتا رہی تھی۔ وہ اسے لے کر فہد کے اسپتال چلا آیا۔

"ارے عذیر! تم؟" اسے دیکھ کر فہد حیران ہوا۔

"فائزہ! یہ میرے بھائی ہیں اور فہد! یہ میری یونیورسٹی فیلو فائزہ ہیں ان کے پاؤں میں شاید موچ آگئی ہے' تم ذرا چیک کرلو۔" فہد نے ایک نرس کے ساتھ فائزہ کو دوسرے روم میں بھجوا دیا۔

"اہم! صرف یونیورسٹی فیلو ہے یا..." فہد معنی خیز انداز میں بولا۔

"فی الحال!" اس نے جھینپ کر مسکرا کر جواب دیا۔

"آں ہاں! یعنی کہ آگے کا معاملہ مشکوک ہے؟" فہد کے کہنے پر عذیر نے قہقہہ لگایا۔

"کہہ سکتے ہیں۔"

ڈریسنگ وغیرہ کے بعد وہ اسے گھر بھی چھوڑ آیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح ان کی روانگی تھی اور پھر اس سے اگلے دن بارات اور ساتھ ہی واپسی۔

اگلے دن صبح سویرے تین گاڑیوں کا قافلہ گاؤں کی طرف روانہ ہوا' سب سے اگلی گاڑی میں آفاق اور شیراز صاحب تھے اور ساتھ ہی سب کا سامان وغیرہ تھا'

WWW.PAKSOCIETY.COM

جبکہ دوسری گاڑی میں فہد کے ساتھ عاصم اور قاسم تھے اور تیسری میں شہریار کے ساتھ عمیر اور عذیر۔

فہد نے آفاق سے کہا بھی تھا کہ وہ ڈرائیو کر لیتا ہے' اسے خود یوں ڈرائیو کر کے نہیں جانا چاہیے لیکن اس نے منع کر دیا۔

"ابھی کون سا بارات لے کر جا رہے ہیں۔"

ابھی انہیں لڑکی کے چھوٹے ماموں کے ہاں رہنا تھا' پھر اگلے دن باقاعدہ بارات لے کر جانی تھی' حالانکہ آفاق نے کہا بھی تھا کہ بس سادگی سے نکاح کر لیتے ہیں مگر ان لوگوں نے وہ شور مچایا کہ اس نے اپنی بات دہرائی تک نہیں' اور اس وقت بے اختیار ہی اپنا نکاح یاد آیا تھا۔

"مجھے لگ رہا ہے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں!"

تینوں گاڑیاں آگے پیچھے گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکی تھیں' قاسم اور عاصم حیرت اور اشتیاق سے ارد گرد پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کو دیکھ رہے تھے۔

"ہم لوگ بھابھی کو لینے جا رہے ہیں' مجھے یقین نہیں آ رہا۔" قاسم بولا تو فہد کو بھی یک دم یاد آیا کہ ان کی ایک عدد بھابھی کو اپنی تمام مصروفیات میں وہ بھلا چکا ہے۔

"او شٹ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا ہوا بھائی!" قاسم نے چونک کر پوچھا۔

"آں... کچھ نہیں!" وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"اف! کتنا اڈیٹ ہوں میں... کم از کم اسے موبائل ہی لے دیتا تاکہ رابطے میں آسانی رہتی' اب واپس جا کر ہی بتا سکوں گا' ہاسٹل کا نمبر لینے کی زحمت بھی نہیں کی میں نے' صحیح کہتی ہے وہ' حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔" وہ سوچ رہا تھا کیونکہ اس وقت وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ آخر کار مطلوبہ گاؤں پہنچ ہی گئے' وہاں پر ان کا پرتپاک استقبال ہوا تھا۔ گاؤں کے وسط میں دو بڑی بڑی حویلیاں بنی ہوئی تھیں' جن میں سے ایک میں ان سب کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ دونوں حویلیاں ایک قدرے کم اونچائی والی دیوار سے الگ کی گئی تھیں۔ شیراز صاحب تو یہاں آ کر یہاں کے ہی رنگ میں رنگ چکے تھے نجانے کن بچھڑے ہوؤں سے ملاقاتیں کرتے پھر رہے تھے' ان لوگوں کو کافی دیر تک گاؤں کے لڑکے کمپنی دیتے رہے پھر آہستہ آہستہ سب ان کے آرام کے خیال سے اٹھ کر چلے گئے۔

"ہائے اللہ! اتنے سارے گبھرو جوان!" ایک چہکتی ہوئی آواز پر ان سب نے مڑ کر دیکھا تو وہ بے چاری اپنا جملہ ہی مکمل کرنا بھول گئی اور غڑاپ سے دیوار کے پار گم ہو گئی۔ وہ سب صحن میں ڈالی گئی چارپائیوں پر محفل لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں ابھی معلوم ہوا تھا کہ ساتھ والی حویلی لڑکی والوں کی ہے' اور یہ حویلی بھی لڑکی کے چھوٹے ماموں کی تھی ویسے تو دونوں حویلیوں کے داخلی دروازے کافی دور تھے مگر گھر والوں نے آسان راستہ یعنی دیوار پھلانگ کر آنا جانا لگا رکھا تھا۔

"پتا نہیں یار! یہ سب کون سے زمانے کی باتیں کرتے ہیں کہ گاؤں میں بھی تعلیم آ گئی ہے' شعور آ گیا ہے' اب گاؤں گاؤں نہیں رہے مگر مجھے تو یہاں کوئی ایسا انقلاب نظر نہیں آ رہا۔ سب کے سب ویسے ہی جاہل ہیں' اَن مینرڈ...' شہریار نے تبصرہ کیا تھا اور بے لاگ کیا تھا' وہ اس وقت چارپائی پر نیم دراز تھا' فہد اور عمیر جس چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے' اس کا رخ دیوار ہی کی طرف تھا۔

"سی... مجھے نہیں نظر آ رہا' کون سا والا دولہا ہے؟" نسوانی آواز پر آفاق سمیت سب کے کان کھڑے ہوئے۔

"ارے نہیں بھئی! وہ والا نہیں ہو گا۔" نجانے وہ کس سے مخاطب تھی۔

"وہ جو لیٹا ہوا ہے' نکما؟" گو کہ یہ سب سرگوشیاں تھی مگر اتنی اونچی ضرور تھیں کہ ان سب تک آرام سے پہنچ رہی تھیں۔ شہریار اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"اس کی شکل دیکھی ہے؟ وہ کہاں سے لگتا ہے' اس کی تو شکل ہی دولہا والی نہیں۔ اتنا سڑیل لگتا ہے۔"

اب کے شہریار کے علاوہ باقی سب نے قہقہہ لگایا' البتہ شہریار کی شکل دیکھنے والی تھی۔

"کافی چہرہ شناس ہیں محترمہ!" فہد بولا تو شہریار ایک جھٹکے سے اٹھا اور دیوار کے پاس چلا گیا۔ ادھر محترمہ شہریار کو ادھر آتے دیکھ کر غروب ہونے کو تھیں کہ شہریار کی آواز نے اسے روک دیا۔

"محترمہ سنیے ذرا!"

"ج... جی!" وہ دوبارہ نظر آئی' اب صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" کسی نے دوسری طرف سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں ہوا' اطمینان رکھیے!" جواب شہریار نے دیا تو ادھر خاموشی چھا گئی' یہ لوگ بھی مڑ کر دیوار ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا طریقہ ہے میڈم؟"

"کون سا طریقہ؟" وہ اگر گھبرائی بھی تھی تو اپنے لہجے سے ذرا بھی ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔

"دوسروں کے گھروں میں جھانکنا!" شہریار نے کہا تو اس نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولے مگر شہریار کی اگلی بات نے اسے لب بھینچنے پہ مجبور کر دیا۔

"خیر! اس میں آپ کا بھی کوئی قصور نہیں' آپ کی تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں اخلاق و آداب کی کوئی ویلیو ہی نہیں' اب جاہلوں سے اس بات کی توقع کرنا تو..." اس لڑکی نے شہریار کی بات مکمل ہی نہیں ہونے دی تھی۔ انتہائی شائستہ انگلش میں بولی تھی۔

"ہیلو مسٹر! بہت بول چکے... اب ذرا میری بھی سن لیں... پہلی بات یہ میرا اپنا گھر ہے' اب وہ کھڑی ہو گئی تھی اور آدھی نظر آ رہی تھی۔

"اور دوسری بات... شہر میں رہ کر پڑھ لکھ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بات تو تب ہے جب انسان اندھیروں میں روشنی کی کرن بنے۔ گاؤں میں رہ کر اگر تم اپنے موجودہ اسٹیٹس تک پہنچتے تب تم پہ یہ بات سوٹ بھی کرتی ہنہ!" شہریار سمیت سب کے منہ کھل گئے تھے وہ دوسری طرف غائب ہو چکی تھی جبکہ وہ ابھی تک وہیں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا' اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ سب نہیں تھا۔

"اللہ خیر کرے! او بھائی! رنگ میں بھنگ نہ ڈالنا!" عذیر نے ہنستے ہوئے اس کے سکتے کو نشانہ بنایا۔

"ویسے آپ کا کیا خیال ہے چوہدری شہریار صاحب کافی سے بھی زیادہ نہیں ہو گئی؟" عمیر نے رائے لینے والے انداز میں پوچھا تو سب کی ہنسی نکل گئی۔ مگر شہریار غصے کے عالم میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔



"ڈیڈی! ہمیں بھی بھابھی کو دیکھنا ہے۔" شیراز صاحب جب شام کو سب سے مل ملا کر اور تمام انتظامات وغیرہ دیکھ کر واپس آئے تو وہ سب بھائی ان کے کمرے میں آن دھمکے۔

"تو دیکھ لو... میں نے منع تھوڑی کیا ہے؟" شیراز صاحب اطمینان سے نواڑی پلنگ پر لیٹتے ہوئے بولے۔

"مگر کیسے؟" قاسم نے پوچھا۔

"وہاں تو اچھی خاصی مخلوق جمع ہے' سولہ تو میں نے خود گنی تھیں۔" عمیر نے کہا۔ اسے دن والی گنتی یاد آ گئی تھی۔

"آج وہاں مہندی اور مایوں کی رسم ہے ناں اس لیے۔"

"واٹ؟" وہ سب کے سب اچھل پڑے۔

"ہمارے بغیر ہی مہندی ہو رہی ہے؟" شہریار بولا۔

"ہم یہاں بور ہو رہے ہیں اور وہاں مہندی چل رہی ہے۔ کمال ہے۔" قاسم نے کہا۔

"لیکن وہ تو لڑکیوں کا فنکشن ہے اور شاید وہ پسند نہ کریں۔" شیراز صاحب نے کہا تو قاسم اور عاصم کے منہ لٹک گئے۔

"ارے واہ! ایسے کیسے پسند نہ کریں گے؟" شہریار نے کہا۔

"بس ہمیں بھی فنکشن اٹینڈ کرنا ہے' ڈیڈی پلیز! آپ بات تو کریں ناں!" عمیر ضدی لہجے میں بولا۔

"اچھا' اچھا' چلو! میں دیکھتا ہوں پھر!" شیراز صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے تو وہ سب بھی کھڑے ہوگئے۔

"چلو! جلدی کرو۔ تیار ہوتے ہیں!" شہریار بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سب سے مخاطب ہوا۔

"ڈیڈی کو پوچھنے تو دو پہلے۔" فہد نے کہا۔

"اول تو وہ منع نہیں کریں گے اور دوسرا یہ کہ اگر منع کیا بھی تو' تو بھی میں ضرور جاؤں گا۔" اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے عمیر' عذیر اور قاسم کی طرف دیکھا۔

"ہم بھی جائیں گے۔" وہ تینوں بھی بولے۔

"تو پھر چلو!" وہ سب اپنے لیے مخصوص کیے گئے کمروں کی طرف بڑھ گئے اور آفاق کو بھی کھینچ کھانچ کر اٹھایا حالانکہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔

شیراز صاحب جب واپس آئے تو وہ لوگ تیار ہو کر برآمدے میں ہی ان کا انتظار کر رہے تھے۔

"تم لوگ تیار بھی ہوگئے؟" انہوں نے حیرت سے اپنے سپوتوں کو دیکھا۔

"اور تم بھی جاؤ گے؟" انہوں نے آفاق کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی ڈیڈی! بھائی اکیلے یہاں کیوں رہیں؟ ہم نے کہا' ہمارے ساتھ ہی چلیں۔" عذیر نے مزے سے جواب دیا تو شیراز صاحب نے پہلے عذیر کو اور پھر لاتعلق سے آفاق کو دیکھا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ آفاق کہیں نہیں جا رہا' تم لوگوں کی بات میں نے کرلی ہے۔"

ڈیڈی! آفاق کے جانے سے کیا ہو جائے گا؟ اچھا ہے ناں کمبائن مہندی ہو جائے گی۔" شہریار نے بھی آفاق کی طرف داری کی۔

"بیٹا جی! یہ گاؤں ہے' شہر نہیں... گو کہ ترقی یہاں بھی ہو چکی ہے مگر کچھ رسم و رواج ابھی بھی ویسے ہی ہیں جیسے صدیوں سے چلے آرہے ہیں!"

"اچھا اب ہم لوگ تو چلیں! یہ نہ ہو وہاں فنکشن ہی ختم ہو جائے۔" فہد نے کہا تو اتنی دیر میں ساتھ والی حویلی سے کچھ لڑکے انہیں لینے کے لیے آگئے۔

وہ جیسے ہی لڑکی والوں کے گھر میں داخل ہوئے دروازے کے ساتھ قطار میں کھڑی بچیوں اور بچیوں کی باجیوں نے ان پر پھولوں کی پتیوں کی بارش کردی' اکثریت نے اپنے منہ دوپٹوں کے پلوؤں سے چھپائے ہوئے تھے۔

وہ لوگ ادھر ادھر دیکھے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے' آگے جا کر کچھ آنٹی ٹائپ عورتوں نے انہیں گھیر لیا اور باری باری ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان سے اپنا اپنا تعارف کروانے لگیں۔ عمیر اور شہریار بار بار اپنے ہیئر اسٹائل کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے مگر.....

"وے نچھو! وے ادھر مر!" ایک عورت نے بڑھک ماری یا کم از کم ان کو اس عورت کا اس طرح بولنا بڑھک ہی لگا تھا۔

"ان منڈوں کو لے جا اماں کے پاس' سلام کر آئیں پھر واپس لے آنا۔" ایک حسینہ پراندہ لہراتی ہوئی آئی تھی۔ اب نجانے اس کا منہ ہی لال تھا یا پھر میک اپ زیادہ کیا ہوا تھا۔

"آئیں جی!" بے چاری یہ دو لفظ بول کر ہی دہری ہو رہی تھی۔

سب سے آگے وہ لڑکی تھی پھر فہد اور شہریار وغیرہ سب' پھر وہ لڑکی ایک دروازے کے آگے رک گئی اور دروازے پر دستک دیے بغیر اونچی آواز میں بولی۔

"اماں جی! شہر والے منڈے آئے نے۔" اندر سے شاید کوئی آواز آئی تھی یا نہیں مگر ان لوگوں کو سنائی نہیں دی۔

"جاؤ جی اندر!"

اندر کمرہ بالکل روایتی سا تھا جیسے عام طور پر بڑی بڑی حویلیوں میں ہوتا ہے' ایک پلنگ پر ایک بوڑھی سی عورت لیٹی ہوئی تھی مگر دیکھنے سے تو کہیں سے بھی بیمار نہیں لگ رہی تھی۔ یہ یقیناً "ان کے ماموں کی ساس اور بھابھی کی نانی تھی' کمرے میں ایک اور لڑکی بھی

موجود تھی جو رخ موڑے ایک ٹیبل پر نجانے کس کام میں مصروف تھی۔ ان کے اندر آنے پر صرف ایک لمحے کے لیے اس نے مڑ کر دیکھا تھا' یہ وہی لڑکی تھی جس نے دن کو شہریار کی اچھی خاصی عزت افزائی کی تھی۔ شہریار نے کینہ توز نظروں سے اسے گھورا مگر تب تک وہ رخ موڑ چکی تھی۔

"لو! دلہن تو یہ بنی ہوئی ہے!" نانی کو سلام کر کے وہ سب دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پیڑھوں پر بیٹھ گئے عمیر نے شہریار سے کہا وہ پہلے ہی اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے؟" فہد اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا' نانی قاسم اور عاصم کا انٹرویو لے رہی تھی جو انہیں ہر بات کا جواب بڑی تفصیل سے دے رہے تھے' عاصم بے چارہ تھوڑا کنفیوز بھی تھا مگر قاسم کا انداز ایسا تھا جیسے وہ نانی کی بچپن کی سہیلی ہو۔

"نیک خیال ہے۔ آپ ہاں کریں ڈیڈی کو ہم منا لیں گے۔" عذیر نے کہا تو فہد اچھل پڑا۔

"دماغ ٹھیک ہے؟ ہیں۔۔۔ میں اپنی نہیں' عمیر کی بات کر رہا تھا۔"

"مارو باجی!" اتنے میں دھماکے سے دروازہ کھلا' دو لڑکیاں گرتی پڑتی اندر آئیں منہ پر دوپٹے رکھے وہ بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کر رہی تھیں۔

"ہاں کیا بات ہے؟" وہ مڑی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ مہندی کا تھال سجا رہی تھی۔

"وہ بڑی تائی کہہ رہی ہیں کہ آپ آئیں گی یا نہیں' ضوفی باجی کی رسم کرنی ہے۔" وہ اتنا کہہ کر واپس بھاگیں۔

"ویسے میں بیمار تو نہیں تھی مگر یہ ان کی بڑی مامی نے ضوفی بے چاری کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور اس کی شادی اپنے آوارہ۔۔۔" نانی قاسم کو نجانے کون سا قصہ سنانے جا رہی تھیں جب مارو اچانک بول پڑی۔

"نانی! آپ باہر آئیں گی؟" اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ نانی کو اس قصے کو سنانے سے منع رکھنا چاہتی ہو۔

"نہیں! میں تو نہیں آسکتی نا۔۔۔ یہ گھٹنے۔۔۔ ہاں! ان لڑکوں کو لے جاؤ' یہ بے چارے کب سے یہاں بیٹھے میری کہانیاں سن رہے ہیں۔" نانی صاحبہ کو آخرکار ان کا خیال آہی گیا۔

"جی!" وہ سارے ایسے اٹھے جیسے اس قید سے رہائی ملنے پر شکر ادا کیا ہو اور واقعی ایسا ہی تھا۔

مارو نے مہندی کا تھال اٹھایا جس پر موم بتیاں روشن تھیں۔ موم بتیوں کی دھیمی دھیمی لو اس کے چہرے کو جگمگا رہی تھی۔ شہریار جو پہلے ہی اسے گھور رہا تھا اور بے خودی کے عالم میں اسے تکنے لگا۔

"آہم!" سب باہر نکل چکے تھے' جب عذیر اس کے قریب کھنکھار کر گیا تو وہ بھی جیسے ہوش میں آیا تھا۔

دلہن کو رسم کے لیے صحن میں لایا جا چکا تھا ایک بہت بڑا ہجوم تھا جو تقریباً" دلہن کے سر پر ہی چڑھا ہوا تھا اور اس میں اکثریت لڑکیوں ہی کی تھی۔ ان سب کو آتا دیکھ کر نجانے کیا کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی' تھوڑی تھوڑی دیر بعد قہقہے پڑتے تھے۔ وہ لڑکے ہو کر کنفیوز ہو رہے تھے۔

"غلطی کی یہاں آکر!" فہد بڑبڑایا۔

ان کے لیے وہاں کرسیاں منگوادی گئی تھیں' وہاں ان لوگوں کے علاوہ کوئی لڑکا نہیں تھا اس لیے وہ بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ رسمیں وغیرہ تقریباً" ہو چکی تھیں اب دلہن کے گرد لڑکیاں ہی تھیں۔

"ہم یہاں بیٹھنے کے لیے آئے ہیں؟" عذیر نے بے زاری سے کہا۔

"میرا تو یہی خیال ہے۔" فہد بولا۔

"کوئی نہیں۔" شہریار اٹھا۔

"چلو بھئی لڑکیو! ذرا پاسے پاسے ۔۔۔ ہو جاؤ' اب لڑکے والوں کی باری ہے۔" شہریار بلند آواز میں لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا تو سب لڑکیاں حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھنے لگیں' شاید اس کا پاسے پاسے ان سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ باقی بھائی بھی آکر شہریار کے ساتھ کھڑے ہو گئے تو لڑکیوں کو پاسے ہونا ہی پڑا۔ عاصم اور قاسم دلہن کے دائیں بائیں بیٹھ گئے' ایک طرف عمیر' عذیر کھڑے ہو گئے جبکہ دوسری طرف فہد تھا' شہریار پنجوں کے بل دلہن کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بھابھی! اتنا لمبا گھونگھٹ نکالا ہوا ہے' آپ کا سانس تو نہیں رک رہا؟" عاصم نے پوچھا تو بھابھی صاحبہ نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا پھر نفی میں۔

"تو تھوڑا سا اوپر کریں!" قاسم بولا اور ساتھ ہی آرام سے ضوفی کا دوپٹا سرکانے کی کوشش کی مگر شاید وہ فکس تھا۔

"ارے رے۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو؟" مارو صاحبہ کسی کونے کھدرے سے نکلیں۔

"بھابھی کا سانس رک رہا ہے' دوپٹا پیچھے کر رہا تھا۔" قاسم نے جواب دیا۔

"کوئی سانس نہیں رک رہا' مایوں کی دلہن کا چہرہ نہیں دکھاتے ورنہ روپ نہیں آتا۔" اس کا انداز بالکل تھانے داروں والا تھا۔

"اچھا جی!" شہریار نے آگے بڑھ کر گھونگھٹ ہی الٹ دیا۔ "ساری فضول کی بکواس ہے!"

"او!" مارو کا منہ کھل گیا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

لیکن وہ سب تو اپنی بھابھی کو دیکھ کر سکتے میں آگئے تھے۔

"ارے! اتنی چھوٹی سی بھابھی!" عمیر کے منہ سے نکلا' نازک سی ضوفشاں ان کے اندازوں کے بالکل برعکس تھی' وہ تو انجمن ٹائپ خوب توانا سی بھابھی کا تصور لے کر آئے تھے' مگر یہ گڑیا سی نازک ضوفی۔۔۔

"یہ۔۔۔ یہ بھابھی ہماری۔۔۔" فہد اٹک اٹک کر بولا۔

"صبا سے تھوڑی ہی بڑی ہوں گی یہ تو۔"

"کس سے بڑی!" قاسم کے کان کھڑے ہوئے مگر اس نے سنا ہی نہیں۔

"بھابھی! آپ ہماری بھابھی والی نہیں' بہن ہوں گی۔ ٹھیک؟" عذیر نے کہا۔

"اور میری تو آپی ہوں گی!" عاصم بولا۔

"آپی! آپ بھی کچھ بولیں نا!" قاسم نے کہا تو مارو پھر بول پڑی۔

"مایوں کی دلہن۔۔۔" مگر موبائل پر بزی شہریار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کو بولنا بھی منع ہوتا ہے کیا؟" شہریار کے اس طرح ٹوکنے پر وہ غصے سے اسے گھورنے لگی جبکہ ضوفی اتنی دیر میں پہلی دفعہ مسکرائی۔

"ارے واہ آپ تو ہنستی بھی ہیں!" عمیر کے کہنے پر وہ ہنس پڑی تو شہریار نے کھٹاک سے اس کی تصویر بنالی۔

"آپ کے "ان" کو دکھاؤں گا۔"

"دیکھیے مسٹر! میں کہہ رہی ہوں نا کہ مایوں کی دلہن۔" مارو نے غصے سے بولنا شروع کیا مگر شہریار نے ایک دفعہ پھر اس کی بات اچک لی۔

"کیا مایوں کی دلہن' مایوں کی دلہن لگائی ہوئی ہے؟ مایوں کی دلہن نہ ہو گئی کوئی خلائی مخلوق ہو گئی' یہ کیا تو وہ ہو جائے گا' وہ ہوا تو یہ ہو جائے گا' جائیں محترمہ! یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے' آپ کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں' اب ہم ہیں ان کا خیال رکھنے والے۔ کیوں بھابھی؟"

شہریار نے ضوفی سے پوچھا جبکہ مارو پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ضوفی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر چپ ہو گئی۔

"چلو بھئی! بھابھی کے ساتھ گروپ فوٹو بنواتے ہیں!" شہریار نے کہا تو سب ضوفی کے آگے پیچھے سیٹ ہو گئے۔

صبح تقریباً" تین بجے ان کی واپسی ہوئی تھی وہ بھی تب جب انہیں لگا کہ ضوفی اب نیند سے بے ہوش ہو جائے گی' ویسے بھی ماہ رخ دس چکر لگا چکی تھی انہیں نکالنے کے لیے۔

"ضوفی! یاد رکھنا! ابھی تم نے مہندی بھی لگوانی ہے۔"

"ضوفی! ابھی ابٹن بھی لگانا ہے۔"

"ضوفی! یہ بھی کرنا ہے' ضوفی وہ بھی کرنا ہے۔" وہ ہر بار آتی اور کچھ نہ کچھ یاد دلاتی لیکن ضوفی بے چاری ان کے قصے سن سن کر اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش

کر رہی تھی بھلا کیا جواب دے پاتی۔

"اس لڑکی کے تو دانت ہی اندر نہیں ہو رہے' ایک یہ اور ایک اس کی نانی ہے.... اتنا اچھا لڑکا مٹھی میں دبائے بیٹھی تھیں' اسی لیے تو میرے بھائی میں ہزار کیڑے نظر آتے تھے.... یہ بھی جیسے تیار بیٹھے تھے.... کیا پتا لڑکے میں کوئی عیب ہو مگر یہ اس کے بھائی تو.... ہائے میری نچھو کا بھی....." شہریار نے نچھو کی والدہ محترمہ کو کسی سے باتیں کرتے سنا تو ضوفی سے ان کے بارے میں پوچھا۔

"یہ ہماری بڑی مامی ہیں.... ان کے گھر ہی ہم رہتے ہیں۔"

"خاصی پھاپھا کٹنی ٹائپ چیز ہیں یہ تو۔" فہد نے اسے آنکھیں بھی دکھائیں مگر وہ قاسم ہی کیا جو اپنی بات مکمل کیے بغیر چپ کر جائے۔

"آنکھیں کیوں دکھا رہے ہیں' میں نے تو جو محسوس کیا وہی کہہ بھی دیا۔" الٹا اس نے فہد کو بھی شرمندہ کر دیا' ضوفی کی پھر ہنسی نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے نہیں جانا!" فہد منہ پھلا کر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیوں؟" آفاق نے اسے گھورا۔

"حد کرتے ہو یار! میرے بھائی کی شادی ہے اور وہ بھی پہلی پہلی.... اور میں ہی موجود نہ ہوں۔" اس وقت فہد سمیت آفاق' شہریار اور عمیر ڈیڈی کے کمرے میں تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی فہد کے کولیگ نے اسے کال کر کے بتایا تھا کہ انہوں نے جس کورس کے لیے جانا تھا' آج شام کو ان کی روانگی ہے' وہاں لیٹر کافی دنوں سے آیا پڑا تھا مگر اسے کسی نے انفارم نہیں کیا تھا سو اب افراتفری میں جانا تھا لیکن وہ اب جانا نہیں چاہ رہا تھا۔

"فہد!" شیراز صاحب نے کہا۔ "بڑے ہو جاؤ تم' اتنے بڑے ڈاکٹر ہو مگر حرکتیں....."

"چلو! سامان پیک کرو جلدی سے۔" انہوں نے حتمی لہجے میں کہا تو وہ منہ بناتے ہوئے باہر چلا آیا۔ باقی سب بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل آئے۔

تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے آفاق کو ایک میاں نے چمکیلا بھڑکیلا سہرا پہنایا۔

"بس!" عذیر ہنستے ہوئے بولا۔ "اسی کی کمی رہ گئی تھی۔"

"قربانی کے بکرے لگ رہے ہو پورے!" شہریار' عمیر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے' آفاق انہیں سہرے کے اندر سے گھور بھی نہیں سکتا تھا۔

آخر کار بارات روانہ ہوئی' ڈھول کی تھاپ پہ دلہا کے آگے آگے گاؤں کے لڑکے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔

"یار! شرم کرو! دولہا کے بھائی ہو لیکن ہم سے اچھے تو یہ لوگ ہیں!" عذیر نے کہا تو پھر وہ پانچوں بھی بھنگڑا ڈالنے والی ٹولی میں شامل ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

یہاں سے سیدھا انہوں نے واپس گھر جانا تھا' ان لوگوں کا سامان تو پہلے ہی فہد لے جا چکا تھا اب ضوفی کا ایک سوٹ کیس تھا جو شہریار نے اپنی گاڑی میں رکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ عذیر' قاسم اور عاصم تھے جبکہ دوسری گاڑی کو عمیر ڈرائیو کر رہا تھا جس میں ضوفی' آفاق اور شیراز صاحب تھے۔

دو گھنٹوں بعد جب وہ گھر کے نزدیک پہنچے تو شہریار کو خیال آیا۔

"او ہو! یار بھابھی کے ویلکم کے لیے کچھ تیاری تو نہیں کی!"

"تو یہ پہلے سوچنا تھا نا' اب کیا ہو سکتا ہے۔" عذیر نے منہ بنایا۔

گاڑیاں پورچ میں رکیں' شام بھی تقریباً ڈھل چکی تھی' قاسم نے آگے بڑھ کر باہر کی لائٹس آن کیں' پورا قصر لائلہ ایک جھماکے سے روشن ہو گیا اور سب ٹھٹک کر جہاں تھے وہیں رک گئے۔

سیڑھیوں سے لے کر مین ڈور تک' سرخ گلاب پتیوں کی روش بنی ہوئی تھی اور عین مین ڈور کے سامنے ہلکی گلابی پتیوں سے "ویلکم ہوم" لکھا ہوا تھا۔

اس خوش گوار سے سرپرائز پر ڈیڈی اور آفاق نے حیران نظروں سے ان لوگوں کی طرف دیکھا تو وہ خود بھی انہیں حیران نظر آئے۔

"ویلکم ہوم بھابھی!" وہ حیرت کی وادی سے نکلے تو اکٹھے بولے۔

ڈیڈی نے آگے بڑھ کر مین ڈور کھولا۔

"چلو بیٹا! بسم اللہ پڑھ کر اندر داخل ہو' اب یہ تمہارا گھر ہے اور آج کے بعد سے اس گھر کا سارا انظام تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔"

ضوفی اور آفاق نے ایک ساتھ اندر قدم دھرے' کوریڈور میں بھی گلاب بچھے ہوئے تھے جو لاؤنج تک جا رہے تھے' پورے گھر میں گلاب کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لاؤنج کی دیواروں پر ننھی ننھی ایل ای ڈیز چمک رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پورے لاؤنج میں جگنو گردش کر رہے ہو' اچھا خاصا رومانٹک ماحول بنا ہوا تھا۔

"فہد بھائی زندہ باد!" عمیر' عذیر اور قاسم بولے۔

"عاصم بیٹا! بھابھی کو ان کے کمرے تک چھوڑ آؤ!"

"بھابھی کا کمرہ کون سا۔" وہ پوچھنے لگا تو اس کے سوال پر وہاں موجود تمام افراد کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لیں۔

"آئیں بھابھی! میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھاتا ہوں!" عذیر نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"عمیر! تم بھابھی کا سامان لے آؤ!" وہ تینوں اوپر چلے گئے تو عاصم اور قاسم بھی ان کے پیچھے لپکے۔ اب لاؤنج میں صرف شیراز صاحب اور آفاق ہی رہ گئے تھے۔

"بیٹا! مجھے لگتا ہے کہ تم نے میرا فیصلہ مان تو لیا ہے مگر اس پر خوش نہیں ہو۔"

"نہیں ڈیڈی! ایسی کوئی بات نہیں' بس میں تھوڑا سا تھک گیا ہوں اور ویسے بھی میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے تھوڑا ٹائم چاہیے ہو گا' آہستہ آہستہ ایڈجسٹ ہو جاؤں گا۔"

"لیکن بیٹا! دیکھ لینا' اس بن ماں باپ کی بچی کا انتظار زیادہ لمبا نہ کر دینا۔"

"جی!" اس نے بس یہی کہا اور وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کتنا وقت درکار ہو گا کہ میں اپنے دل کو آپ کے لیے راضی کر سکوں.... آپ میری ممی اور ڈیڈی کی پسند ہیں مگر مجھے اس بارے میں کچھ دن پہلے ہی معلوم ہوا تھا.... سو.... میں ابھی تک ذہنی طور پر تمام حالات قبول نہیں کر پا رہا.... گو.... میں نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا نہ ہی کوئی میرا آئیڈیل تھا مگر.... اگر آئیڈیل ہوتا بھی تو وہ کم از کم آپ نہ ہوتیں.... امید ہے کہ آپ میری باتوں کا برا نہیں مانیں گی اور مجھے کچھ وقت دیں گی!" اتنی لمبی تقریر کر کے وہ اس کا جواب سننے کے لیے رکا تک نہیں۔

وہ گم صم سی اس بند دروازے کو گھور رہی تھی جس کے پیچھے وہ غائب ہوا تھا۔

ایک اور امتحان؟

اس کی سہیلیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ وہ بیاہ کر اتنے بڑے گھر میں جائے گی اور اسی امید پر وہ دونوں ممانیوں کے ستم برداشت کرتی تھی کہ ایک دن تو اسے یہاں سے چلے ہی جانا ہے' حالانکہ بڑی ممانی کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس کی ہر امید اور آس پر پانی پھیر دیں۔

"ہونہہ! اتنے عرصے بعد کسے یاد ہو گا؟ تم بس انتظار ہی کرتی رہنا اور وہ وہاں بیاہ رچا کے بیٹھا ہوا ہو گا' چہ چہ چہ.... اس کا دماغ تھوڑی خراب ہو گا کہ شہر میں رہتے ہوئے گاؤں سے لڑکی بیاہنے آئے....."

لیکن اسے یقین تھا کہ وہ آئے گا' نانی بھی تو اسے امید دلاتی رہتی تھیں اور اسی امید پر اس نے اپنی پڑھائی چاہے پرائیویٹ ہی سہی جاری رکھی' تاکہ جب وہ اسے لینے آئے تو وہ اس کے لیے کسی بھی طرح سے

شرمندگی کا باعث نہ بنے۔۔۔ جتنے دن بھی اس نے وہاں گزارے اچھے دنوں کی آس میں گزارے۔۔۔ کبھی کبھی تو ماہ رخ ممانی کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیتی۔۔۔ وہ شروع سے ہی ایسی تھی۔ اپنا حق چھین کر لینے والی' نڈر اور بے خوف مگر ضوفشاں اس جیسی کبھی نہیں بن سکی تھی جب اس کے سارے دیور اس کے پاس آئے ممانی کے گھر تو اسے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی' اسے لگا تھا جیسے اتنے عرصے بعد وہ اپنوں کے درمیان آگئی ہو مگر۔۔۔ ابھی ابھی۔۔۔ جو آفاق کہہ کر گیا تھا۔۔۔

"جہاں اتنا صبر کیا' اتنا برداشت کیا' وہاں کچھ دن اور سہی!

اور مجھے تو ویسے بھی ایک نام اور چھت کی تلاش ہے' وہ تو مل ہی گیا۔۔۔ میرے لیے اتنا بھی کافی ہے۔" اس نے سوچا۔

☆ ☆ ☆

شہریار سوئی جاگی کیفیت میں سیڑھیاں اتر رہا تھا' فہد تو اب دو ماہ کے لیے بیرون ملک چلا گیا تھا جبکہ آفاق صاحب آج پہلے پہلے دن کے دلہا تھے' سو آج سب کے لیے ناشتا بنانا اس کی ذمہ داری تھی۔

"کیا مصیبت ہے یار!" وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے چائے چڑھا کر بازار سے ہی سب کچھ لے آؤں۔" اس نے بمشکل اپنی جمائی روکی اور دل ہی دل میں پلان بناتا ہوا وہ کچن کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک نسوانی ہنسی نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"یہ میرے کان بجے ہیں یا واقعی کوئی ہنسی تھی؟" اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں چلائیں' نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔

"اوہو! تم کیوں پریشان ہوتی ہو' تمہیں پتا ہے نا' بس میں جس کام کے لیے ٹھان لوں وہ کر کے ہی رہتی ہوں' مامی نے میرا کیا بگاڑ لینا تھا' نانو بھی تو میرے ساتھ تھیں' اسی لیے بتول خالہ کو ساتھ لے آئی میں!" یہ آواز اسے سنی ہوئی لگی اور وہ تیزی سے کچن کی طرف گیا مگر پھر دروازے میں ہی رک گیا۔

کچن میں شیراز صاحب' ضوفی' ماہ رخ اور کوئی خا ٹائپ خاتون تھیں' ماہ رخ مختلف باکس کھول کھول رکھ رہی تھی۔

"بیٹا! تم نے خوامخواہ زحمت کی۔۔۔" شیراز صاحب بولے۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں انکل! اس میں زحمت کی کیا بات ہے' یہ تو رواج ہوتا ہے' کیا ہوا جو ہمارے والدین نہیں مگر ہم دونوں بہنیں خود ہی کافی ہیں اپنے لیے۔ اپنا خیال رکھنے کے لیے۔۔۔" آخر میں اس کی آواز میں تھوڑی نمی کی آمیزش تھی مگر اسے اپنے تاثرات پر مکمل کنٹرول تھا۔

"اچھا پلیز! اب ذرا آپ اپنے شہزادوں کی فوج کو جگائیں' ورنہ ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اتنی محنت کی ہے میں نے۔۔۔"

"احسان جتانا نہیں بھولتی۔" شہریار نے سوچا۔

اتنے میں شیراز صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی۔

"شہریار! ذرا جلدی سے سب کو ڈائننگ ٹیبل پر حاضر کرو!"

"جی اچھا!" کہہ کر وہ وہاں سے بھاگا۔ پھر سب نے مل کر اکٹھے ناشتا کیا۔ سب نے ہی تعریف کی مگر۔۔۔

"مجھے لگ رہا ہے میں زندگی میں پہلی دفعہ کھا رہا ہوں!" عمیر نے ندیدے پن کی انتہا کر دی۔ ضوفی اور ماہ رخ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"سچی بھابھی! اتنا مزے دار اور گھر کا بنا ہوا۔۔۔"

"تو وہ جو بوا جی بناتی تھیں؟" شہریار جل کر کہا۔

"بھائی! میرے میں نے مزے دار بھی کہا ہے' جو بناتی تھیں وہ گزارے لائق ہی ہوتا تھا۔"

"واقعی بیٹا! ہر چیز بہت اعلا بنی ہے!" شیراز صاحب نے بھی تعریف کی۔

"آفاق بھائی کو شاید پسند نہیں آیا' اس لیے سے چپ بیٹھے ہیں۔" ضوفی نے حیرت سے دیکھا لیکن وہ شروع سے ہی ایسی تھی۔

"نہیں۔ نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ سب بہت اچھا ہے۔۔۔" آفاق کو بھی ماہ رخ سے یہ امید نہیں تھی لہٰذا پہلے تھوڑا حیران ہوا پھر مسکرا کر بولا۔

"تو پھر میرا انعام!" آفاق سمیت سب کے منہ کھل گئے جبکہ ضوفی ماہ رخ کے اتاؤلے پن پر سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

"آں ہاں!" آفاق نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر والٹ میں سے گنے بغیر کئی نوٹ ماہ رخ کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

"توبہ ہے آفاق بھائی! آپ کیا ہر کسی کو ایسے ہی گنے بغیر نوٹ تھما دیتے ہیں؟" اس نے ایک ہزار کا نوٹ لے کر باقی واپس کر دیے۔

ناشتے کے بعد ماہ رخ اور ضوفی نے برتن سمیٹنا شروع کیے۔۔۔

"ارے رے۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو؟" شیراز صاحب نے بوکھلا کر کہا۔

"بھابھی! آپ لوگ چھوڑیں! ہم کر لیں گے۔" عذیر نے کہا۔ "آپ لاؤنج میں جا کر بیٹھیں!"

"انکل! اب دو لڑکیوں کے ہوتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا نا کہ یہ لوگ کام کریں۔۔۔" اس نے ایک جتاتی ہوئی نظر شہریار پر ڈالی جو نہایت پرسکون انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

سارا سامان وہ اب ٹرے میں منتقل کر چکی تھی' سو کچن کی راہ لی تو عاصم بھی ان کے پیچھے کچن میں چلا گیا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔" شیراز صاحب اور آفاق اٹھ کر چلے گئے تو عمیر خواب کی سی کیفیت میں بولا۔

"کس بات کا؟" شہریار نے پوچھا۔

"کہ دو عدد خواتین ہمارے گھر میں گھوم رہی ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی خواتین آچکی ہیں۔"

"بیٹا جی! دو عدد نہیں۔۔۔ ایک عدد!" عذیر نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"ایک آفیشلی ہیں اور ایک ان آفیشلی!" قاسم بولا۔

"تو دوسری کو بھی آفیشلی لے آتے ہیں نا!" عمیر بولا تو عذیر اور قاسم کے درمیان معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔

"آہم آہم! عمیر میاں! سب خیریت تو ہے نا!" عذیر نے بڑے بزرگوں کی طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو عمیر جیسے نیند سے جاگا تھا۔

"ہاں بالکل خیریت ہی ہے۔۔۔ تم زیادہ میرے بڑے ابا بننے کی کوشش نہ کرو۔" یہ کہہ کر عمیر بھی کچن میں چلا گیا تو شہریار کی الجھی ہوئی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

☆ ☆ ☆

"ارے! آپ اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے؟" عذیر کافی دنوں بعد یونیورسٹی آیا تھا کہ راستے میں اسے وہ مل گئی۔

"جی بس اکلوتی میرے بگ برو کی شادی تھی تو۔۔۔ آپ سنائیں! آپ کی چوٹ کیسی ہے؟" اسے دیکھ کر عذیر کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

"اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہوں! میں آپ کو اسی لیے ڈھونڈ رہی تھی کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔۔۔ آپ نے اس دن میری اتنی ہیلپ کی!"

"تو پھر کریں نا شکریہ ادا!" عذیر نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

"مطلب! کیسے شکریہ ادا کروں؟" وہ تھوڑی پریشان ہو گئی تھی۔

"جیسے آپ کا دل چاہے۔۔۔ ویسے ایک کپ کافی سے بھی شکریہ ادا ہو سکتا ہے۔" عذیر نے اس کی پریشانی سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" اس کے سر سے جیسے بوجھ اترا تھا۔ "اچھا! مگر اس کے لیے آپ کو میرے گھر آنا ہوگا' میں ابھی گھر ہی جا رہی ہوں۔ میری امی بھی آپ کا شکریہ ادا کریں گی۔" اتنے میں اس کا سیل بجنے لگا۔

"ہاں ہیلو عائزہ! بولو!۔۔۔ نہیں۔ میں تو فری ہو چکی ہوں۔ اب گھر جا رہی ہوں۔۔۔ کم آن یار۔۔۔ کیوں اتنا لڑتی ہو اس سے۔" اس نے کن اکھیوں سے عذیر کی

طرف دیکھا جو تھوڑا پرے ہو کر جوتے کی نوک سے زمین کرید رہا تھا۔

"ہاں ہاں پتا ہے' وہ بھی کم نہیں۔۔۔ تو تم کون سا کم ہو۔۔۔ ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔۔۔ اوکے بائے۔" سیل اس نے بیگ میں ڈالا اور دوبارہ عذیر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میری سسٹر کا فون تھا۔۔۔ آپ کے ہی ڈیپارٹمنٹ کی ہے۔۔۔ اب چلیں!"

"چلیں!" عذیر کو بھلا اس کی بہن میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

✲ ✲ ✲

"محترمہ ماہ رخ بی بی! آپ کو اپنے گھر میں سکون نہیں کہ آپ ہر دو دن بعد یہاں نازل ہو جاتی ہیں ہماری بھابھی کو ورغلانے کے لیے!" عمیر سلیب پر چڑھا سیب کھا رہا تھا' تقریباً" ہر ویک اینڈ پر ماہ رخ شام کو ضوفی کی طرف آجاتی تھی۔

"مسٹر عمیر وڑائچ! جب آپ نے اپنے ذاتی پیسوں سے گھر بنا لیا نا' تب آپ پر یہ طعنہ دینا سوٹ بھی کرے گا' فی الحال یہ میری پھپھی کا گھر ہے مائنڈ اٹ۔"

ماہ رخ کے جواب نے جہاں عمیر کی بولتی بند کی وہاں قاسم اور ضوفی کو ہنسنے پر مجبور کر دیا اور اندر آتے ہوئے شہریار کو حیرت میں ڈال دیا اس نے پر اعتماد سی ماہ رخ عرف مارو کو دیکھا۔

"عمیر صاحب! کوئی بہت بستی (بے عزتی) نہیں ہو گئی۔" قاسم نے ہنستے ہوئے کہا تو عمیر منہ بنا کر سلیب سے اتر آیا۔

"دیکھ لوں گا تمہیں بھی غدار!" اس نے قاسم کو آنکھیں دکھائیں اور باہر جانے لگا مگر ماہ رخ نے فوراً" آواز دے کر روک لیا۔

"او ہیلو! اب جا کہاں رہے ہو؟ یہ سلاد شاید تم نے بنانا تھا۔" ماہ رخ نے ایک ٹرے اس کے سامنے کی تو وہ منہ بنا کر کچن ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

✲ ✲ ✲

پورے دو ماہ بعد فہد واپس آرہا تھا۔ وہ پہلی دفعہ دور اور اتنے سارے دنوں کے لیے گیا تھا سو سب اس کے پرجوش استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ضوفی اس کا کمرہ وغیرہ ٹھیک کر کے جب کچن میں آئی تو سب بھائی بمعہ آفاق کے کچن میں مصروف تھے۔ اور سارا کچن الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے!" اس نے چیخ کر پوچھا کیونکہ لوگوں نے اتنا ہنگامہ مچایا ہوا تھا کہ اگر وہ آرام سے پوچھتی تو ان کو بمشکل سنائی دیتا۔ اس کی چیخ کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا' وہ سب جہاں تھے اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔

"یہ کیا ہنگامہ ہو رہا ہے؟" اب کی بار آواز میں سختی تھی' اس نے خود اپنے تاثرات کو بھی سخت کیا۔ سب پلٹ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ ضوفی نے سب کو غصہ سے گھورنا چاہا مگر اگلے ہی لمحے وہ سٹپٹا گئی۔

جب کچن کی چھت ان سب بھائیوں کے جاندار قہقہوں سے اڑنے والی ہو گئی۔۔۔ ہر کوئی اپنے اپنے اسٹائل میں ہنس رہا تھا کوئی منہ پر ہاتھ رکھ کر کوئی پیٹ پر اور کوئی صرف دانت نکال کر۔۔۔

"توبہ! بھابھی۔۔۔ آپ غصہ بھی کرتی ہیں؟" عمیر نے کہا۔

"لیکن بھابھی غصہ کرنے سے پہلے ذرا اپنے آپ کو اور پھر ہمیں بھی دیکھ لیں!" شہریار کی ہنسی ابھی بھی نہیں رک رہی تھی۔

"لیکن اثر ہوا تھا نا بھابھی کے غصے کا۔۔۔ سب کو کیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔" عذیر بولا۔

"بھابھی کی ایک للکار نے سب کو پتھر کا بنا دیا آفاق بھائی سمیت!" قاسم نے بھی بولنا فرض سمجھا۔

"یہ تو ہے۔" شہریار نے تائید کی۔ اس نے دیکھا آفاق بھی اپنی مسکراہٹ دبانے کے چکروں میں تھا۔

"چلو پھر میں جونک تو لگی۔" اس نے سوچا۔

"ہائے وادے! کوئی مجھے یہ بتانا پسند کرے گا کہ کچن پر یہ ظلم کیوں ہو رہا ہے؟"

"ہم فہد بھائی کے ویلکم کی تیاری کر رہے ہیں۔" قاسم نے جواب دیا۔

"مطلب؟" اسے سمجھ نہ آیا کہ یہ کس قسم کا ویلکم ہے۔

"مطلب ہم ان کی فیورٹ ڈشز بنا رہے ہیں۔" عاصم نے بتایا۔

"آپ مجھے بتاتے میں بنا دیتی!"

"لیکن ان کو تو ہمارے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں پسند ہیں نا۔" عذیر بتا کر چیزیں گنوانے لگا۔

"ہوں! تو کیا ریڈی ہو چکا ہے سب؟" اس نے پوچھا۔

"آپ ٹیسٹ کریں گی؟"

جیسے جیسے وہ چکھتی گئی' اس کے منہ کے زاویے بگڑتے گئے اور آفاق کا بنایا ہوا قورمہ چکھتے ہوئے شاید مرچیں اس کے گلے میں پھنس گئیں۔۔۔ وہ کھانسی تو سب کو خوامخواہ کھانسی شروع ہو گئی۔ اس نے دوبارہ آفاق کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

✲ ✲ ✲

"قسم سے بھابھی! آج مجھے اپنا گھر گھر لگا ہے۔۔۔" وہ سب فہد سمیت لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے' فہد کو خاصا وی آئی پی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔

"بھابھی! دیکھ لیں موصوف کو! ایئرپورٹ پر سلام دعا سے پہلے اس نے آپ کا پوچھا ہے۔" عمیر نے کہا تو ضوفی مسکرا دی۔

"یار! دو ماہ ہو گئے ہیں تم لوگوں نے بھابھی کو بولنا نہیں سکھایا۔" فہد نے پوچھا۔

"یار جو بولنا آتا تھا وہ بھی بھول چکی ہیں؟" وہ جب سے آیا تھا ضوفی نے ایک آدھ بات ہی کی تھی' بس مسکرانے پر ہی اکتفا کر رہی تھی۔

"جی نہیں! تمہیں کیا معلوم بھابھی کو بولنا بھی آگیا ہے اور غصہ کرنا بھی!" عذیر نے دن والی بات کا حوالہ دیا تو سب ہنس پڑے۔

"میں کھانا لگاتی ہوں!" کہہ کر ضوفی نے اپنی جان بچائی ورنہ اس کی اور کٹ لگ جانی تھی۔

ان سب کے بنائے ہوئے کھانوں کے علاوہ میز پر تین چار ڈشوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ چکن کڑاہی' کباب پلاؤ' رائتہ اور ساتھ رس ملائی۔

وہ سب بار بار اپنی اپنی بنائی ڈشیں آگے کرتے مگر فہد نے صرف وہی تین چار چیزیں لیں جو بعد میں بنائی گئی تھیں۔ وہ ہر چیز کی تعریف کر رہا تھا۔

"ویسے بڑے ہی طوطا چشم ہو تم!" شہریار نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا۔

"کیوں بھئی! میں نے کیا کیا ہے؟" فہد بے چارے کو اپنا قصور تک معلوم نہ تھا۔

"ہم نے اتنی محنت سے تمہارے لیے یہ سب بنایا اور تم نے چکھا تک نہیں اور بھابھی کی بنائی ہوئی چیزوں کی بڑھ بڑھ کر تعریف کر رہے ہو!"

"فہد بھائی دس از ناٹ فیئر!" قاسم نے بھی منہ بنایا۔

"تو بھئی مجھے کیا پتا کہ تم لوگوں نے کیا بنایا ہے' میں تو فی الحال صورت ہی دیکھ رہا تھا مگر یہاں تو سیرت بھی اچھی نکلی۔" اس نے ایک ہی جملے میں ان کی کارکردگی واضح کر دی تو ان سب کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

✲ ✲ ✲

واپس آنے سے اگلے ہی دن فہد نے فوراً" صبا کی خبر لینے کی کی۔ کیونکہ جاتے ہوئے وہ ایسی افراتفری میں گیا تھا کہ اسے صبا کو بتانا تک یاد نہیں رہا۔ وہاں بھی کئی بار اسے صبا کا خیال آیا مگر وہاں بس خیال آنے کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اس راز میں کوئی شریک نہیں تھا' سو اب وہ پوری رفتار سے گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا' لیکن ہاسٹل پہنچ کر اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

ہاسٹل سیل ہو چکا تھا' نجانے اس کے پیچھے کیا ہنگامہ ہوا کہ ہاسٹل ہی بند کرنا پڑا اور ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کے بارے میں کوئی اتا پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گئیں' کوئی کہتا تھا کہ ہاسٹل کی مالکہ کرپٹ عورت تھی' کوئی ہاسٹل کی لڑکیوں کو کرپٹ کہہ رہا تھا مگر اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اسے صبا کی فکر تھی' وہ کہاں گئی

ہوگی۔

اسے لگا جیسے وہ اندھیرے میں کھڑا ہے جس میں اسے نہ آگے کا کچھ پتا ہے نہ پیچھے کا۔

"آخر وہ کہاں جاسکتی ہے؟" اس نے سوچا۔

"نہ تو اس کا کوئی رشتہ دار ہے' نہ کوئی اور۔۔۔ پھر کہاں گئی ہوگی وہ!" جیسے جیسے وہ اس کے متعلق سوچتا جارہا تھا' اس کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔

"دنیا اتنی آگے جاچکی ہے اور میں بے وقوف ہی رہا۔ یہ نہ ہوا کہ اسے ایک سیل فون ہی لے دیتا' کم از کم رابطے کی کوئی تو راہ رہتی۔" اسے رہ رہ کر خود پہ ہی غصہ آرہا تھا۔ پھر اس نے شہر کے تمام دارالامان چیک کرنے کی سوچی۔

"اور جا بھی کہاں سکتی ہے!" ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بار بار اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے سڑک کے اطراف میں بھی نظریں دوڑا رہا تھا جیسے دو مہینے صبا اس کا انتظار روڈ پر ہی تو بیٹھی کررہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بھابھی! آپ کی وہ تیس مار خانم بہن صاحبہ نہیں آئیں کئی روز سے۔" شہریار نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی غیر موجودگی کا نوٹس لیا تھا۔ ضوفی اسی وقت چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی تھی۔ لاؤنج میں شہریار' فہد اور عمیر کوئی پرانا میچ دیکھ رہے تھے۔

"محترمہ کی ناک خاصی اونچی ہے' اس دن والی بات کافی سیریس لے لی ہے' سو اب باقاعدہ دعوت پر ہی آئیں گی۔" ضوفی کے بولنے سے پہلے ہی عمیر بول پڑا تو ضوفی ہنس پڑی۔

"کمال ہے عمیر! تم۔۔۔ اتنی جلدی اس کی طبیعت سے واقف ہوگئے۔" وہ بولی۔

"بس بھابھی! ہم تو اڑتی چڑیا کے پر بھی گن لیتے ہیں پھر یہ ماہ رخ بی بی کیا چیز ہیں؟" عمیر نے ہنستے ہوئے کہا تو شہریار اسے ناگواری سے گھورتے ہوئے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"ہاں مگر ایک چڑیا ایسی ہے کہ ہر وقت چونچیں مارتی رہتی ہے۔ پروں پر پانی پڑنے نہیں دیتی" عمیر نے منہ بنایا۔۔۔ پھر اس نے رازداری والے انداز میں کہا تو ضوفی نے حیران اور مصنوعی ٹھٹھنے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"اہم اہم! کیا تم واقعی سیریس ہو؟"

"میں تو ہوں بھابھی! مگر وہ خونخوار جنگلی بلی کی طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑی رہتی ہے' جہاں جاؤ قسم سے بھابھی! کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتی ہے کہ دل جل کر خاک ہوجاتا ہے۔" عمیر نے بے چارگی سے کہا تو ضوفی اس کے انداز پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔

"لیکن میں نے بھی سوچ لیا ہے!" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا؟"

"یہی تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں۔" اس نے یکدم پینترا بدلا تھا اور گنگناتے ہوئے بولا۔

"یہ تو تم اس کے سامنے کہتے تو زیادہ بہتر تھا۔"

"کیا بات کرتی ہیں بھابھی۔۔۔! اس بندی نے تو یونیورسٹی کے سامنے بلاتکلف میری پٹائی شروع کردینی تھی!"

"تو پھر کیا پروگرام ہے دیور جی؟ ڈیڈی سے بات کروں!"

"پھر میں پہلے اس چڑیا کو شیشے میں اتار تا ہوں' آپ ڈیڈی سے بھی بات کرلیجیے گا ورنہ تو۔۔۔ وہ تو مجھے گھر سے ہی اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے۔"

وہ باہر چلا گیا تو ضوفی نے چائے کے برتن سمیٹنا شروع کردیے۔ شہریار کی چائے آدھی پڑی تھی جبکہ فہد کی ابھی تک ویسی ہی رکھی ہوئی تھی۔

تین ماہ ہوگئے تھے اسے صبا کو تلاش کرتے مگر اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ تھک کر اس نے تمام اسپتالوں سے بھی انفارمیشن حاصل کی مگر ناکامی ہی رہی۔۔۔ اسے رہ رہ کر اپنی ہی غلطیاں یاد آرہی تھیں۔ کم از کم اسے صبا سے اس اسکول کا تو پوچھنا چاہیے تھا جہاں وہ جاب کرتی تھی۔۔۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھ سے ملتی ہے ایک لڑکی روزانہ
وہ میری دیوانی میں اس کا دیوانہ"

سلاد بناتے ہوئے عذیر بڑے مگن انداز میں گا رہا تھا۔۔۔ جب عاصم نے **کھنکھار** کر ضوفی کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

"مسٹر عذیر! کیا آپ اس دیوانی کا حدود اربعہ بتاسکتے ہیں تاکہ دو دیوانوں کو پاگل خانے بھجوانے کا بندوبست کرسکیں!"

"ابھی ملاقاتوں کی شروعات ہوئی ہے
آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات ہوئی ہے"

وہ مزے سے بولا۔

"اہم اہم!" عاصم نے آنکھیں مٹکائیں اور ضوفی نے عذیر کے کان پکڑ لیے۔

"سیدھے سیدھے بتاؤ۔۔۔ کیا چکر ہے!"

"اچھا اچھا بتاتا ہوں! وہ یونیورسٹی کی ہی لڑکی ہے' کسی اور ڈیپارٹمنٹ کی بہت اچھی ہے۔"

"ہوں! تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟" ضوفی نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔

"بس! آپ ڈیڈی کے کان میں بات ڈال دیں کوئی مناسب وقت دیکھ کر۔۔۔ تاکہ کم از کم ان کے علم میں ہو بات۔۔۔ پھر جیسے وہ مناسب سمجھیں!"

اس کے سیل پہ بیل ہوئی تو وہ باہر بھاگا' ضوفی سمجھ گئی کس کی کال ہوگی۔

اس کے مسکراتے ہوئے لب سمٹ گئے' ہر کسی کو خوش رکھنے والی۔۔۔ ضوفشاں آفاق کی اپنی زندگی حقیقی خوشی سے ناآشنا تھی۔ وہ جس شخص کے حوالے سے اس گھر میں رہ رہی تھی اسے ہی اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ وہ اسے مخاطب تک نہیں کرتا تھا نجانے وہ پہلے سے ایسا تھا یا شادی کے بعد ایسا ہوگیا تھا۔۔۔ حالانکہ جب وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ہوتا تھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے مگر وہ انہیں بہنے نہیں دینا چاہتی تھی۔۔۔ ماہ رخ نے بھی تو کئی دفعہ آفاق کے رویے کے بارے میں پوچھا تھا اور وہ یہ کہہ کر ٹال گئی تھی کہ وہ ہیں ہی ایسے۔۔۔ مگر خود کو کیا کہہ کر بہلاتی۔

کچن کی طرف آتا آفاق دروازے پر ہی رک گیا تھا۔ اس نے کبھی اس لڑکی کے چہرے پر تھکن' دکھ یا شکوہ نہیں دیکھا تھا مگر آج۔۔۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں تو وہ سر جھٹک کر واپس چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں ایک ہنگامہ برپا تھا' آج چھٹی کے دن سب گھر پر ہی تھے۔۔۔ ضوفی اور شیراز صاحب پچھلے لان میں اچار کے مرتبانوں کے ساتھ مصروف تھے۔ آفاق لاؤنج میں ہی لیپ ٹاپ کھولے کسی کام میں مصروف تھا' فہد بظاہر ٹی وی دیکھ رہا تھا مگر اس کی سوچ کا طائر کسی اور جگہ محو پرواز تھا جبکہ شہریار' عمیر' عذیر اور قاسم لاؤنج میں ہی کیرم کھیل رہے تھے اور عاصم سپورٹر کا کام سرانجام دے رہا تھا۔ لاؤنج میں ٹی وی کے ساتھ تیز میوزک بھی بج رہا تھا۔

مین ڈور ایک دھماکے سے کھلا اور ماہ رخ روتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"ماہ رخ! کیا ہوا ہے؟" عمیر جلدی سے آگے بڑھا مگر وہ روتی ہی رہی اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے روتی رہی ہے۔

فہد' آفاق اور باقی سب بھی اسے اس طرح روتے دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ عاصم بھاگ کر شیراز صاحب اور ضوفی کو بلا لایا۔ ضوفی کے گلے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"ماہ رخ! بیٹا کیا ہوا ہے' کچھ بتاؤ تو سہی۔" شیراز صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا باقی سب بھی پریشان صورت لیے اس کے گرد جمع تھے۔

"وہ ممانی نے میرا نکاح۔۔۔ اپنے بھائی کے ساتھ

طے کردیا ہے' آج شام کو نکاح ہے' کل جب میں گھر گئی تو انہوں نے زبردستی مجھے ایک کمرے میں بند کردیا اور کہا کہ اگر میں نے انکار کیا تو... میں بہت مشکل سے وہاں سے بھاگی ہوں!" اس نے روتے روتے بتایا اور اب جاکر انہیں نظر آیا تھا کہ اس کے چہرے اور بازوؤں پر نیل پڑے ہوئے تھے۔

"تو تم وہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں؟" شیراز صاحب نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو کیا تم کسی اور کو..." انہوں نے خود بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور ان کی اس بات پر شہریار کے اعصاب تن گئے اور نظریں بار بار ماہ رخ اور عمیر پر پڑنے لگیں۔

"ڈیڈی! ایسی کوئی بات نہیں!" جواب ضوفی نے دیا۔ "مامی کے بڑے بھائی نیم پاگل ہیں اور وہ امی کے حصے کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے یہ سب کر رہی ہیں۔" اس نے نم لہجے میں ساری بات بتادی تو شیراز صاحب سوچنے لگے۔

"تو اب تو تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں بیٹا! تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھو۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولے۔

"مگر انکل! وہ مامی کے بھائی اور بیٹے... ان کے آدمی... مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" ماہ رخ نے ڈرتے ہوئے کہا۔ شہریار کو یوں روتی سہمی سی ماہ رخ بہت عجیب لگ رہی تھی۔

"اول تو ان کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ یہاں آئیں' اگر آ بھی گئے تو زندہ سلامت اپنے قدموں پر واپس نہیں جاسکیں گے۔" عمیر غصے سے بولا۔

"ضوفی بیٹا! تم ماہ رخ کو اپنے کمرے میں لے جاؤ یہ تھکی ہوئی ہے۔ اور فہد! تم ذرا اس کے زخم وغیرہ دیکھو' کوئی دوا وغیرہ دے دو اسے۔" شیراز صاحب نے کہا تو وہ تینوں ضوفی کے کمرے کی طرف چلے گئے' لاؤنج میں خاموشی چھا گئی' دس منٹ بعد فہد بھی واپس آکر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ڈیڈی! اگر آپ اجازت دیں تو... ہم ابھی ان لوگوں سے پوچھتے ہیں آخر ان کی جرأت کیسے ہوئی ماہ رخ آپی کو..." قاسم جوشیلے انداز میں بولا۔

"دیکھو! بیٹا! اس طرح جوش میں آنا مسئلے کا حل نہیں ہے' اس بچی کو مکمل تحفظ چاہیے اور اس کے لیے ایک ہی حل ہے۔" انہوں نے کہا تو سب سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"اور اس پر ہمیں فوری عمل در آمد بھی کرنا ہے تاکہ وہ کوئی فساد نہ اٹھاسکیں۔" ان کی نظریں شہریار پر تھیں۔

"مگر وہ حل کیا ہے۔" فہد نے پوچھا۔

"اگر شہریار اس سے نکاح کرلے!" شہریار کو لگا جیسے اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"مم... میں؟" وہ اچھل ہی تو پڑا۔

"ہاں! تم مگر فوری طور پر۔" ان کی نظریں اس کے چہرے کو جیسے کھوج رہی تھیں۔

"لیکن ڈیڈی وہ... میں کیسے!" وہ جھجک رہا تھا۔ شیراز صاحب نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "فہد تم کرلو! کیونکہ اس بچی کو ہم صرف اسی طرح بچاسکتے ہیں۔" فہد کے صوفے کے نیچے جیسے بم پھٹا تھا۔

"مم... لیکن میں کیسے کرسکتا ہوں؟" وہ گھبرا ہوا تھا۔

"کیوں تم نے شادی نہیں کرنی کیا؟"

"وہ تو میں کرچکا ہوں!" وہ جلدی میں بول گیا۔ سب اچھل ہی پڑے تھے اور فہد کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

"کیا مطلب؟" شیراز صاحب کو کم از کم فہد سے ایسی امید نہیں تھی۔

"وہ... ڈیڈی۔" وہ آہستہ آہستہ ساری بات بتاتا چلا گیا اور شیراز صاحب ابھی والا مسئلہ بھول کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔

"تم نے مجھے بتانا تک گوارا نہیں کیا؟" پوچھا کی بات... "وہ شدید غصے میں آچکے تھے۔

"وہ... مجھے خدشہ تھا کہ آپ میرے اس اقدام پر ناراض ہوں گے۔" فہد کے لیے بولنا محال ہو رہا تھا' وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

"تو کیا اب میں بہت خوش ہو رہا ہوں؟ حد ہوگئی فہد! تمہیں ذرا بھی میری طبیعت' میری فطرت کا اندازہ نہیں' کیا میں تمہیں نیکی کے کام سے روکتا یا غصہ کرتا؟ اگر تم مجھے بتاتے تو میں خود تمہاری شادی کرواتا' تمہیں یوں چوروں کی طرح اپنی بیوی کو نہ رکھنا پڑتا!" شیراز صاحب نے تاسف سے کہا تو فہد کا دل چاہا کہ وہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرے۔

"بہرحال اب جو ہونا تھا ہوچکا تم جاؤ اور بہو کو لے کر آؤ جلدی!" اب یہ صورت حال فہد کے لیے اور بھی خراب ہوگئی۔

"وہ... وہ..." فہد ہکلانے لگا۔

"کیا وہ... وہ لگا رکھی ہے؟ غضب خدا کا چوہدری شیراز ولاج کی بہو اور ہاسٹل میں؟ ابھی جاؤ اور اسے ابھی اور اسی وقت لے کر آؤ!" وہ دھاڑے۔

"وہ تو گم ہوگئی ہے!" شیراز صاحب سمیت باقی بھی اسے گھور کر دیکھنے لگے جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ گم ہوگئی ہے۔" آفاق نے پوچھا۔

"وہ... وہ ہاسٹل میں تھی وہاں سے۔" آگے وہ ساری بات بتاتا چلا گیا۔

"نالائق! گدھے کی دم... تم انسان ہو یا... ارے کوئی اپنی بیوی کو بھی بھولتا ہے؟" شیراز صاحب کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا' باقیوں کو حیرت بھی ہو رہی تھی اور ہنسی بھی آرہی تھی۔

"جاؤ اور ڈھونڈو اسے فورا"۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فہد کو دھکا دے کر باہر نکالیں کہ وہ اپنی بیوی کو ڈھونڈ کر لائے۔

"جج... جی!" وہ فورا" باہر بھاگا اور یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی وہ پچھلے کئی ماہ سے اسے ڈھونڈ رہا ہے مگر اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔

"عمیر! تم ماہ رخ سے نکاح کرلو!" عمیر جو فہد کی درگت بنتے ہوئے دیکھ کر ہنس رہا تھا' یک دم وہ حیران پریشان ہو کر شیراز صاحب کو دیکھنے لگا۔

"مم... میں؟"

"کیوں تم نے بھی کہیں کر رکھی ہے؟"

"جج... جی نن... نہیں!" وہ بوکھلایا۔

"ایک جواب دو!"

"لیکن ڈیڈی میں نے کبھی ماہ رخ کے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا۔ میں اسے بہن سمجھتا ہوں" شہریار چونک اٹھا۔

"نہیں سوچا تو اب سوچ لو' کیا کمی ہے اس بچی میں؟ حالات کی وجہ سے مجبور ہے ورنہ اتنے اچھے کالج میں پڑھاتی ہے' اپنا کماتی ہے' مگر آج حالات اسے اس مقام پر لے آئے تو..."

"ڈیڈی! میں ماہ رخ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں!" شہریار آخر بول ہی پڑا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر ترس کھانے کی۔" شیراز صاحب ناراضی سے بولے۔

"ڈیڈی! میں ترس نہیں کھا رہا۔ بس کچھ غلط فہمی تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو اب کیا ہوگیا ہے؟ دور ہوگئی تمہاری غلط فہمی؟"

"جی!"

"ہوں! وہ سوچنے لگے۔" اب سوچ لو تم نے خود ہی کہا ہے کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو' بعد میں اگر اسے طعنے دیے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا' اس کے لیے کمی نہیں ہے۔" وہ اس وقت حقیقتا" لڑکی کے باپ لگ رہے تھے۔ ان کی آخری بات پر شہریار نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو کنٹرول کیا۔

"جی! میں یاد رکھوں گا کہ میں نے ہی آپ سے درخواست کی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ اگر..."

"کیا معلوم ہے؟" انہوں نے اسے گھورا۔

"وہ کچھ نہیں! نکاح آج ہی ہوگا ناں تو پھر رخصتی کب ہوگی۔" شہریار کے سوال پر شیراز صاحب اور

وہاں موجود اس کے بھائیوں کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔

"بڑی جلدی ہے صاحب زادے! پہلے نکاح تو ہونے دو.... عید پر رخصتی کرلیں گے۔ تب تک وہ نالائق بھی اپنی کھوئی دلہن ڈھونڈ لائے گا۔" پھر وہ آفاق کو مخاطب کرکے بولے۔

"تم جاؤ! کسی نکاح خواں کا بندوبست کرو' میں ذرا گاؤں میں اس کی نانی کو تو اطلاع کردوں۔" آفاق چلا گیا۔

"لیکن ڈیڈی! اس طرح تو وہ لوگ...." عذیر نے کچھ کہنا چاہا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' وہ بھی اس "کارخیر" میں شریک ہوں گی؟" انہوں نے پوچھا تو عذیر نے سر جھکا دیا۔ وہ آفاق کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں ضوفی اور ماہ رخ موجود تھیں۔

"اہم اہم! تو لوگ چھپ چھپ کر یہ کارروائیاں کررہے تھے؟" عمیر نے عذیر کو اشارہ کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" شہریار نے غصے سے پوچھا' جو کہ سراسر مصنوعی تھا۔

"بھائی! اس کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔" قاسم نے دانت نکالے تو وہ خجل سا ہو گیا۔

"عمیر کی ہمدردی میں.... اتنی بڑی قربانی دینے چلے تھے۔ واہ بھئی!" عذیر نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا تو باقی سب بھی ہنسنے لگے۔ جبکہ وہ بے چارگی سے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"ویسے ایک بات کہوں' تمہیں صرف اور صرف ماہ رخ ہی سیدھا کرسکتی ہے ...... بھائی! یہ چکر کب سے چل رہا تھا؟" قاسم پوچھتے ساتھ ہی بھاگا تھا۔ کیونکہ اس نے شہریار کو جوتا اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"چکر کے بچے تجھے بتاتا ہوں۔" وہ اس کے پیچھے بھاگا۔

☼ ☼ ☼

"توبہ فہد بھائی! آپ تو بہت ہی گھنے نکلے۔" شہریار آج کسی کام سے آوٹ آف سٹی تھا۔ اسی لیے یہاں موجود تھی۔ فہد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اب کہانی تو ماہ رخ اور ضوفی کو بھی نہیں پتا تھی۔

"اتنے آرام سے شادی کرلی.... اور کسی کو ہو نہیں لگنے دی۔" عذیر نے ماہ رخ کا جملہ مکمل کیا۔

"دیور جی! آپ تو یہ بات نہ کریں نا.... آ تو ہوا نہیں لگنے دی۔ ڈائریکٹ ایکشن کا مظ کردیا۔" ضوفی نے عذیر کو چھیڑا تو وہ جھینپ گیا۔

"اوئے! تم نے کون سا ایکشن لیا ہے' بتا تاذر عمیر کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔

"عذیر نے بھی ایک لڑکی پسند کی ہوئی ہے اور ہی ہم اس کے گھر رشتہ لے کر جارہے ہیں۔" نے بتایا تو وہاں موجود تمام افراد کا منہ کھل گیا۔ طور پہ عمیر اور آفاق حیرت کا شکار ہوئے۔

"بیٹا! ہم سے پردہ داریاں ہیں۔" عمیر نے ا گھورا۔ "ہے کون؟"

"تو' تو بہت اچھی طرح جانتا ہے اسے' ہر د تیری بے عزتی کرتی رہتی ہے "فائزہ۔" عمیر نے لمحے کے لیے ناسمجھی کے عالم میں عذیر کو دیکھا۔ پھر کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

"وہ!" عمیر کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز فہد بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں وہی' لیکن فکر نہ کر.... اب وہ تجھے کچھ نہ کہے گی۔" عذیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" عمیر نے اپنے تاثرات کو کنٹرول کر کی کوشش کی۔

"عمیر! تم بھی تو کسی کا بتا رہے تھے نا! کیا نے بات کی؟" ضوفی نے عمیر سے پوچھا۔

اب وہ کیا بتاتا کہ کل ہی اس نے فائزہ سے بات تھی اور اس کی توقع کے برعکس اس نے نہایت سے اس کی بات سنی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بارے میں فیصلہ اس کے والدین ہی کریں گے اسے کوئی اعتراض نہیں تھا اور آج وہ ضوفی بات کہنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر.... شاید فائزہ

عذیر ہی سمجھ رہی تھی۔ پہلی دفعہ اسے اپنے جڑواں ہونے پر شکوہ ہوا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ شہریار ابھی تو اس کی خاطر قربانی دے رہا تھا تو وہ کیوں نہیں۔

"نہیں بھابھی! میں بس موقع ہی ڈھونڈتا رہا اور وہ لڑکی مجھے ٹاٹا کرتی ہوئی کسی اور کے سنگ چلی گئی۔" اس نے جان بوجھ کر بات کا رخ موڑ دیا۔

"پر تھی کون؟" عذیر نے پوچھا۔

"تھی ایک لڑکی۔ تو نہیں جانتا اسے۔" یہ کہہ کر وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

جبکہ آفاق ابھی تک یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے بھائی اس لڑکی سے اس حد تک انوالو ہوچکے ہیں کہ اپنے سیکرٹس بھی اس سے شیئر کرنے لگے ہیں۔ جبکہ پہلے تو وہ ہر بات آفاق سے شیئر کیا کرتے تھے۔

✲ ✲ ✲

"بھابھی! آپ کو معلوم ہے، پچھلے رمضان میں عمیر نے کتنا رولا ڈالا ہوا تھا کہ رمضان کی تیاری کرنی ہے اور پھر اسی کے اصرار پر ہم نے کچھ پیشگی تیاری کی بھی تھی۔ مگر اب آپ کو دیکھ کر احساس ہو رہا ہے کہ واقعی رمضان شریف کے استقبال کی تیاری ہو رہی ہے۔" عذیر نہایت مہارت سے سبزیاں کاٹ رہا تھا جبکہ ماہ رخ پکوڑوں کے لیے بیسن بنا رہی تھی اور ضوفی سموسے بنا بنا کر رکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ کافی چھوٹے چھوٹے کام بھی نپٹا رہی تھی۔ روزانہ مسجد بھیجنے کے لیے اس نے الگ سے برتن نکالے تھے اور بڑے کور بھی اس سے پہلے ضوفی نے سارے دیوروں کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کی تھی۔

"بھابھی! املی کی چٹنی بھی بنائیے گا۔ لاسٹ ٹائم فہد بھائی نے بنائی تھی۔ بس گزارے لائق ہی تھی۔" قاسم نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"او کے جی! اور کچھ؟" ضوفی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں اور کچھ ضرورت ہی نہیں، پہلے ہی آپ اتنا کچھ بنا رہی ہیں، ہمارے فریج کی قسمت جاگ اٹھی ہے شاید۔" وہ بھی ان کی مدد کرنے لگا۔

"بھابھی! کل عذیر کی دلہن دیکھنے میں بھی جاؤں گا۔" قاسم نے اچانک شوشا چھوڑا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ دلہن میری، دیکھ کر تم کیا کرو گے؟ جب مجھے ہی کوئی ساتھ لے کر نہیں جارہا۔" عذیر نے منہ بنایا۔ اسے یقین تھا کہ ادھر سے ہاں ہی ہوگی، کیونکہ فائزہ کے والد ڈیڈی کے بہترین دوستوں میں سے تھے اور ان کے بیٹوں سے آفاق اور فہد کی شناسائی نکل آئی تھی، سو انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔

✲ ✲ ✲

شیراز صاحب، ضوفشاں، آفاق، شہریار اور فہد رشتہ لے کر گئے تھے۔ سب کو لڑکی بہت پسند آئی تھی۔ ضوفی اور شیراز صاحب کو لڑکی کی دوسری بہن عمیر کے لیے پسند آگئی تو اس کے لیے بھی رشتہ مانگ لیا۔ انہوں نے رسمی طور پہ سوچنے کا وقت مانگا تھا۔

واپس آکر جب شیراز صاحب نے عمیر کو بتایا تو اس نے "جیسے آپ کی مرضی" کہہ کر بات ختم کردی۔ انہیں عمیر سے اس درجہ سعادت مندی کی امید نہیں تھی، سو آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا کر خوب پیار کیا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" قاسم نے عمیر کی نقل اتاری۔ "توبہ! تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات دے دی۔"

"تو اور کیا کہتا؟ ڈیڈی نے جو بھی فیصلہ کیا ہوگا ٹھیک ہی کیا ہوگا اور بھابھی کو بھی وہ پسند ہے تو پھر اور کیا اعتراض کرنا۔" قاسم کو جواب دیتے ہوئے اس نے خود کو بھی تسلی دی۔

جسے وہ وقتی جذبہ سمجھتا رہا تھا۔ وہ ہرگز وقتی نہیں تھا۔ لیکن یہ بات سمجھنے میں اس نے خود ہی بہت دیر کردی تھی۔ اس لیے کوئی اور قصوروار نہیں تھا۔ اسے وہ لڑتی جھگڑتی لڑکی پہلی ہی نظر میں پسند آئی تھی جب وہ اس سے لائبریری کا پوچھنے آئی تھی۔ لیکن کی... اس بات کو سمجھنے میں اس نے خود ہی کوتاہی سے کام لیا تھا۔ تو اب کسی سے کیا کہتا۔ وہ اٹھ کر جانے لگا تو ضوفی نے ایک خاکی لفافہ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ لو! اپنی ہونے والی دلہن کی تصویر ہی دیکھ لو۔ عائزہ نام ہے۔" ضوفی کی آنکھیں شریر سی چمک لیے ہوئے تھیں۔ فائزہ اور فائزہ کی ایک کزن نے اسے یونیورسٹی کے بہت سے قصے سنائے تھے۔ عمیر نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے کمرے کی رائٹنگ ٹیبل پہ ڈال دیا۔

"ایک دفعہ ہی دیکھ لوں گا۔"

✲ ✲ ✲

الارم کی تیز آواز سے آفاق ہڑبڑا کر اٹھا۔ آج پہلا روزہ تھا اور الارم کے مطابق وہ پچیس منٹ لیٹ ہوچکا تھا۔ وہ جلدی سے واش روم میں گھس گیا۔ منہ پر چھپاکے مارے اور تولیے سے چہرہ رگڑتا ہوا باہر نکلا۔

"اف! ان لوگوں کو جگانا بھی عذاب ہے۔ آج پہلی سحری ہی لیٹ ہوگئی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر جانے لگا تو کسی چیز کو اس کے پاؤں کے ٹھوکر لگی... وہ ضوفی کے جوتے تھے۔ یک دم آفاق کا سویا ہوا دماغ جاگ گیا۔ اس نے اپنے بستر کی طرف دیکھا۔ جہاں اس کے ساتھ کمرہ شیئر کرنے والا دوسرا وجود نہیں تھا۔

"اوہ!" اس کے منہ سے اطمینان بھری سانس نکلی اور ساتھ ہی اسے اپنی پچھلے رمضان والی پریڈ یاد آگئی۔ سحری بنانا، ساتھ ساتھ بھائیوں کو جگانا، پھر برتن سمیٹنا، لیکن آج وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ضوفی اندر داخل ہوئی، لیکن اسے جاگتا پا کر وہ دروازے میں ہی رک گئی۔

"وہ آپ جلدی سے آجائیں، سحری کے لیے کم وقت رہ گیا ہے۔" وہ کہہ کر واپس بھاگی تو وہ اپنے بال ہاتھوں سے درست کرتا ہوا نیچے چلا آیا۔

حیرت کا ایک جھٹکا تھا جو اسے لگا تھا۔ سب ہی ٹیبل پر موجود تھے۔ سوائے اس کے۔ شہریار اور عذیر بھی۔ اور بالکل فریش موڈ میں... یہ وہ تھے جنہیں سحری سے پانچ منٹ پہلے سحری کا خیال آتا تھا اور آج وہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"ارے واہ! آج تو بڑے بڑے لوگ نظر آرہے ہیں، جو مُردوں سے شرط لگا کر سویا کرتے تھے۔" کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے آفاق بولا تو سب ہی کے چہروں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جب جگانے والے اتنے اچھے ہوں تو پھر شرط چھوڑنی ہی پڑتی ہے۔" عذیر پراٹھے لاتی ہوئی ضوفی کو دیکھ کر بولا۔ آفاق کی نظریں بھی ضوفی کی طرف اٹھیں۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا۔ اگر وہ ہائی سوسائٹی کی، اپنے جیسی ہی لڑکی سے شادی کرتا تو کیا وہ یہ سب کرتی؟ یہ سب لوگ اسی طرح خوش ہوتے؟ اس بات کے ففٹی ففٹی چانس تھے اور ففٹی پرسنٹ رسک بھی تھا... اگر گھر کی بڑی بہو ہی کوئی ایسی ویسی آجاتی تو...

"تو ممی جاتے جاتے بھی میری زندگی بنا گئیں۔" اس نے مسکرا کر سوچا۔

"اہم اہم بھائی! کیا بھابھی کو پہلی دفعہ دیکھ رہے ہیں۔" شہریار نے آفاق کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو شیراز صاحب کے سامنے ایسی بات پر وہ جھینپ گیا۔ شیراز صاحب کو بھی خوش گوار سی حیرت اور پھر خوشی بھی ہوئی۔

"آں نہیں تو۔" وہ اور کیا کہتا، اس نے تو اس کے بارے میں سوچا بھی پہلی دفعہ تھا۔

"بھائی! سحری کے لیے تھوڑا ہی ٹائم بچا ہے۔ یہ سوچ بچار پھر کبھی کر لیجیے گا۔" عذیر بولا۔ تو وہ اپنے سامنے پڑے کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔

✲ ✲ ✲

عذیر کے سسرال والوں نے ہاں کر دی تھی۔ اب ان سب کا ارادہ تھا کہ آخری عشرے میں منگنی بھی کر آئیں اور عیدی وغیرہ بھی دے آئیں۔ افطاری میں ابھی کچھ وقت تھا۔

عمیر، عذیر اور قاسم کی آج کل چھٹیاں تھیں۔ سو وہ سب ضوفی کے ساتھ روزانہ ہی شاپنگ کے لیے

جاتے تھے۔ تین، تین دلہنوں کی شاپنگ کرنی تھی۔ ضوفی بے چاری گھر اور بازار کے بیچ گھن چکر بن چکی تھی۔۔۔ ماہ رخ کا تو شاید اب رخصت ہو کر ہی آنے کا ارادہ تھا۔ ایک بھی چکر نہیں لگایا تھا اس نے رمضان میں۔۔۔ آج دلہنوں کے لیے منگنی کے جوڑے لینے تھے۔

"اوہو! تم لوگوں کو بھی بس ایک جیسی ہی چیز پسند کرنی ہوتی ہے۔ کم از کم کلر ہی مختلف لے لو۔" ضوفی سے غلطی ہو گئی کہ اس نے ان دونوں کو اپنی اپنی دلہنوں کے لیے خود سے جوڑے پسند کرنے کا کہہ دیا۔ اب دونوں کو ہی ایک ہی جوڑا اور کلر پسند آیا تھا اور ضوفی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"بھابھی! یہی کلر فائزہ کا فیورٹ ہے نا۔" عذیر نے بتایا تو عمیر فوراً "اپنی پسند سے دستبردار ہو گیا۔۔۔ ضوفی نے ویسا ہی جوڑا دوسرے کلر میں لے لیا۔

☼ ☼ ☼

کمبائن منگنی کے لیے ایک ہال بک کروایا گیا تھا۔ افطاری کے بعد ذرا لیٹ فنکشن تھا۔ شادی کے بعد وہ آج پہلی دفعہ تیار ہوئی تھی۔ سی گرین اور براؤن کلر کے خوب صورت سے نگینوں والے سوٹ میں ہلکا پھلکا میک اپ اس نے فنکشن کے لحاظ سے ہی کیا ہوا تھا۔ سائیڈ سے مانگ نکال کر اس نے بالوں کو پیچھے کر کے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ اندر آتا ہوا آفاق ٹھٹھک کر رک گیا۔ اسے آج معلوم ہوا تھا کہ ضوفی کے بال اتنے لمبے ہیں۔ اس کے اندر آتے ہی وہ باہر چلی گئی۔

"ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ پھر مجھے کس بات کا احساس کمتری ہے؟ پڑھی لکھی ہے، بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے اسے، ہر بات اس میں موجود ہے جو ایک اچھی شریک حیات میں ہونی چاہیے پھر اور کیا چاہیے مجھے؟ کس چیز کا انتظار ہے مجھے؟ اگر اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو جو رویہ میں نے اس کے ساتھ اپنائے رکھا ہے۔ اس پر زمین آسمان ایک کر دیتی۔ مگر یہ تو۔۔۔" وہ سر پکڑ کر بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

رسم کے لیے دونوں دولہاؤں کو اسٹیج پر لایا گیا تو وہ اسٹیج پر آکر بت بن گئے۔۔۔ ٹکر ٹکر دونوں دلہنوں کو دیکھنے لگے۔

"آہم آہم! کیا بات ہے بچو، آج یہیں پوری رات گزارنے کا پروگرام ہے۔" آفاق نے پیچھے سے آکر کہا تو وہ سکتے سے باہر آئے۔

"مگر یہ دونوں۔" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"اپنی شکلیں کبھی دیکھی ہیں آئینے میں؟" شہریار نے کہا۔

"جب تم دونوں ہو سکتے ہو تو یہ کیوں نہیں؟ دوسروں پر پابندی ہے کیا؟" قاسم نے کہا تو وہاں کھڑے تمام افراد بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔ کیونکہ وہاں بیٹھی دونوں دلہنیں بالکل ایک جیسی تھیں جیسے وہ دونوں خود۔۔۔

"بھئی! یہ ضوفی بھابھی کی پلاننگ تھی۔" فہد نے کہا۔

"لیکن ایک مسئلہ ہے۔ اب پتا کیسے چلے گا کہ فائزہ بھابھی کون ہیں اور عائزہ بھابھی کون؟ کہیں دلہنیں بدل نہ جائیں۔" عاصم کی اپنی ہی پریشانی تھی۔

"او۔۔۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے۔" وہ دونوں خوشی سے بولے اور اپنی اپنی دلہنوں کے ساتھ جا بیٹھے۔

"ارے! تم لوگوں کو کیسے پتا چلا؟" فہد نے حیرت سے پوچھا۔ باقی سب بھی حیران تھے۔

"ضوفی بھابھی کی مہربانی تھی کہ ہم نے مل کر ہی اپنی اپنی پسند کے منگنی کے جوڑے لیے تھے۔" عذیر نے بتایا تو اسٹیج پر کھڑے ہجوم نے ہوٹنگ شروع کر دی۔ منگنی کی رسم کے بعد سب لوگ ادھر ادھر ہو گئے تو فائزہ اور عذیر باتوں میں لگ گئے۔ جبکہ عمیر سوچ رہا تھا کہ نہ جانے عائزہ کون تھی اور فائزہ کون اور اسے جو پسند تھی۔ وہ فائزہ ہی تھی یا پھر۔۔۔ شکل چاہے دونوں کی ایک جیسی ہی تھی۔ مگر ایک خلش سی تھی۔۔۔ وہ اسی خیال میں تھا جب کسی نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹی۔

اس نے چونک کر اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی منگیتر کو دیکھا۔

"زبردستی کی ہے کسی نے؟ جو سڑے ہوئے بینگن جیسی شکل بنا کر بیٹھے ہوئے ہو۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ یونیورسٹی میں کیا بکواس کر رہے تھے؟ ہاں بولو۔" عمیر آنکھیں پھاڑے عائزہ کو دیکھے جا رہا تھا۔

"بالکل وہی انداز، وہی باتیں، تیز مرچ والی۔" وہ بڑبڑایا۔

"اب ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟ نظر لگاؤ گے کیا؟" عائزہ کو غصہ آگیا۔

"یاہو!" وہ یکدم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے رے!" وہ بے چاری گھبرا کر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ فائزہ اور عذیر نے بھی گھبرا کر اس کی طرف دیکھا کہ اس وقت اسے کیا دورہ پڑا ہے۔

"کیا ہوا ہے؟" عذیر نے پوچھا۔ مگر وہ اسٹیج سے اتر کر دوڑتا ہوا تھوڑی دور بیٹھی ضوفی کی طرف گیا جو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ "بھابھی آپ کو معلوم تھا نا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔

"بالکل! مگر بقول تمہارے اس لڑکی کی تو۔۔۔" ضوفی نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ویسے اگر تم تصویر دیکھ لیتے تو تمہیں سارے سوالوں کا جواب مل جاتا۔" ضوفی نے کہا۔

گھر واپس آتے ہی سب سے پہلے ان دونوں نے وہ تصویر والا لفافہ تلاش کیا اور تصویر دیکھ کر وہ دونوں ہی سر پیٹ کر رہ گئے۔

"کیا تھا اگر تم پہلے اسے دیکھ لیتے۔" عذیر نے عمیر سے کہا، کیونکہ وہ تصویر دونوں بہنوں کی تھی، جس میں وہ دونوں ہنس رہی تھیں۔ تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا خط بھی تھا۔

"ڈیر ٹوئنز!

دوسروں کو اپنی شکلوں کی بدولت بے وقوف بنانے والو! کیسا لگا خود بے وقوف بن کر؟ ہماری ایک کزن نے ہمیں پہلے ہی تم دونوں کے متعلق وارن کر دیا تھا۔ سو اس دفعہ تم لوگوں کی چال تم پر ہی الٹ گئی اور تم لوگوں کو پہچاننے کے لیے اس نے ایک نشانی بھی بتا دی تھی۔ عمیر کی پیشانی پہ تل اور عذیر کی ٹھوڑی پر۔۔۔ خیر! کیسا لگا خود اپنے ہی دام میں آکر۔

فائزہ اور عائزہ"

خط پڑھ کر وہ دونوں ہی اپنے سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گئے۔

"یہ تو واقعی ہمارے ساتھ ہو گیا۔" عمیر بولا تو عذیر نے بھی اس کی تائید کی۔

"بالکل۔"

☼ ☼ ☼

آج ستائیسویں شب تھی۔ سب عبادت کر کے اب سو رہے تھے۔ سوائے ضوفی اور فہد کے۔ دونوں ہی اپنے اپنے کمروں میں ابھی تک عبادت میں مصروف تھے۔

ضوفی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مانگے تو کیا مانگے۔ اتنا کچھ تو اسے مل گیا تھا سوائے۔۔۔

"یا اللہ! تو دلوں کا حال بہتر جانتا ہے۔ تو سب جانتا ہے۔ جو دعا میرے دل میں ہے۔ مگر میرے لبوں پر نہیں آ پا رہی۔ اے اللہ تو تو وہ بھی سن لیتا ہے۔"

ادھر فہد کے لبوں پر بھی کچھ ایسی ہی دعا تھی۔

"یا اللہ! وہ میری ذمہ داری تھی۔ میں نے اپنی ذمہ داری نبھانے میں کوتاہی کی۔ یا اللہ! تیرے بعد اس دنیا میں صرف میں ہی اس کا سہارا تھا۔ میں ہی اسے بھول گیا۔ اسے بیچ منجدھار میں بھول گیا۔ یا اللہ! ایک دفعہ وہ مجھے دوبارہ مل جائے۔ میں اپنی تمام ذمہ داریاں نبھاؤں گا۔ اے اللہ! صرف ایک دفعہ۔"

☼ ☼ ☼

"آپی! اپنے اس چھچھورے دیور کو سمجھا دو، ورنہ میں اس کا سر پھاڑ دوں گی۔" آج چاند رات تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ لوگ ماہ رخ کو لے کر آگئے تھے۔ کیونکہ عید کی چھٹیوں کی وجہ سے ہاسٹل خالی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی روم میٹ بھی آئی تھی۔

جو کہ اب اس کی گہری سہیلی بھی بن چکی تھی۔

اس وقت لاؤنج میں ماہ رخ کا ہی سامان بکھرا پڑا تھا۔ پرسوں اس کی رخصتی تھی۔ شہریار ابھی ابھی باہر سے آیا تھا اور یہیں لاؤنج میں ڈٹ گیا تھا۔

"لو بھئی عمیر! دیکھ لو آج تمہاری خواہش کے مطابق عید کی تیاری بھی ہو گئی ہے۔ چوڑیاں' مہندی' وغیرہ' وغیرہ۔" شہریار نے ماہ رخ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"بھابھی! آپ نے عید کے کیسے کپڑے لیے ہیں۔" قاسم نے اچانک پوچھا تو ضوفی گڑبڑا گئی۔ جبکہ آفاق سمیت سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"وہ... میرے اتنے سارے نئے سوٹ پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں نے نہیں لیے۔"

"جی! ہمیں پتا تھا' آپ کا یہی جواب ہوگا۔ کسی کو آپ کا خیال ہی نہیں۔ اس لیے ہم سب بھائیوں نے آپ کے لیے عید کی شاپنگ کی ہے۔" عمیر نے کہا۔ اس کا سارا زور "کسی" پر ہی تھا۔ آفاق نے چونک کر ضوفی کو دیکھا۔ یعنی اس نے سب کو بتایا ہوا تھا سب کچھ۔

"بھابھی کی طرف کیا دیکھتے ہیں۔ ہمیں نظر نہیں آتا کیا۔" شہریار نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ اتنے میں عاصم اور قاسم کچھ پیکٹ اٹھا کر لائے۔

"یہ لیں بھابھی! یہ ہماری طرف سے آپ کے لیے عید گفٹ۔" انہوں نے وہ سارے پیکٹ ضوفی کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ خوب صورت سا سوٹ' میچنگ سینڈل' چوڑیاں' جیولری اور بھی نہ جانے کیا' کیا اٹھا لائے تھے وہ... ضوفی کی آنکھیں اتنی محبت پر بھیگ گئیں۔ ابھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ شیراز صاحب اپنے کمرے سے نکل آئے۔

"ارے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنے کمرے میں... خبردار بغیر کسی ضرورت کے اپنے کمرے سے باہر نکلے تو..." انہوں نے شہریار کو جھاڑا۔ شہریار منہ بنا کر اوپر جانے لگا تو عمیر نے اسے منہ چڑایا' اتنے میں فہد باہر سے آیا۔ وہ شکل سے ہی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"تم؟" فہد کی حیران نظریں صوفے کے کونے پر چپ چاپ بیٹھی لڑکی پر پڑیں۔ جو ارد گرد سے بے نیاز کسی اور جگہ ہی پہنچی ہوئی تھی۔ فہد کی آواز پر گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی اور فہد کو دیکھ کر تو جیسے بت بن گئی۔

"فہد بھائی! یہ میری روم میٹ ہے۔ اس کا اس دنیا میں ایک شوہر کے سوا کوئی نہیں وہ مردود اسے بھول کر نہ جانے کہاں دفعان ہو گیا ہے۔ بڑا ہی خبیث انسان..." ماہ رخ نے تعارف کا فریضہ انجام دینا چاہا۔ مگر فہد نے جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا اور تیر کی طرح اس لڑکی طرف بڑھا۔

"کہاں چلی گئی تھیں تم؟ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں۔ بس پاگل ہونے کی کسر رہ گئی تھی۔" اس نے صبا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جبکہ ماہ رخ نے صورت حال سمجھ آتے ہی زبان دانتوں تلے دبالی۔ وہ فہد کو کیسے کیسے القابات سے نواز چکی تھی۔ شہریار سیڑھیوں سے ہی پلٹ آیا تھا۔

"بھابھی نمبر تین۔" قاسم ہنستے ہوئے عمیر اور عذیر کے کانوں میں بولا۔

"آپ تو مجھے بھول ہی چکے تھے۔ واپس ہی نہیں آئے۔ ہاسٹل بند ہو گیا تھا تو کہاں جاتی میں۔" آخر کار صبا نے بھی زبان کھولی۔

"تو بتا تو دیتیں۔" فہد نے ایک دفعہ پھر اسے جھنجھوڑ ڈالا تو وہ زور و شور سے رونے لگی۔ جبکہ شہریار نے آکر فہد کو پیچھے کیا۔

"فہد! بس کرو! غلطی تمہاری اپنی ہے۔ اس پہ کیوں اپنی فرسٹریشن نکال رہے ہو۔" شیراز صاحب نے کہا تو وہ سر پکڑ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔

"اتنے مہینوں سے ڈھونڈ رہا ہوں اسے... دماغ خراب ہو گیا تھا میرا یہ سوچ سوچ کر کہ نہ جانے کہاں گئی ہوگی۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تو صبا نے روتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ تھکا ہو الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

"چلو! اب بس کرو جو بھی ہو گیا' ہماری بہو خیر خیریت سے اپنے گھر آگئی ہے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔" شیراز صاحب نے صبا کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم اب بیٹھ کیوں گئے ہو؟ جاؤ! جاکر صبا بیٹی کو عید کی شاپنگ کرواؤ! پرسوں ماہ رخ کی رخصتی کے ساتھ تم لوگوں کا ولیمہ بھی ارینج کر لیتے ہیں۔" شیراز صاحب نے منٹوں میں سارا پروگرام ترتیب دے دیا۔

"مگر!" صبا نے کچھ کہنا چاہا، مگر فہد کھڑا ہو چکا تھا۔

"چلو!"

گاڑی اسٹارٹ کیے وہ فرنٹ ڈور کھولے بیٹھا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی۔

"ایم رئیلی سوری... مگر آپ ہی بتائیں! میں کیسے آپ کو بتاتی سب حالات۔" فہد کی حالت دیکھ کر صبا نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو قصوروار ٹھہرا کر اس سے معافی مانگ رہی تھی۔

"پلیز کچھ تو بولیں۔" اس کے مسلسل چپ رہنے پر اس نے کہا۔

"آج اتنے عرصے بعد تمہاری آواز سننے کو ملی ہے۔" وہ گاڑی روک کر اس کی طرف مڑا۔ "سو تم ہی بولتی رہو نا۔"

"جی!" وہ حیران رہ گئی۔ اسے لگا تھا کہ ابھی وہ اور غصہ کرے گا مگر...

"مجھے بہت غصہ تھا تم پہ، لیکن تمہیں دیکھتے ہی سب ختم ہو گیا۔ سو اب سوری کی ضرورت نہیں، کیونکہ غلطی تو میری ہی تھی۔ سب کو بتا دیتا تو...

میں اکیلا تو پھر بھی بھول جاتا۔ مگر یہ شیطانوں کی فوج بھولنے نہ دیتی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ویسے مسز آپ بھولنے والی چیز نہیں ہیں۔" آنکھوں میں شرارت لیے وہ اس کی طرف جھکا تو وہ جھینپ کر باہر دیکھنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" فہد کے جانے کے بعد شہریار کو اپنے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ جبکہ ماہ رخ اوپر ہی دوسرے کمرے میں تھی۔ اب آفاق نے عمیر، عذیر کو لک کے باہر جاتے دیکھا تو پوچھا۔

"بھائی! سمجھا کریں نا... عید کا چاند دیکھنے جا رہے ہیں نا۔" عمیر نے کہا۔

"کیا مطلب؟" آفاق نے پوچھا۔

"آپ کو کہاں مطلب سمجھ آتا ہے۔ آپ کا چاند تو آپ کے اس پاس ہی ہے۔ پر آپ کو دکھائی ہی نہیں دیتا۔" عذیر نے کہا اور دونوں باہر نکل گئے۔ عاصم اور قاسم دونوں نہ جانے کون سے کونے کھدرے میں گھسے ہوئے تھے۔ میدان صاف تھا۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ضوفی جلدی جلدی صبح کے لیے چیزیں تیار کر رہی تھی۔ وہ جا کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"آ... آپ؟" وہ مڑی تو ڈر گئی۔

"ہاں جی میں... میں نے سوچا میں بھی عید کا چاند دیکھ لوں، جو میرے آس پاس ہے۔" اس نے ضوفی کے گیلے ہاتھ پکڑ لیے، ضوفی کو گویا کرنٹ لگا تھا۔

"مم... مطلب؟" بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔

"صرف ایک بات کہنی ہے۔ اگر ہزار والٹ کا بلب بھی لے کر ڈھونڈتا تو مجھے تم جیسی لڑکی نہیں ملتی۔ مجھے تم سے محبت نہیں تھی۔" اس کی اس بات پہ ضوفی نے اس کی طرف دیکھا۔

"مگر اب شدید قسم کی ہو گئی ہے۔ نہ جانے کیا جادو ہے تم میں۔"

"وہ... مجھے کام کرنا ہے۔" اس نے گھبرا کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر آفاق کی گرفت کافی مضبوط تھی۔

"اتنے عرصے کام ہی تو کرتی رہی ہو، بس اب... اور کچھ نہیں کرنا سوائے..." ضوفی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آفاق نہایت تسلی اور فرصت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم نے مہندی نہیں لگوائی؟" اس نے پوچھا تاکہ وہ کچھ تو بولے۔

"نہیں، وہ جلدی اتر جائے گی نا۔"

"لیکن مجھے بہت پسند ہے۔ شادی کی پہلی رات تمہاری مہندی کی خوشبو نے مجھے بہت ڈسٹرب کیا تھا۔" اب وہ کیا کہتی۔

"چلو آؤ! شاپنگ بھی تو کرنی ہے۔"

"مگر وہ تو سب نے..."

"سب نے گفٹ دیا ہے۔ مگر کل تو تم میری پسند کے کپڑے پہنو گی نا۔" اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اسے کھینچتا ہوا لے کر باہر نکل آیا۔

✡ ✡ ✡

"تم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ماہ رخ اچھل پڑی۔ شہریار اچانک ہی اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"وہ عید کا چاند دیکھنے۔"

"مطلب...؟" وہ حیران ہوئی۔

"بھائی! آپ یہ عید کا چاند باہر جا کر فرصت سے دیکھ سکتے ہیں۔ ڈیڈی کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔" باہر سے قاسم کی آواز آئی تو اس نے جھٹ ماہ رخ کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔

"انکل نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔" ماہ رخ رک گئی۔

"تم اگر یہیں کھڑی رہیں تو ضرور دیکھیں گے۔" وہ اسے لیے باہر آ گیا۔

"مگر کہاں جانا ہے۔"

"بھئی! شادی سے پہلے، پہلی اور آخری چاند رات ہے، اس پہ بھی ڈیڈی نے پہرہ لگا دیا تو کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا نا۔" وہ مزے سے بولا تو وہ بھی اس کی نرالی منطق سن کر ہنس پڑی۔

ارے اتنی جلدی ہے آپ کو دی اینڈ کی؟ ابھی تو آپ نے قصر لائلہ کی رونق دیکھی ہی نہیں۔ چلیے! پھر چلتے ہیں، قصر لائلہ کا ایک اور روپ دیکھنے کے لیے۔

جی جی! یہ آوازیں بالکل قصر لائلہ سے ہی آ رہی ہیں۔ اندر چلیے نا، راستہ تو یاد ہی ہو گا آپ کو، بالکل وہی والا۔

آج عید کا دن ہے اور ساتھ ہی شہریار صاحب کی ڈھولکی بھی۔ او ہو اندر چلیں، سب معلوم ہو جائے گا۔

جی تو یہ لاؤنج میں ہی سب جمع ہیں۔ عمیر صاحب ڈھولک کم بجا رہے ہیں اور عائزہ کو زیادہ تاڑ رہے ہیں، لیکن وہ بھی عائزہ ہی ہے۔ برابر انہیں اگنور کیے جا رہی ہیں۔ فائزہ صاحبہ ماہ رخ بی بی کے پاس گھسی بیٹھی ہیں۔

سامنے والے صوفے پہ فہد صاحب اپنی مسز کے ساتھ براجمان ہیں اور آج تو ان کی شوخیاں عروج پر ہیں۔ صبا بھی کل کی نسبت آج زیادہ پر اعتماد نظر آ رہی ہے۔ فائزہ اگر ماہ رخ کے دائیں جانب براجمان ہیں تو عذیر صاحب بائیں سائیڈ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ قاسم اور عاصم پہلے تو گانے گانے میں مصروف تھے۔ مگر کچھ دیر پہلے سامنے والے اور ساتھ والے بنگلے سے دو مہمان لڑکیاں آئی تھیں۔ سو ان کی توجہ اب ادھر زیادہ اور گانوں پر کم تھی۔ شیراز صاحب ڈرائنگ روم میں اپنے دوستوں کو کمپنی دے رہے تھے۔

اوہ! دولہا صاحب تو غائب ہیں۔ یہی سمجھے نا آپ۔

ارے بھئی! ان کے ساتھ کل رات بڑی بری ہوئی، واپسی پر شیراز صاحب نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ سو اب وہ شیراز صاحب کی نگرانی میں تھے۔ یعنی ڈرائنگ روم میں بیٹھے جمائیاں لے رہے ہیں۔ مگر خیر! اتنے سیدھے تو وہ بھی نہیں ہیں۔ کسی نہ کسی کام سے باہر آ جاتے اور پھر شیراز صاحب کو زحمت کرنا پڑتی ان کے کان پکڑ کر واپس لے جانے کی۔

ارے! یہ کون ہے... واؤ... واٹ آ کپل... یہ اپنے... اہم آفاق صاحب اور ضوفی بی بی ہیں۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے، آفاق کی تو سرگوشیاں ہی ختم ہونے کو نہیں آ رہیں۔ اور ضوفی کے چہرے کو تو آج کسی میک اپ کی ضرورت ہی نہیں۔

آج قصر لائلہ کے آنگن میں یکے بعد دیگرے کئی چاند اترے تھے اور قصر لائلہ وجود زن سے سج سا گیا تھا۔ کہاں تو ایک سال پہلے تک یہاں کوئی صنف نازک نامی کوئی چیز ہی نہیں تھی اور آج تو جیسے اس کی قسمت جاگ اٹھی تھی۔

اچھا چلیں اب! انہیں ایک خوشحال اور خوش گوار زندگی کی دعا دیں اور اپنے اپنے گھر جائیں۔ دوسرے کے گھر بن بلائے جانا اچھی بات نہیں ہوتی... اپنے گھر جا کر عید منائیں اور خوش رہیں اپنے خرچے پر! عید مبارک!

✡

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نامناسب گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اسپتال میں اریبہ کے پاس ساجدہ بیگم ٹھہری ہوئی ہیں۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد نے اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہا۔ بعد میں انہیں پتا چلا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

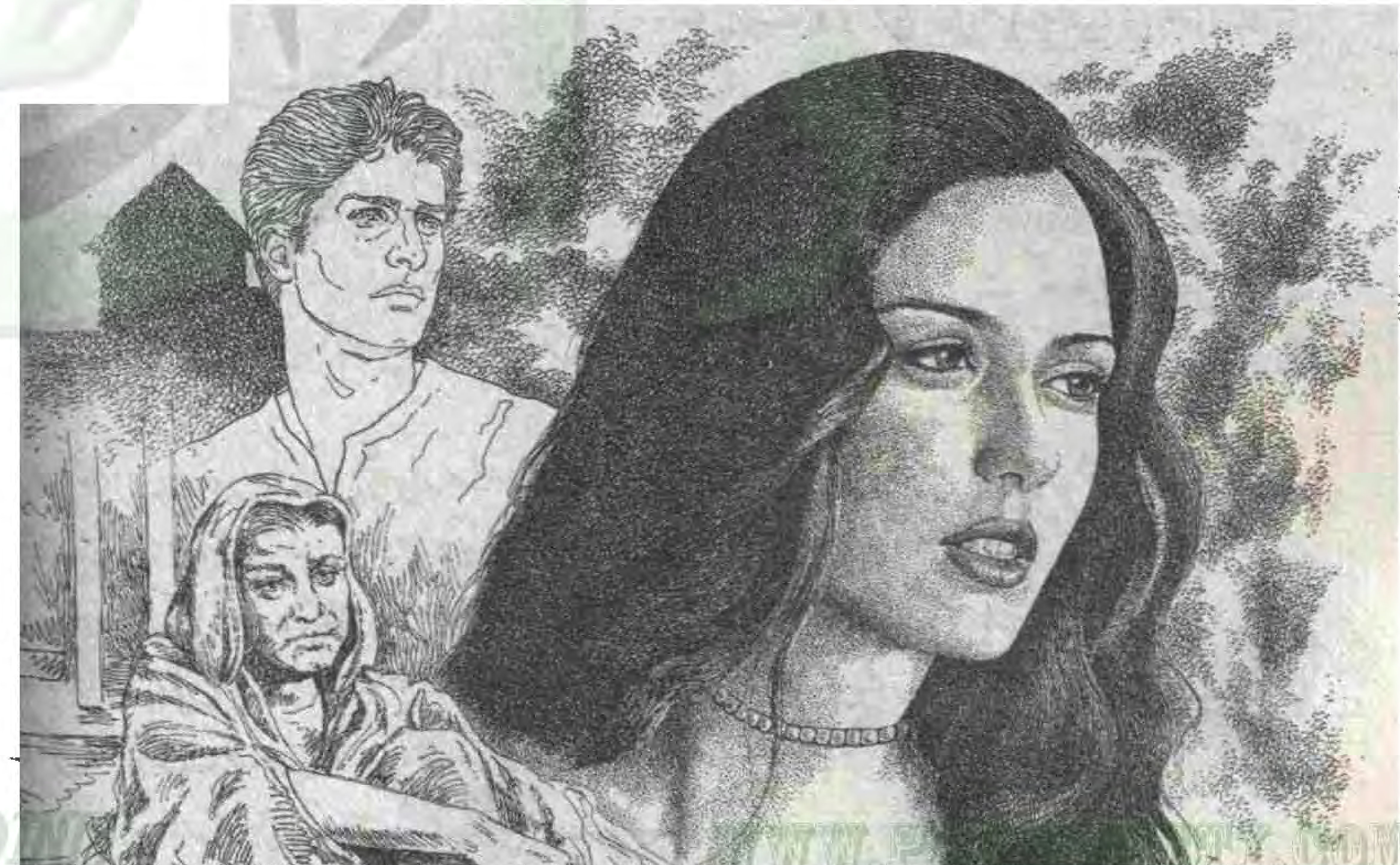
وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔

وہ اسے شہباز درانی کے ساتھ دیکھ چکی ہے۔

رازی، اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔

تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ دل گرفتہ سا ہسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔



وہاں سے وہ گاؤں جاتا ہے مگر ابا کو نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہو جاتی ہے۔ سارہ' سمیر سے اچھی ہوئی گفتگو کرتی ہے۔
یاسمین' اریبہ کی جلد شادی کی فکر میں پڑ گئی مگر اریبہ سختی سے منع کر دیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو ڈنر پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ بھی الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ جا رہا ہے۔ اریبہ اور اجلال اسے سی آف کر کے واپسی میں سی ویو جاتے ہیں۔ وہاں اسے سارہ کا خیال آجاتا ہے۔ وہ گھبرا کر واپس آجاتا ہے۔

شمشیر علی گاؤں گیا تو ابا نے اسے اکیلا دیکھ کر خوب برا بھلا کہا کہ وہ تاجور کو شہر میں تنہا چھوڑ آیا۔ شمشیر علی تاجور کو لانے کا کہہ کر شہر واپس آگیا۔

اجلال رازی' اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہو جاتا۔ اریبہ اس کے ان پل پل بدلتے رویوں پر بے حد پریشان رہنے لگی۔

اجلال' سارہ سے ملا۔ وہ اس سے بے حد نادم تھا۔ سارہ نے اس سے کہا کہ جو کچھ ہوا' وہ اسے بھول جائے' کیونکہ اریبہ اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ مگر اجلال اس کے لیے فکر مند ہے۔

اجلال کے کہنے پر سارہ' سمیر سے ملی۔ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں سمیر سے بات کی۔ اس نے سمیر کو بتایا کہ اس کی ایک دوست کے ساتھ کچھ غلط ہو گیا تھا' مگر پھر بھی اس کے منگیتر نے اسے قبول کر لیا۔ سمیر نے اس منگیتر کے فیصلے کو وقتی ابال قرار دیا اور کہا کہ بعد میں وہ اپنے اس فیصلے پر پچھتائے گا۔

شمشیر علی کا دوست فضل کریم اسی اسپتال میں ملازم تھا جہاں اس نے تاجور کو داخل کرایا تھا۔ شمشیر علی وہاں گیا' مگر اسے کچھ پتا نہ چل سکا۔ البتہ اسے وہاں اریبہ نظر آگئی۔ شمشیر علی نے اس سے شدید نفرت محسوس کی۔ کیونکہ اس کے باپ نے ہی اسے جیل بھیجا تھا۔

اریبہ کالج سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کے منہ پر رومال رکھ دیا۔ جلد ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

بارھویں قسط

جب اریبہ کو ہوش آیا وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ ناسمجھی کی کیفیت میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی پھر اچانک اس کا ذہن بیدار ہوا تھا۔

"مجھے کڈنیپ (اغوا) کیا گیا ہے۔" اس خیال کے ساتھ ہی وہ پریشان ہو گئی۔ اس کے بعد کیوں کا سوال ہی نہیں اٹھا اور نہ ہی اس نے خود کو شکنجوں سے آزاد کرنے کی فضول سی کوشش کی بلکہ بہت احتیاط سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یہ کمرہ تھا یا لاؤنج' اس میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ تخت رکھا تھا اور ایک آرام کرسی' باقی کچھ لکڑیاں اور فرش پر لکڑی کا برادہ بکھرا ہوا تھا جہاں وہ بیٹھی تھی۔ اس کے بائیں طرف دروازہ تھا' اس کی نظریں دروازے پر ٹھہر گئیں جیسے ابھی کوئی اندر آئے گا۔ لیکن سامنے کی طرف سے کھٹکے کی آواز پر اس نے تیزی سے گردن سیدھی کی تھی۔ ساتھ ہی اس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا تھا جبکہ فوراً" کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے غور کیا تو وہاں چھوٹا سا کچن تھا اور غالباً" وہیں کوئی موجود تھا۔

"یا اللہ' یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ پروردگار! مجھ پر رحم کر۔ مجھ پر کوئی ایسی آزمائش نہ ڈالنا جو میری رسوائی کا باعث ہو۔ میرے اللہ! میں بہت کمزور' بہت عاجز ہوں' تو ہی میری عزت کا رکھوالا ہے۔"

وہ انتہائی خوف میں مبتلا آنکھیں بند کیے دل ہی دل میں گڑگڑا رہی تھی کہ آہٹ پر فوراً" آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی پھر اس کی نظریں اوپر تک اٹھی تھیں۔

چھ فٹ سے اونچا وہ شخص شکل سے ہرگز ڈاکو لٹیرا نہیں لگ رہا تھا۔ چہرے پر کرختگی جانے حالات کی پیدا کردہ تھی یا محض اس پر رعب جمانے کے لیے وہ دانتوں پر مضبوطی سے دانت جمائے جبڑے بھینچے کھڑا تھا۔

"اوں۔ اوں۔" منہ پر ٹیپ چپکا ہونے کے باعث وہ یہی آواز نکال سکتی تھی۔

"دیکھو....!" وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر وارننگ کے انداز میں کہنے لگا۔ "اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو تمہیں تو میں بعد میں دیکھوں گا' پہلے تمہارے باپ کا کام تمام کروں گا۔"

وہ خائف ہو کر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی جیسے کہہ رہی ہو' میں بالکل شور نہیں کروں گی۔

"ہوں....!" وہ ہاتھ بڑھا کر بے دردی سے اس کے منہ پر سے ٹیپ کھینچ کر پوچھنے لگا۔

"کیا چاہیے....؟"

"اف۔!" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ چند لمحے اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر تکلیف کم کرنے کی کوشش کی پھر بمشکل اتنا کہہ سکی۔

"واش روم۔" اس نے مزید کوئی وارننگ نہیں دی۔ اس کے ہاتھ کھول کر اس کے عقب میں اشارہ کر دیا تھا۔

وہ کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ جما کر گویا خود کو سہارا دے کر کھڑی ہوئی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ پلٹ کر دو قدم چلنا انتہائی محال تھا۔ وہ واپس کرسی پر ڈھے گئی تھی۔

"ہونہہ۔ بزدل باپ کی بزدل بیٹی!"

وہ حقارت سے بولا اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمرے اور پھر ملحقہ باتھ روم میں دھکیل کر دروازہ باہر سے کھینچ لیا تھا۔

یہ اتنا آناً "فاناً" ہوا تھا کہ وہ چکرا گئی تھی۔ واش بیسن تھامے کتنی دیر آنکھیں بند کیے کھڑی رہی جب ذرا حواس ٹھکانے آئے تب اس نے دھیرے دھیرے سر اونچا کر کے آنکھیں کھولیں تو سامنے آئینے میں اپنی ہی شکل نظر آئی۔ اتنی سی دیر میں وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ ڈر' خوف نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس نے واش بیسن کا نل پورا کھول دیا اور منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی پھر ہاتھوں سے چہرہ تھپتھپاتے ہوئے اس کا دل چاہا' چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لے یہاں تک کہ آس پاس کے لوگ جمع ہو جائیں لیکن فوراً" اس کی دھمکی یاد آئی۔

"اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو تمہیں تو میں بعد میں دیکھوں گا' پہلے تمہارے باپ کا کام تمام کروں گا۔"

"نہیں۔" وہ ڈر گئی۔ اگر وہ کہتا' تمہیں جان سے مار دوں گا تب تو وہ پروا بھی نہ کرتی۔

"پتا نہیں کون ہے اور جانے کس ارادے سے مجھے یہاں لایا ہے۔ شاید ڈیڈی سے رقم کا مطالبہ کرے گا' اف! پتا نہیں کیا ٹائم ہوا ہے' میں گھر نہیں پہنچوں گی تو۔"

اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہیں گیا۔ گھبرا کر واش روم سے نکلی تو کمرے میں رک گئی۔ یہ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ ایک بیڈ جس پر چوکور خانے والی چادر بچھی تھی۔ کونے میں لکڑی کی الماری اور دیوار کے ساتھ دو سیٹ کا صوفہ۔ کم سامان کے باعث کمرہ کشادہ لگ رہا تھا۔ سامنے بھاری پردوں کے پیچھے یقیناً" کھڑکی تھی جو جانے کہاں کھلتی تھی۔ کسی گلی میں یا ادھر صحن تھا۔ وہ یہی قیاس کرنے لگی تھی کہ وہ کھانے کی ٹرے لیے آگیا۔

"چلو کھانا کھالو۔" وہ بلا ارادہ اسے دیکھے گئی۔

"گھور گھور کے کیا دیکھ رہی ہو۔ یہ پکڑو۔ میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔" اس نے ٹوکنے کے ساتھ ٹرے اس کے

ہاتھوں میں تھمادی تھی۔
"تم۔۔۔!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے فوراً ٹوک دیا۔
"کوئی سوال مت کرنا۔ اگر اپنے باپ کی زندگی چاہتی ہو تو خاموشی سے میری باتوں پر عمل کرتی جاؤ، سمجھیں۔"
وہ سخت لہجے میں کہہ کر واپس پلٹ گیا تو اچانک اس کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی تھی۔ کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی اور بھاگ کر دروازہ بند کرکے اندر سے لاک کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سارہ عموماً دوپہر کا کھانا اریبہ کے ساتھ کھاتی تھی۔ ابھی بھی اس نے تین بجے تک اریبہ کا انتظار کیا تھا۔ پھر بھوک برداشت سے باہر ہوگئی تو اس نے کھانا کھالیا۔ اس کے بعد عادتاً میگزین لے کر بیڈ پر نیم دراز ہوگئی۔ کوئی دل کو چھو لینے والی تحریر تھی جس میں وہ یوں کھوئی کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس کا دھیان کسی اور طرف گیا تھا۔ پھر میگزین ایک طرف رکھنے کے بعد بھی کتنی دیر وہ اسی تحریر میں کھوئی رہی۔ عجیب سحر تھا جس سے وہ نکلنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ جب بی بی نے کمرے میں آکر اسے پکارا تب وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔
"کیا بات ہے بی بی؟"
"بیٹا! پانچ بج رہے ہیں، اریبہ ابھی تک نہیں آئی۔ پتا تو کرو کہاں ہے۔" بی بی نے کہا تو وہ حیرت سے بولی۔
"پانچ بج گئے۔ کہاں رہ گئی اریبہ۔ اچھا میں فون کرتی ہوں اسے۔"
"ہاں بیٹا! صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا اس نے اور تمہیں پتا ہے، باہر وہ کچھ نہیں کھاتی۔" بی بی کو اریبہ کی بھوک پریشان کررہی تھی۔
"جب ہی تو اتنی کمزور ہورہی ہے۔"
وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل کر لابی میں آگئی اور اریبہ کا نمبر ڈائل کیا تو اس کا سیل فون آف تھا۔ جس پر جھنجلا کر اس نے ریسور پٹخ دیا۔
"جان بوجھ کر تنگ کرتی ہے۔" سارہ دانت پیستے ہوئے واپس کمرے میں آگئی۔ کھڑکیوں سے پردے سمیٹے پھر شاور لینے کا سوچ کر وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگی تھی کہ اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کا ذہن اریبہ کی طرف بھٹک گیا تھا۔
"اتنی دیر تو اس نے کبھی نہیں کی۔" اس نے فوراً الماری بند کی اور کارنر کی دراز سے اپنی ڈائری نکال لی جس میں اس نے اریبہ کی دوستوں کے نمبر محفوظ کرلیے تھے۔ کیونکہ جب اریبہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تب نمبر نہ ہونے کے باعث اس کی کسی دوست سے وہ رابطہ نہیں کرسکی تھی۔ اس کے بعد ہی اس نے اریبہ کے سیل فون سے نمبر نکالے تھے اور اب ہر نمبر سے ایک ہی جواب سن کر وہ متوحش ہوگئی تھی۔
"اریبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ کالج کے بعد بارہ بجے ہی گھر چلی گئی تھی۔"
"بارہ بجے، گھر۔" اس کا دل ڈوبنے لگا تو اس نے یاسمین کے کمرے کی طرف دوڑ لگادی۔
"مما، مما!" اس کی گھبرائی ہوئی آواز پر یاسمین ٹھٹک گئی۔
"کیا بات ہے بیٹا؟"
"مما! وہ اریبہ ابھی تک نہیں آئی۔ میں نے اس کی تمام فرینڈز سے معلوم کیا ہے، وہ کہہ رہی ہیں۔ اریبہ بارہ بجے ہی گھر چلی گئی تھی اور مما! اریبہ کا سیل فون بھی آف جارہا ہے۔"

اس نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا تو یاسمین فوراً کچھ بول نہیں پائی۔ شاید اس کی بات سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔
"مما! کہاں جاسکتی ہے اریبہ۔ آپ کو اس نے کچھ بتایا تھا؟" سارہ نے یاسمین کا بازو تھام کر پوچھا۔
"نہیں! مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔" یاسمین کی نظروں میں صبح کا منظر گھوم گیا جب وہ اریبہ کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔
"حالانکہ میں اس سے پوچھتی رہ گئی لیکن۔۔۔" یاسمین کا انداز کھویا کھویا تھا۔
"لیکن کیا مما! بتائیں نا؟" سارہ نے یاسمین کا بازو ہلایا تب وہ چونکنے کے ساتھ ہی پریشان ہوگئی تھی۔
"بیٹا! اپنے ڈیڈی کو فون کرو۔ انہیں اریبہ کا بتاؤ، میرا ذہن تو بالکل کام نہیں کررہا۔"
"ہاں! ڈیڈی کو تو میں نے فون کیا ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے اریبہ وہیں ہو۔" سارہ کہہ کر اسی تیزی سے واپس جانے لگی تھی کہ اچانک کسی خیال سے یاسمین نے اسے روک لیا۔
"رکو سارہ! میں فون کرتی ہوں توصیف کو۔"
سارہ رک گئی۔ یاسمین نے اپنا سیل فون اٹھا کر توصیف احمد کا نمبر پش کردیا۔
"ہیلو!" توصیف احمد نے فوراً ہی کال ریسیو کی تھی۔
"توصیف! اریبہ آپ کی طرف آئی ہے؟" یاسمین نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا تھا۔
"نہیں! خیریت؟"
"پتا نہیں، خیریت ہے بھی یا نہیں۔ اریبہ ابھی تک گھر نہیں آئی۔ میرا مطلب ہے۔ صبح کالج گئی تھی اور ابھی اس کی فرینڈز سے معلوم کیا ہے، وہ بتارہی ہیں اریبہ بارہ بجے کے قریب گھر چلی گئی تھی لیکن وہ گھر نہیں پہنچی۔"
یاسمین یوں بول رہی تھی جیسے اس کا اپنا ذہن یہ سوچنے میں لگا ہو کہ اریبہ کہاں جاسکتی ہے۔
"اریبہ گھر نہیں پہنچی۔" توصیف احمد کا ذہن جیسے ماؤف ہورہا تھا۔ "اچھا میں آتا ہوں۔"
یاسمین سیل فون کان سے ہٹا کر سارہ کو دیکھنے لگی۔ اسے اپنا وجود سن ہوتا لگ رہا تھا۔
"کیا کہا ہے ڈیڈی نے؟" سارہ نے بے تابی سے پوچھا۔
"آرہے ہیں۔" یاسمین نے اسی قدر کہا اور اپنے پیچھے صوفہ دیکھ کر ڈھے گئی تھی۔
"مما!" سارہ نے قریب بیٹھ کر یاسمین کے کندھے پر سر رکھ لیا وہ رو دینے کو ہوگئی تھی۔ "اریبہ کہاں ہوگی مما!"

کہیں پھر تو اس کے ساتھ۔ مما! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ڈیڈی آپ کو تو کچھ نہیں کہیں گے نا؟"

یاسمین کچھ نہیں بولی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت سمجھنے کی سعی میں مصروف تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے اندر یہ خوف نہیں تھا کہ توصیف احمد آتے ہی اسے الزام دیں گے بلکہ کوئی اور خوف تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

"مما! آپ کیا سوچ رہی ہیں؟" سارہ اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں بیٹا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" یاسمین نے اس کا گال تھپک کر کہا۔

"نہیں مما! میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" سارہ نے پھر اس کے کندھے پر سر رکھ لیا تھا۔

کچھ دیر بعد توصیف احمد آ گئے تو بس ایک نظر انہوں نے یاسمین اور سارہ کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر صوفے پر بیٹھ کر اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پش کر کے کان سے لگا لیا۔

سارہ یاسمین کے کندھے پر سر رکھے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی جبکہ یاسمین پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھی۔

توصیف احمد نے تقریباً تمام اسپتالوں کے ایمرجنسی کیسز کے بارے میں معلوم کر لیا۔ آخر میں اجلال رازی کو فون کر کے فوراً آنے کو کہا پھر سارہ کو دیکھ کر بولے تھے۔

"بیٹا! آپ پریشان نہ ہوں اریبہ کو کچھ نہیں ہوا۔"

"لیکن وہ ہے کہاں ڈیڈی؟" اس سوال کا توصیف احمد کے پاس جواب نہیں تھا جب ہی ان سنا کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"رازی آتا ہو گا۔ میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اس دوران اگر کہیں سے اریبہ کی خبر ملے یا کوئی اور فون آئے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔" توصیف احمد یاسمین سے کہہ کر کمرے سے نکل گئے تھے۔

سارہ توصیف احمد کی دوسری بات سوچتے ہوئے مزید پریشان ہو گئی تھی۔

✵ ✵ ✵

اجلال رازی کو راستے میں توصیف احمد نے اریبہ کے لاپتا ہونے کا بتایا تو وہ بھی متوحش ہونے کے ساتھ بے انتہا پریشان ہو گیا تھا۔

"پھر اب کیا کرنا ہے چچا جان؟"

"کیا کریں؟" توصیف احمد نے الٹا اس سے پوچھا تو وہ فوراً کچھ نہیں بولا کیونکہ معاملہ ایسا تھا کہ فوری اقدام سے گھمبیر ہو سکتا تھا اس لیے سوچ میں پڑ گیا لیکن ڈرائیونگ کرنے کے باعث بار بار اس کا ذہن بھٹک رہا تھا۔

"میرا خیال ہے، چچا جان! ہمیں گھر چلنا چاہیے۔" وہ اسی خیال سے بولا تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر وہ سوچ سکتے ہیں۔

"ہوں!" توصیف احمد اپنی سوچ میں گم تھے۔

"ویسے آپ اس وقت کہاں جانا چاہ رہے تھے؟" اس نے گاڑی واپسی کے راستے پر ڈالنے سے پہلے پوچھا تو توصیف احمد چونک کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے "غالباً" سمجھنا چاہ رہے تھے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔

"وہ اریبہ کا کالج ہے۔" اجلال رازی نے بائیں جانب اشارہ کر کے کہا۔

توصیف احمد اس طرف دیکھنے لگے۔ شام کے دھندلکے میں کالج کی عمارت خاموش و ویران لگ رہی تھی۔ انہیں لگا جیسے اندر کہیں بھول بھلیوں میں ان کی بیٹی بھٹک رہی ہے۔ ان کی کیفیت سمجھتے ہوئے اجلال رازی نے گاڑی کی اسپیڈ بہت کم کر دی تھی۔ درحقیقت وہ خود بھی اس عمارت کے اندر بھٹک رہا تھا۔ رینگنے کے باوجود گاڑی کالج

کی عمارت سے آگے نکل آئی تب توصیف احمد کی آواز کہیں دور سے آئی تھی۔

"اسپتال چلو۔"

"جی!" اجلال رازی نے سنبھل کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی لیکن پھر اچانک اس نے بریک لگائے تھے۔ جھٹکا لگنے سے توصیف احمد کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔

"سوری چچا جان!" اجلال رازی پریشان اور نادم تھا۔ توصیف احمد کا بازو تھام کر جلدی سے انہیں سیدھا کیا اور ایک طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"وہ دیکھیں چچا جان! مجھے لگ رہا ہے وہ اریبہ کی گاڑی ہے۔"

"ہاں!" توصیف احمد نمبر پلیٹ دیکھتے ہی بے تاب ہو گئے۔ "ہاں اریبہ۔ اریبہ کی گاڑی ہے۔ چلو جلدی چلو۔"

اجلال رازی نے فوراً گاڑی بڑھا کر اریبہ کی گاڑی کے قریب روک دی اور اتر کر توصیف احمد کے ساتھ گاڑی کے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ کالج سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اریبہ کی گاڑی کا موجود ہونا بہت سی باتوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مثبت بھی اور منفی بھی۔ لیکن مثبت خیالوں پر گرفت یوں کمزور پڑ رہی تھی کہ اس کے بعد اریبہ کو گھر پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن وہ گھر نہیں پہنچی تھی تو اس کا مطلب تھا وہ کسی مشکل میں پھنس گئی تھی اور مشکل کو سوچتے ہوئے توصیف احمد اور اجلال رازی کے ذہن میں ایک ہی بات آئی تھی جو کہ انہونی نہیں تھی لیکن دل دہلا دینے والی ضرور تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے کہنے یا پوچھنے سے خائف تھے جبکہ آنکھوں میں یہ سوال واضح ابھر رہا تھا۔

"کیا اریبہ کو اغوا کیا گیا ہے؟"

✵ ✵ ✵

انتہائی ناگوار شور سے اس کی آنکھ کھلی تھی لیکن کچھ نظر نہیں آیا کیونکہ کمرہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جس سے سمجھ نہیں پائی کہ وہ کہاں ہے۔ شور کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی لکڑی پر کیل رکھ کر زور زور سے ہتھوڑے مار رہا ہو۔ اس کا دماغ پھٹنے کو ہو گیا تھا۔ دل چاہا ہتھوڑا لے کر جو کوئی بھی ہے اس کے سر پر دے مارے۔

"سارہ!" وہ چیخ کر پکارتے ہی سہم گئی۔ یک لخت ذہن بیدار ہوتے ہی یاد آ گیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے اور کہاں ہے یہ تو وہ بھی نہیں جانتی تھی اس نے لیٹے لیٹے ہی اجالے میں دیکھے گئے اس کمرے کا نقشہ سوچا پھر بیڈ سے اتر کر احتیاط سے چلتی ہوئی دیوار تک گئی پھر سوئچ بورڈ تلاش کر کے بٹن آن کیا تو کمرہ یکدم روشنی میں نہا گیا جبکہ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو پہلے دروازہ چیک کیا جو اسی طرح لاک تھا۔

قدرے مطمئن ہو کر وہ صوفے پر بیٹھی تو بیڈ کے کنارے کھانے کی ٹرے نظر آئی جسے اس نے پھر ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور روتے روتے سو گئی تھی بہر حال اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ابھی کھانا دیکھ کر اس کا پیٹ دہائیاں دینے لگا تو دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ کر ٹرے کے پاس آ گئی۔ ایک پلیٹ میں روٹی کھلی ہونے کے باعث سوکھ گئی تھی، چاول ٹھنڈے اور سالن اس کی سمجھ میں نہیں آیا سبزی ہے یا گوشت۔ بھوک اتنی شدید تھی کہ اس نے کچھ سوچا نہیں اور چاول کی پلیٹ اٹھا کر جلدی جلدی منہ میں ڈال کر نگلتی چلی گئی پھر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا اور مایوس ہو کر واش روم میں ہاتھ دھونے آئی تو وہیں بیسن کے نل سے پانی بھی پی لیا جس سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا ذہن سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ زیادہ فکر اسے اپنے گھر والوں کی تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان پر کیا بیت رہی

ہوگی اور ان ہی کا سوچ کر ہی اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ سامنے تخت پر وہ اطمینان سے لیٹا ہوا تھا' اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا چاہیے؟"

"تمہارا سر۔" اس نے جل کر دل میں کہا پھر کمرے سے باہر آکر بہت ضبط سے گویا ہوئی تھی۔

"وہ میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میرے ڈیڈی کا نام توصیف احمد ہے اور ان کا فون نمبر۔۔۔"

"ایک منٹ۔" وہ فوراً ٹوک کر پوچھنے لگا۔ "یہ تم اپنے باپ کا نام اور نمبر مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

"پھر' میرا مطلب ہے' تمہیں میرے ڈیڈی سے جو ڈیمانڈ کرنی ہے' جلدی کرو۔" اس نے کہا تو وہ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہی تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

"کیا سمجھا ہے تم نے مجھے؟ ڈاکو' لٹیرا' تمہیں اغوا کر کے تمہارے باپ سے رقم کا مطالبہ کروں گا۔ بولو۔"

"میرے بال چھوڑو۔" تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"ایسی دلالی تمہارا باپ کرتا ہوگا۔" اس نے جھٹکا دے کر اسے دور دھکیل دیا تو دیوار کا سہارا لیتے ہی وہ چیخ پڑی۔

"اور تم کیا کرتے ہو۔ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟ یہ اغوا نہیں تو اور کیا ہے تم نے اغوا کیا ہے مجھے۔"

"شٹ اپ!" وہ دھاڑا تھا۔

"مجھے خاموش کرا کے تم پارسا نہیں بن جاؤ گے۔ جو گالی تم نے میرے باپ کو دی ہے' وہ تم پر صادق ہے۔" وہ اندر سے خائف ضرور تھی لیکن کہنے سے باز نہیں آئی تو وہ دانت پیس کر بولا۔

"میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں' خاموش ہو جاؤ ورنہ۔"

"ورنہ' میرے باپ کو مار ڈالو گے جاؤ مار ڈالو۔ جو ذلت انہیں میری وجہ سے اٹھانی پڑے گی' اس سے اچھا ہے وہ مر جائیں۔" آخری الفاظ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ جو بات سوچتے ہوئے روح کانپتی ہو' وہ ہونٹوں پر آ کر اسے خود کو بری طرح تڑپا گئی تھی۔

اور وہ ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔ درحقیقت اندر سے مضطرب ہو گیا تھا پھر ایکدم پلٹ کر کچن میں آگیا۔

"تاجور بھی یہی دعا مانگتی ہوگی۔ ابا مر جائیں' اس کا بھائی مر جائے۔ ابا کو تو خیر پتا ہی نہیں ہے اور میں۔ میں روز مرتا' روز جیتا ہوں۔ کاش ایک ہی بار مر جاؤں ایسی آرزو اس لڑکی کا باپ بھی کرے گا۔"

چائے بناتے ہوئے وہ یہی سب سوچتا رہا پھر دونوں مگ اٹھا کر کچن سے نکلا تو وہ وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے نیچے گندے فرش پر بیٹھی تھی۔

"چائے پیو گی؟" وہ اس کے سامنے پنجوں پر بیٹھ کر پوچھنے لگا۔ مگ اس کی طرف اس خیال سے نہیں بڑھایا کہ وہ ہاتھ مار کر گرا نہ دے۔

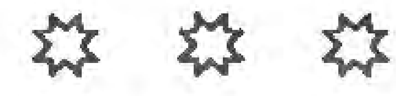
اریبہ نے جواب نہیں دیا نہ ہی اس کی طرف دیکھا تھا۔

"پی لو۔" اس نے ہلکا سا اصرار کیا اور ایک مگ اس کے قریب رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اریبہ کو واقعی چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ پھر اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ اگر نہیں پیے گی تو وہ پروا بھی نہیں کرے گا۔ الٹا وہی بعد میں تڑپتی رہے گی جب ہی مگ اٹھا کر وہ کمرے میں جانے لگی تھی کہ اس نے پکار لیا۔

"سنو۔" وہ رک گئی۔

"وہ سامنے کچن ہے' چائے یا کچھ اور کھانا پینا ہو تو آپ خود ہی زحمت کر لینا بس یہاں سے نکلنے کا مت سوچنا کیونکہ چاروں طرف میرے آدمی موجود ہیں۔ جب تک تم اس چار دیواری میں ہو' محفوظ ہو باہر نکلو گی تو۔۔۔"

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔



رات اپنا سفر نصف سے زیادہ طے کر چکی تھی پھر بھی توصیف احمد' یاسمین اور اجلال رازی چوکنا بیٹھے تھے کیونکہ انہیں انتظار تھا کسی انجان فون کا جس سے انہیں اریبہ کا پتا چلتا۔ اپنے طور پر وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہے جو انہیں خود ہی خاموشی اور رازداری سے طے کرنا ہوگا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ان کا انتظار مایوسی میں بدل رہا تھا۔ پھر نیند غالب آنے لگی اور نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ وہ سب بھی سو گئے تھے لیکن غافل نہیں ہوئے تھے آہٹوں پر بھی چونک اٹھتے تھے یوں ہی سوتے جاگتے صبح ہو گئی تب یاسمین چیخ پڑی۔

"کچھ کریں توصیف" اس انتظار نے میری جان نکال دی ہے۔ ایسے مت بیٹھیں۔ جا کر اریبہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائیں۔"

توصیف احمد' اجلال رازی کو دیکھنے لگے کہ وہ کیا کہتا ہے۔

"ابھی نہیں۔" اجلال رازی نے نفی میں سر ہلایا پھر یاسمین سے کہنے لگا۔ "صبر سے کام لیں آنٹی! فوری اقدام سے ہم کسی بڑی مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔"

"اس سے بڑی مشکل اور کیا ہوگی کہ میری بیٹی جانے کن ہاتھوں میں۔۔۔" یاسمین رونے لگی اور روتے ہوئے ہی اس کے منہ سے نکلا تھا۔۔۔ "وہ پہلے ہی پریشان تھی۔"

"کون اریبہ؟" توصیف احمد کے ساتھ اجلال رازی بھی ٹھٹھکا تھا۔

"ہاں ۔!" یاسمین بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن اب چھپا بھی نہیں سکتی تھی۔

"کیوں' کیوں پریشان تھی اریبہ؟" توصیف احمد نے بے صبری سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میں تو خود اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی۔ کل صبح بھی میں نے پوچھا تھا لیکن وہ ٹال گئی بلکہ یہ کہا کہ وہ اپنے دکھ شیئر نہیں کرے گی۔ اس کا کیا مطلب ہے یہی نا کہ کوئی اسے پریشان کر رہا تھا۔"

توصیف احمد ایک ٹک یاسمین کو دیکھے جا رہے تھے اور اجلال رازی اچانک مجرمانہ احساس میں گھر گیا تھا۔ اسے لگا جیسے یاسمین "کوئی" اسے ہی کہہ رہی ہے۔

"کوئی اریبہ کو پریشان کر رہا تھا لیکن کیوں؟" کتنی دیر بعد توصیف احمد خود سے بولے تھے پھر اجلال رازی کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"بیٹا! تم سے اریبہ نے ایسی کسی بات کا ذکر کیا تھا؟"

"نہیں چچا جان۔" وہ اندر سے خائف ہو گیا تھا۔

"وہ نہیں بتاتی۔ کسی کو کچھ نہیں بتاتی۔ سمجھتی ہے' ہر مسئلہ خود حل کر سکتی ہے۔" یاسمین خود کو کسی الزام سے بری کر رہی تھی۔

"میرا خیال ہے بیٹا! ہمیں گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دینی چاہیے۔" توصیف احمد اچانک کسی نتیجے پر پہنچ کر بولے تھے۔

"جیسے آپ کہیں۔" اجلال رازی اب کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

"چلو۔" توصیف احمد فوراً" کھڑے ہو گئے تو ناچار اسے بھی اٹھنا پڑا تھا۔ پھر ان دونوں کے جاتے ہی یاسمین تیزی سے سارہ کے کمرے میں آئی تھی۔

"کچھ پتا چلا مما؟" سارہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ اس کی آنکھیں رت جگے اور رونے کے باعث سرخ اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔

"نہیں۔ تمہارے ڈیڈی اور رازی رپورٹ درج کرانے گئے ہیں۔" یاسمین عجلت میں بتا کر اصل بات کی طرف آئی تھی۔ "تم بتاؤ سارہ! ان دنوں اریبہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے تمہارے ساتھ اپنی پریشانی شیئر کی تھی؟ کچھ کہا تھا اس نے تم سے؟"

"نہیں مما!" سارہ بھی اجلال رازی کی طرح خائف ہوئی تھی۔

"پتا نہیں کہاں چلی گئی۔ تم پھر اس کی فرینڈز کو فون کرو۔" یاسمین نے کہا۔

"نہیں مما! اس طرح تو سارے میں بات پھیل جائے گی اور بڑی بدنامی ہوگی۔" سارہ پھر رونے کو ہو گئی تھی۔

"بدنامی ..!" یاسمین کو دھچکا لگا تھا' شاید اب اسے بدنامی کا مفہوم سمجھ میں آرہا تھا جو کالک وہ خود اپنے منہ پر ملتی آرہی تھی اس کا تو اسے کبھی احساس نہیں ہوا تھا اور اب جو کالک لگنی تھی' اس کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھی تھی۔

"نہیں۔" وہ تیزی سے پلٹی اور تقریباً" بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی اور زور سے دروازہ بند کر کے اپنے تئیں اس نے اپنے تعاقب میں آتی دنیا کو روکا تھا لیکن آوازوں کا کیا کرتی جو کانوں کے پردے پھاڑ دے رہی تھیں۔

"جیسی ماں ویسی بیٹی۔"



تین دن ہو گئے تھے اسے یہاں مقید ہوئے اور وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ اسے یہاں کیوں قید کیا گیا ہے۔ آخر اس شخص کا مقصد کیا ہے جو صرف اس کی ضرورت پوچھتا اور ضرورت سے متعلق ہی جواب دیتا تھا اور کوئی بات تو جیسے سنتا ہی نہیں تھا اور یہ نہیں تھا کہ اس نے یہاں سے نکلنے کا نہیں سوچا تھا۔ کوشش بھی کر چکی تھی' اگلے دن جب وہ کہیں گیا تھا تو اس نے اس ایک کمرے اور لاؤنج پر مشتمل چھوٹے سے گھر کا ہر طرف سے جائزہ لیا تھا اور اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ کچن میں چھری چاقو تک نہیں تھے جنہیں وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا سوچتی اس کے بعد بھی اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی دن کے بارہ بجے تک وہ گھر میں موجود رہتا تھا' اس کے بعد کہیں جاتا تو پھر رات نو بجے واپس آتا تھا۔ اس وقت بھی وہ موجود نہیں تھا تو اس نے مبہم امید کے سہارے پہلے دروازہ چیک کیا پھر کھڑکی کھول دی تو گزشتہ کی طرح تین فٹ گلی سے آگے اونچی باؤنڈری وال اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ بے حد جھنجلائی پھر کھڑکی پر چڑھ گئی کہ شاید اس طرح باؤنڈری وال سے باہر دیکھ سکے لیکن یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی۔

باؤنڈری وال کھڑکی سے اونچی تھی پھر بھی وہ گرل کے ساتھ چپک کر باہر یا آس پاس کسی کی موجودگی محسوس کرنا چاہتی تھی کہ اچانک گاڑی کی آواز پر گھبرا کر کھڑکی سے چھلانگ لگاتے ہی وہ تڑپ گئی اس کے پیر کی ایڑی میں پوری کیل گھس گئی تھی۔ درد کی تیز لہر سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا پھر بھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی تاکہ کمرے میں جا سکے لیکن اس سے پہلے ہی وہ اندر آگیا تھا۔ دروازہ بند کر کے پلٹا تب اس پر نظر پڑی۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی چہرے پر تکلیف کے آثار واضح تھے وہ نہ سمجھتے ہوئے بھی تیزی سے لپکا تھا اور اس کے قریب پنجوں پر بیٹھتے ہی فرش پر خون پھر اس کی ایڑی پر نظر پڑی تو فوراً" اس کا پاؤں اٹھا کر پلک جھپکتے ہی کیل کھینچ لی پھر ایڑی دبا دبا کر خون نکالنے لگا تھا۔

اریبہ درد سے بے حال ہونے کے باوجود کوئی احتجاج نہیں کر رہی تھی کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر وہ جانتی تھی کہ یہ کتنا ضروری ہے۔ اچھا خاصا خون نکالنے کے بعد اس نے جیب سے ماچس نکالی اور تیلی جلا کر پھونک مارتے ہی گرم تیلی

اس کے زخم پر رکھ دی۔

"اف!" اریبہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک گئے۔

"یہاں کیا کر رہی تھیں؟" وہ اپنی کارروائی مکمل کرکے اب کڑے تیوروں سے پوچھ رہا تھا۔

"بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔" وہ کڑواہٹ سے بولی۔

"اچھا!" اس کے اچھا میں استہزا تھا پھر پوچھنے لگا۔ "بھاگ کر جاؤ گی کہاں؟"

"ہاں! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ میں بھاگ کر جاؤں گی کہاں۔ تم نے مجھے کہیں جانے کے قابل چھوڑا ہی نہیں۔" وہ دکھ چھپا کر تلخی سے بولی تو وہ اچھل پڑا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"نادان نہیں ہو جو مطلب نہ سمجھو۔ کوئی لڑکی ایک رات گھر سے غائب رہے اس کے بعد دنیا والے اسے کس نام سے پکارتے ہیں۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہوگے۔" اس نے کہا تو وہ ہونٹ بھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"چلو، تمہیں کمرے میں پہنچا دوں۔"

"میں خود جا سکتی ہوں۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لنگڑاتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر رکھی کرسی کو تھام لیا پھر اسی کرسی پر بیٹھ گئی تو وہ جو اسے ہی دیکھ رہا تھا فوراً" رخ موڑ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ پتا نہیں وہ لکڑیوں سے کیا بنا رہا تھا۔ اریبہ کو اس سے غرض نہیں تھی لیکن جب وہ لکڑی میں کیل ٹھونکتا تھا تب اس کا دماغ جھنجھنا جاتا۔ ابھی وہ تراشی ہوئی لکڑیوں کی پیمائش کر رہا تھا پھر اچانک اس کی طرف گھوم کر پوچھنے لگا۔

"تمہارے پیر کے لیے کسی دوا یا مرہم کی ضرورت تو نہیں ہے؟" وہ بالکل غیر ارادی طور پر اپنا پیر دوسری ٹانگ پر رکھ کر ایڑی کا جائزہ لینے لگی۔ ہلکا سا ہاتھ لگنے سے ہی ایڑی میں درد کی لہر اٹھی تھی تب وہ اسے دیکھنے لگی بولی کچھ نہیں۔

وہ اپنا کام چھوڑ کر کاغذ قلم لے آیا اور اس کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔

"لکھ دو۔ میڈیسن کے علاوہ بھی جو چاہیے۔" اریبہ نے صرف پین کلر ٹیبلٹ اور ٹیوب کا نام لکھ کر پرچا واپس اسے تھما دیا تو وہ اسی وقت باہر نکل گیا تھا۔

"عجیب سر پھرا ہے۔" اس نے سر جھٹکا پھر کمرے میں جانے کے ارادے سے اٹھی تھی کہ نظر سامنے تخت پوش پر رکھے اس کے موبائل فون پر پڑی جو یقیناً" عجلت میں وہ لے جانا بھول گیا تھا۔ بس پھر اس نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا نہ درد کی پروا کی بھاگ کر موبائل اٹھایا اور جلدی جلدی توصیف احمد کا نمبر پش کرکے موبائل کان سے لگایا تو فوراً" ہی ٹیپ بجنے لگا تھا۔

"اس کال کے لیے آپ کی رقم ناکافی ہے۔"

"شٹ!" انتہائی غصے سے اس نے موبائل سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔

☆ ☆ ☆

وقت وقت کی بات ہے۔ وہ تاجور کو تسلی دلاسے دیا کرتی تھی اور اب تاجور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔

"سارہ باجی! آپ پریشان نہ ہوں۔ دیکھیے گا، کسی دن اریبہ باجی خود ہی آجائیں گی۔ انہیں تو سارے شہر کے راستوں کا پتا ہے نا۔"

"ہوں۔" سارہ اثبات میں سر ہلا کر پوچھنے لگی۔ "تم دعا کرتی ہو اریبہ کے لیے؟"

"جی اب تو میں صرف اریبہ باجی کے لیے دعا کرتی ہوں جب اریبہ باجی آجائیں گی پھر میں اپنے بھائی کے آنے کی دعا کروں گی۔" تاجور کی معصومیت پر وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"آپ نماز پڑھیں نا باجی! بی بی کہتی ہیں نماز پڑھنے سے ساری پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہیں بی بی۔"

"اور پتا ہے باجی! بی بی تو آدھی رات کو نماز پڑھ کر اریبہ باجی کے لیے دعا کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ ضرور دعا قبول کرتا ہے۔ ہیں باجی؟" تاجور کے لہجے میں حیرت کے ساتھ اشتیاق بھی تھا۔ سارہ نے بے اختیار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

"آنکھیں بند کرو تاج۔"

"جی۔" تاجور سہمی سی اور کچھ نروس بھی ہو گئی تھی۔

"بند کرو نا۔" سارہ نے اصرار کے ساتھ انگلیوں کی پوروں سے اس کی پلکوں کو گرایا تھا۔ پھر خود بھی آنکھیں بند کرکے دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب ہو گئی تھی۔

"یا اللہ! اریبہ نے اس لڑکی تاجور کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی ہے، اسے دربدر ہونے سے بچایا ہے۔ یا اللہ اسی طرح تو بھی اریبہ کی مدد فرما۔ وہ جہاں بھی ہے اس کی حفاظت فرما۔"

"سارہ!" اپنے نام کی پکار پر سارہ نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ تاجور کے گلابی رخساروں پر سنہری پلکیں لرز رہی تھیں۔

"تاج!" سارہ نے دھیرے سے پکارا تو اس نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اوپر اٹھائی تھیں۔

"شاید رازی بھائی آئے ہیں۔ تم یہیں بیٹھو، میں آتی ہوں۔" سارہ نے کہتے ہوئے اس کا گال تھپکا پھر اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔

اجلال رازی لاؤنج میں کھڑا تھا۔

"السلام علیکم۔ کچھ پتا چلا؟" سارہ نے سلام کے ساتھ ہی پوچھا۔ اجلال رازی گہری سانس کھینچ کر رہ گیا پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"یاسمین آنٹی کہاں ہیں؟"

"مما بہت ڈسٹرب ہیں۔ میں نے انہیں نیند کی ٹیبلٹ دے کر سلا دیا ہے۔ آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" سارہ نے اس کی بات کا جواب دے کر کہا۔

"نہیں سارہ! چائے رہنے دو۔" اجلال رازی فوراً" اسے روک کر کہنے لگا۔ "تم بیٹھو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"مجھے بھی آپ سے بات کرنی ہے۔" سارہ کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" اجلال رازی اس کے سامنے بیٹھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"وہ۔ بات یہ ہے کہ رازی بھائی! مجھے لگتا ہے اریبہ کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوا، نہ ہی اسے کڈنیپ کیا گیا ہے۔ بلکہ ہم سے ناراض ہو کر وہ خود کہیں چلی گئی ہے۔"

سارہ اپنے ناخنوں پر نظریں جمائے بول رہی تھی۔ آخر میں اجلال رازی کو دیکھا تو وہ پوچھنے لگا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے۔ کیا تم نے اریبہ سے کچھ کہا تھا۔ میرا مطلب ہے....."

"نہیں۔" سارہ فوراً" بول پڑی۔ "وہ اریبہ ہمارے رویوں سے ڈس ہارٹ تھی۔ کہہ رہی تھی ہم اس کے لیے

معمہ بنے ہوئے ہیں شاید اس معمہ کو حل کرتے کرتے اس نے اپنے طور پر کچھ سمجھ لیا ہو تو میں کہہ نہیں سکتی۔"

"ہوں۔۔۔" اجلال رازی کتنی دیر تک جانے کیا سوچتا رہا' پھر کہنے لگا۔ "تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ ہمارے رویے واقعی اسے پریشان کر رہے تھے۔ لیکن اس کا یوں خاموشی سے چلے جانا دل تسلیم نہیں کر رہا۔ کیونکہ اسے جو کام کرنا ہوتا ہے ڈنکے کی چوٹ پر کرتی ہے۔"

"ہاں' لیکن اب تو وہ بہت چینج ہو گئی تھی۔ پھر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ نہ کسی حادثے میں اس کا سراغ ملا ہے اور نہ کسی نے رقم کے مطالبے کا فون کیا ہے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں۔ پولیس بھی تلاش نہیں کر پائی اسے۔"

"اگر واقعی ایسا ہے۔ جیسا تم کہہ رہی ہو پھر تو اریبہ نے بہت غلط کیا ہے۔ اسے ہمارا نہیں چچا جان اور یاسمین آنٹی کا خیال تو کرنا چاہیے تھا۔" اجلال رازی نے افسوس سے کہا۔

"میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ مما کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی اور حماد کو تو بالکل چپ لگ گئی ہے۔ ڈیڈی بابا نہیں کیا سوچتے ہیں۔ ان سب کی مجرم میں ہوں' اگر کسی کو کچھ ہو گیا تو میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گی۔" سارہ دل گرفتی سے بولتے ہوئے ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تھی۔

اجلال رازی کے دل پر مزید بوجھ آن گرا تھا۔ کچھ دیر سارہ کو دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد سارہ کو احساس ہوا جیسے اس کی سسکیاں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ ایک دم ہاتھ نیچے گرا کر دیکھا تو واقعی کوئی نہیں تھا۔ تب ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر وہ واپس کمرے میں آئی تو تاجور اسی جگہ بیٹھی تھی۔

"ارے۔۔۔ تم ابھی تک بیٹھی ہو۔ میرا مطلب ہے' کچھ دیر سو لو۔ چلو یہیں لیٹ جاؤ۔" سارہ نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی جگہ پر لیٹ کر تاجور کو ساتھ لیٹنے کا اشارہ کیا تو وہ رک کر بولی۔

"مجھے قرآن شریف کا سبق یاد کرنا ہے باجی!"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ قصداً" مسکرائی اور تاجور کے جاتے ہی تکیے میں منہ چھپا کر پھر سسکنے لگی تھی۔



"کچھ پتا چلا اریبہ کا؟" اجلال رازی گھر آیا تو اسے دیکھتے ہی ساجدہ بیگم نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ وہ بری طرح جھنجلا گیا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں پتا چلا' مر گئی ہے وہ' ایک ہی بار اسے رو پیٹ کر صبر کر لیں آپ سب۔"

"رازی۔۔۔" ساجدہ بیگم یہی سمجھیں کہ صدمے سے اس کا ذہن مفلوج ہو رہا ہے۔ جب ہی تسلی دینے لگیں۔

"بیٹا۔۔۔ حوصلے سے کام لو۔۔۔ یوں ہمت ہار دو گے تو کیسے تلاش کرو گے اسے۔"

"نہیں کرنا مجھے اسے تلاش اور تلاش اسے کیا جاتا ہے جو کھو جائے۔ وہ کھوئی نہیں' خود سے چلی گئی ہے کہیں۔" اجلال رازی نے سارہ کے قیاس کو یقین سے کہا تھا تو اس لیے کہ پچھلے دو دن سے وہ خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔

"خود سے چلی گئی ہے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو رازی؟" ساجدہ بیگم مزید پریشان ہو گئی تھیں۔

"وہی جو سچ ہے۔ مان لیں آپ' وہ ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی ہے۔ خواہ کسی کی جان پر بن آئے۔ اسے کوئی پروا نہیں۔ کسی کی پروا نہیں اسے۔" وہ پھٹ پڑا تھا۔ ساجدہ بیگم نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"لو پانی پیو۔۔۔ غصے میں پتا نہیں کیا' کیا بولے جا رہے ہو۔"

"میں غلط نہیں کہہ رہا امی۔" وہ ساجدہ بیگم کے ہاتھ سے گلاس لے کر بولا۔

"بس رازی۔۔۔ خاموش ہو جاؤ۔" ساجدہ بیگم کو بھی غصہ آگیا تھا۔ ٹوک کر کہنے لگیں۔ "ٹھیک ہے اریبہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی ہے۔ لیکن ایسی گری ہوئی حرکت کبھی نہیں کر سکتی۔ دوبارہ ایسی بات تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔۔۔ سمجھے۔"

"میری زبان پر بند باندھ کر آپ کیا سمجھتی ہیں' ساری دنیا خاموش ہو جائے گی۔" وہ تلخی سے بولا۔

"ان باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے رازی! جو بھی بات ہے' صاف کہو۔ کیونکہ دنیا کی پرواہ تو تم نے اس وقت نہیں کی تھی جب اریبہ بائیک چلاتی تھی۔" ساجدہ بیگم اب ٹھٹک کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

"بائیک چلانا اور بات ہے امی۔" وہ سر جھکا کر اسی قدر بولا تھا۔ ساجدہ بیگم نرم پڑ گئیں۔

"بیٹا۔۔۔! تمہیں بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ اریبہ بے چاری پتا نہیں کس مشکل میں پھنسی ہے۔ پھر اپنے چچا جان کو دیکھو۔ ایک تو وہ پہلے ہی بیٹی کی گمشدگی سے پریشان ہیں۔ اس پر ایسی باتیں ان پر کیا اثر ڈالیں گی۔ یہ تو تم بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"جی! سمجھ سکتا ہوں۔ بلکہ سمجھ رہا ہوں۔ جب ہی زیادہ وقت ان کے ساتھ رہتا ہوں۔ تاکہ وہ خود کو اکیلا نہ سمجھیں اور امی جو آپ کہیں گی' میں ان کے لیے کروں گا۔ لیکن اب ایک بات کے لیے آپ مجھے مجبور مت کیجیے گا۔" وہ بہت ضبط سے اور ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

"کس بات کے لیے؟" ساجدہ بیگم نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ البتہ ان کی نظروں میں بے صبری واضح تھی۔

"میں اب اریبہ سے شادی نہیں کروں گا۔" اجلال رازی نے کہہ کر ساجدہ بیگم کو دیکھا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟" ساجدہ بیگم کو ہرگز بھی اس بات کی توقع نہیں تھی۔

"بس امی! آپ سمجھ لیں کہ اریبہ کی قسمت میں آپ کی بہو بننا لکھا ہی نہیں گیا اور جو بات قسمت میں نہ ہو اس پر کڑھنے یا واویلا مچانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ ابھی بھی ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔

"یہ فیصلہ تم نے۔۔۔" سراسیمگی کے عالم میں ساجدہ بیگم اس قدر کہہ سکی تھیں۔

"بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تو ساجدہ بیگم نے ایک دم اس کی کلائی تھام لی۔

"لیکن بیٹا! پہلے اریبہ کو تو آنے دو۔ دیکھو' وہ کیا بتاتی ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا۔"

"مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں۔ آپ بھی میرے فیصلے میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش مت کیجیے گا۔" اب وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا' تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔

ساجدہ بیگم کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کی شخصیت کا بت' جس میں معاملہ فہمی اور بردباری سرفہرست تھی' پاش پاش ہونے جا رہا تھا اور وہ بے بس تھیں۔ معاملہ ہی ایسا تھا۔ انہوں نے یاسمین کے کردار سے چشم پوشی کر لی تھی۔ لیکن اس کی کالک اپنے منہ پر ملنا دل گردے کا کام تھا۔ اجلال رازی ان کا بیٹا۔۔۔ لیکن تھا تو مرد ہی اور کوئی مرد ایسی لڑکی کو قبول نہیں کرتا' جس کی پارسائی مشکوک ہو چکی ہو۔

"اریبہ۔۔۔!" ساجدہ بیگم کے دل سے ہوک اٹھی تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں پانی جمع ہو گیا تھا۔



وہ کتنی دیر سے ایک ہی جگہ نظریں جمائے ساکت بیٹھی تھی۔ جبکہ اس کے ذہن میں مختلف سوچوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ کبھی اسے توصیف احمد کا خیال آتا کہ اس کی گمشدگی ان پر کس طرح اثر انداز ہوئی ہو گی۔ وہ ابھی بھی اسے تلاش کر رہے ہوں گے یا تھک کر مایوس ہو گئے ہوں گے۔ پھر یاسمین کو سوچتے ہوئے اسے اس صبح کا منظر یاد

آیا جب یاسمین اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔
"میں جیسی بھی ہوں، تمہاری ماں ہوں۔ مجھے بتاؤ تم کیوں پریشان ہو۔"
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اس نے اپنی ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس کی نفی کرکے ا
طرح سے اسے دھتکار دیا تھا۔
"میں اپنے دکھ آپ کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتی۔" اس نے واضح طور پر جتایا تھا۔
"اور شاید مجھے اسی بات کی سزا مل رہی ہے کہ اب کوئی بھی نہیں ہے۔ جس سے میں کچھ کہہ سکوں اور ا
کون سنے گا میری۔"
"رازی...!" اس کا دل پکارتے ہی سہم گیا تھا۔ کیا سوچتا ہوگا رازی میرے بارے میں کہ میں کن ہاتھوں
پامال ہو رہی ہوں۔
"نہیں... ایسا نہیں ہے رازی۔ اللہ نے اس لٹیرے کو ہی میرا محافظ بنا رکھا ہے۔ تم بدگمان مت ہونا۔
تمہاری ہوں۔" پھر وہ اجلال رازی کو یقین دلا رہی تھی اپنی محبت کا اور اپنی پارسائی کا کہ اچانک شمشیر علی
دروازے میں آکر اسے پکارا تھا۔
"اے...!" وہ اچھل پڑی اور اس کی مداخلت پر جیسے کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔
"کیا ہے... تمیز نہیں ہے تمہیں... ایک دم سے چلے آتے ہو اور یہ اے اے کیا ہوتا ہے۔ میرا نام اریبہ
اریبہ۔"
"اور میرا کوئی نام نہیں ہے۔ یار لوگ شامی کہہ کر پکارتے ہیں اور کچھ شام' رادھا دالاشام۔" وہ اس کے تیو
تیوروں کا نوٹس لیے بغیر بولا تھا۔ "تو میں کیا کروں۔" اس کا انداز ہنوز تھا۔
"تم... ہاں! میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ تمہیں کچھ پکانا دکانا بھی آتا ہے۔" وہ فوراً" اصلی بات کی طرف آگیا تھا۔
"نہیں۔" اریبہ نے سختی سے انکار میں جواب دیا تھا۔
"کیوں...؟"
"کیونکہ میرے ہاں نوکر چاکر موجود ہیں۔" وہ چبا چبا کر بولی تھی۔
"اچھا ہاں... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ تمہارا باپ بڑا پیسے والا آدمی ہے۔ لیکن سنو لڑکیوں کو باپ کے پیسے
گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے' کیونکہ قسمت کا کچھ پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے' تمہیں ایسے گھر لے جائے جہاں کھانا پکا
تمہیں خود کرنا پڑے۔"
شمشیر علی اس کے باپ پر طنز کرکے اچانک ناصحانہ انداز میں بولا تو اس کی نظروں میں اجلال رازی کا گھر گھو
گیا۔ جہاں نوکر صرف اوپری کام کرتے تھے۔ کچن پہلے ساجدہ بیگم سنبھالتی تھیں۔ پھر انہوں نے ثنا کے حوالے
کردیا تھا اور ثنا کے بعد یہ ذمہ داری یقیناً" بہو کو سونپی جانی تھی۔
"سنو... میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جو تم مراقبے میں چلی گئیں۔" شمشیر علی اسے پکار کر بولا اور اس کے
دیکھنے پر پوچھنے لگا۔
"کیا سوچنے لگیں؟"
"کچھ نہیں... تم بتاؤ کیا پکانا ہے۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہیں... ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہیں پکانا نہیں آتا؟" شمشیر علی نے حیرت کا اظہار کیا۔
"پکاتے پکاتے آ ہی جائے گا۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکلی اور سیدھی کچن میں آگئی تھی۔
"دیکھو... کوئی زبردستی نہیں ہے۔" شمشیر علی فوراً" اس کے پیچھے آگیا تھا۔ "تمہیں اگر پکانا نہیں آتا تو ؟

مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔
"لیکن میرے لیے تمہاری موجودگی مسئلہ پیدا کررہی ہے۔" وہ زچ انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "تم پلیز جاؤ
یہاں سے۔"
"تمہاری مرضی۔" وہ کندھے اچکا کر کچن سے نکل گیا۔
اس نے پہلے سارے کا جائزہ لیا۔ پھر چکن دھو کر پیاز کاٹنے لگی۔ یہ واقعی بہت مشکل کام تھا۔ بلکہ اس کے لیے
تو مشکل ہی مشکل تھی۔ کیونکہ اس نے کبھی پکانے کا کام نہیں کیا تھا۔ البتہ سارہ بی بی کے ساتھ کچن میں گھسی
رہتی تھی۔ بہرحال جیسے تیسے کرکے اس نے چکن کا سالن بنا دیا۔ پھر گنتی کی تین روٹیاں دو اس کے لیے اور ایک
اپنے لیے ڈال کر کچن سے نکلی تو پسینہ پسینہ ہورہی تھی اور کپڑے بھی تو نہیں تھے جو چینج کرنے کا سوچتی۔ لاؤنج
میں ہی پنکھے کے نیچے کھڑی ہو کر دوپٹے کے پلو سے منہ صاف کرتے ہوئے اچانک اسے کسی تبدیلی کا احساس ہوا تو
چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اتنے دنوں سے جو لکڑیوں اور برادے کی گندگی پھیلی ہوئی تھی اب اس کا نام ونشان
نہیں تھا۔ سرخ سیمنٹ کا فرش خوش گوار تاثر دے رہا تھا اور شمشیر علی جو اتنے دنوں سے لکڑیوں کی ٹھونک ٹھاک
کررہا تھا تو اس کا وہ شغل اب سمجھ میں آیا۔ باقاعدہ ایزل بنا کر وہ کھڑا پنسل سے اسکیچ بنا رہا تھا یا بنانے کی کوشش
کررہا تھا۔ اریبہ کی طرف کیونکہ اس کی پشت تھی' اس لیے وہ آرام سے اس کی حرکات دیکھ رہی تھی۔ چند لائنیں
کھینچنے کے بعد وہ جیسے جھنجلایا تھا۔ پنسل سے کراس کا نشان بنایا' پھر پیپر کھینچ کر موڑ توڑ کر ایک طرف اچھالا تو اریبہ
بے ساختہ چلائی تھی۔
"اے... یہ کیا کررہے ہو؟"
شمشیر علی پورا گھوم کر اسے دیکھنے لگا تو وہ سٹپٹا کر بولی تھی۔
"میرا مطلب ہے پھر کیوں گند پھیلا رہے ہو۔ وہ ڈسٹ بن رکھا تو ہے اس میں ڈالو۔"
"سوری...!" شمشیر علی نے بڑی سعادت مندی دکھائی۔ پھینکا ہوا کاغذ کا گولا اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ پھر
پوچھنے لگا۔
"کھانا پک گیا؟"
"ہاں..."
"لے آؤ..." شمشیر علی کے لہجے میں تحکم نہیں تھا۔ بلکہ برجستہ کہا تھا۔ پھر بھی وہ سلگ گئی۔
"نوکر نہیں ہوں میں تمہاری۔ پکا دیا ہے' یہی غنیمت جانو۔"
"اچھا اور جو میں اتنے دنوں سے پکا کر تمہیں کھلا رہا ہوں۔"
"وہ تمہاری مجبوری ہے۔" وہ فوراً" بولی تھی۔
"مجبوری... میری کیا مجبوری ہے؟" شمشیر علی کی پیشانی پر بل آگئے تھے۔
"تم جانو... مجھے کیا پتا۔" وہ سر جھٹک کر کمرے میں آگئی۔ دروازہ اس نے جان بوجھ کر بند نہیں کیا تھا۔ کیونکہ
اسے بھوک لگ رہی تھی اور اس خوش فہمی میں تھی کہ وہ کھانا نکال کر لائے گا۔ اس کے کمرے سے کچن کا دروازہ
سامنے نظر آرہا تھا۔ جب اس نے شمشیر علی کو کچن میں جاتے دیکھا تو اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ جبکہ دھیان
اسی کی طرف تھا اور وہ کتنی دیر بعد دروازے میں آکر اسے مخاطب کیے بغیر کہنے لگا۔
"میں جا رہا ہوں۔ کچھ منگوانا ہو تو بتادو۔"
اس نے جواب دیا' نہ ہی اس کی طرف دیکھا تھا اور جب بیرونی دروازہ کھلنے بند ہونے کی آواز کے بعد گاڑی
اسٹارٹ ہوئی' تو وہ اسے گالیاں دیتے ہوئے اٹھ کر کچن میں آئی اور جلدی سے پلیٹ میں سالن نکالا' پھر روٹی کا

برتن دیکھ کر رو دینے کو ہو گئی تھی۔
"منحوس ساری روٹیاں کھا گیا۔"

☼ ☼ ☼

یاسمین جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ پھر ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز پر تیزی سے ادھر آئی تھی۔

سارہ کے ساتھ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا جانے کون تھا۔ جن سے سارہ کہہ رہی تھی۔

"اریبہ اصل میں بہت تھک گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے کمپلیٹ ریسٹ بتایا تھا۔ جب ہی ڈیڈی اسے لے گئے ہیں۔"

"ہاں... یہاں رہ کر تو وہ ریسٹ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکچر مس ہونے کے خیال سے بھاگی چلی جاتی تھی۔"

"جی... آپ تو جانتی ہیں اسے۔ اسٹڈی کے معاملے میں کتنی جنونی ہے۔" سارہ نے کہا تب ہی یاسمین بڑی، جوان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔

"مما! آیئے نا!" سارہ یاسمین کو بلا کر پھر تعارف کرانے لگی۔ "یہ میری مما ہیں اور مما! یہ اریبہ کی فرینڈز ہیں۔"

"السلام علیکم۔" "بیٹھو بیٹا۔" یاسمین انہیں بیٹھنے کا کہہ کر خود بھی بیٹھ گئی تو پوچھنے لگی۔ "اریبہ کے ساتھ ہیں آپ لوگ؟"

"جی آنٹی! اتنے دنوں سے اریبہ کالج نہیں آئی تو ہم نے سوچا اس کی خیر خیریت معلوم کرلیں۔" عروسہ نے جواب کے ساتھ کہا۔

"اس کا سیل فون بھی آف جا رہا ہے۔" یہ مہک تھی۔

"اصل میں بیٹا! وہ اپنا سیل فون یہیں بھول گئی تھی۔ شاید بیٹری ڈاؤن ہونے سے آف ہو گیا ہوگا۔" یاسمین نے بات بنائی تب ہی بی بی چائے لے کر آگئیں۔ ساتھ لوازمات بھی تھے۔

سارہ نے فوراً اٹھ کر ٹیبل ان تینوں کے قریب دھکیل دی اور پلیٹیں ان کے سامنے رکھ کر بولی۔

"آپ لیں پلیز... مما آپ کیا لیں گی؟"

"بس بیٹا! چائے۔ مجھے چائے دے دو۔" سارہ کپ سیدھے کر کے چائے ڈالنے لگی۔

"ویسے کب تک آئے گی اریبہ؟" جمال نے اچانک پوچھ کر سارہ کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ لیکن یاسمین کے لیے کوئی مشکل نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ سے باتیں بنانے میں کمال حاصل تھا۔

"اب تو اریبہ اپنے ڈیڈی کے رحم و کرم پر ہے بیٹا! اور اس کے ڈیڈی جب تک اس کی صحت کی طرف سے مطمئن نہیں ہو جائیں گے۔ اسے یہاں نہیں لائیں گے۔"

"لیکن آنٹی! ایگزام بھی تو قریب ہیں۔" عروسہ نے یاد دلایا۔

"ہاں، لیکن ہمارے لیے اریبہ کی صحت زیادہ اہم ہے۔ ایگزام کی ٹینشن دے کر ہم اسے مزید بیمار نہیں کر سکتے۔ میں نے تو اس کے ڈیڈی سے کہہ دیا ہے۔ اریبہ ایگزام نہیں دے گی۔"

انتہائی بے بسی میں بھی یاسمین اعتماد سے بول رہی تھی۔ پھر اس نے ان تینوں کو مزید کچھ کہنے یا پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ باتوں کا رخ ان کی طرف موڑ کر سوال پر سوال کرتی گئی تھی۔ یعنی وہ کہاں رہتے ہیں۔ ان کے گھر میں کتنے بہن بھائی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ تینوں کے تفصیلی انٹرویو لے ڈالے اور ان کے جانے کے بعد

کر بیٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پتیلی میں اتنا سالن موجود تھا جو رات میں دو آدمی آرام سے کھا سکتے تھے۔ البتہ روٹی اسے ڈالنی تھی اور اب تین کے بجائے چار روٹیاں بنا کر وہ کمرے میں آکر بیٹھی تھی کہ شمشیر علی آگیا اور ہاتھ میں پکڑا بڑا سا شاپنگ بیگ اس کے سامنے بیڈ پر ڈال کر کہنے لگا۔

"مجھے عورتوں کی شاپنگ کا تجربہ نہیں ہے اور تمہاری چوائس تک تو شاید میں پہنچ ہی نہیں سکتا۔ بس جتنی جیب نے اجازت دی اور جو سمجھ میں آیا، لے آیا.... آگے تمہاری مرضی۔"

اور اب اس کی کیا مرضی تھی۔ مجبوری تھی۔ شمشیر علی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے شاپنگ بیگ بیڈ پر الٹ دیا۔ تین عدد ریڈی میڈ سوٹ تھے جنہیں اس نے کھول کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور ایک سوٹ لے کر فوراً واش روم میں بند ہو گئی۔ کیونکہ اب اسے پسینے کی بساند میں رچے اپنے کپڑوں سے گھن آنے لگی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ اس نے نہانے میں لگائے، پھر چائے کی شدید خواہش اسے کچن میں لے آئی تو پہلے اس نے ایک کپ کا پانی چولہے پر رکھا۔ پھر کچھ سوچ کر ایک کپ اور ڈال کر دو مگوں میں چائے بنائی اور لے کر لاؤنج میں آئی تو وہ تخت پر بیٹھا اپنے ٹوٹے ہوئے موبائل سے غالباً نمبر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی نیا موبائل رکھا تھا۔

اریبہ نے خاموشی سے چائے کا ایک مگ اس کے سامنے رکھ دیا اور خود پلٹ کر خاصے فاصلے پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہانے کے بعد اب وہ خود کو خاصا تر و تازہ محسوس کر رہی تھی اور ایسے ہی چائے کا مزا لینا چاہتی تھی۔ جب ہی ذہن سے ہر خیال جھٹک کر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگی۔ جس کا چہرہ موبائل کے ساتھ مغز ماری کرتے ہوئے زاویے بدل رہا تھا۔ پھر وہ اسی طرح اپنے کام میں مصروف رہ کر بولا تھا۔

"کیا ملا تمہیں میرا موبائل توڑ کر۔ خوامخواہ خرچا کرا دیا۔" پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کسے فون کر رہی تھیں؟"

"ڈپٹی کمشنر کو..." وہ جل کر بولی تھی۔

"ڈپٹی کمشنر... وہ تمہارا کون ہے؟" وہ ٹھٹکا نہیں تھا۔ ناگواری سے پوچھ رہا تھا۔

"کوئی بھی ہو، تمہیں کیا۔"

"ہاں مجھے کیا... مجھے تو تم سے مطلب ہے... نیلا رنگ تم پر اچھا لگ رہا ہے۔" وہ شرارت سے مسکراتا اچھا لگ رہا تھا۔

"شٹ اپ...!" وہ فوراً نظریں چرا گئی تھی۔

شمشیر علی دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تو وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"یقیناً" لوگ اس کی وجاہت کو سراہتے ہوں گے اور لڑکیاں بہانے بہانے سے اس کے پاس آتی ہوں گی۔ شاید یہ خود سے آگاہ بھی ہے۔ جب ہی تو کہہ رہا تھا۔ رادھا والا شام۔"

"شام..." ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا، ایک دم پکار اٹھی۔

"شام... مجھے لگ رہا ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھا ہے؟"

شمشیر نے جھٹکے سے سر اونچا کیا تھا۔ وہ خائف ہو گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راحت جبین

ساری بھول ہماری تھی

ناولٹ

عریشہ نے سائن کرنے سے انکار کردیا تو نعمان کو غصہ آگیا۔ اس نے حمیدہ کو وہاں سے بھیج دیا اور عریشہ پر تشدد کرنے لگا۔ عریشہ کی چیخیں سن کر ابرار وہاں پہنچ گیا۔ اس نے عریشہ کو بچانے کی کوشش کی۔ مگر اسی وقت حمیدہ محلے والوں کے ساتھ وہاں آگئیں اور ابرار اور عریشہ پر ناجائز تعلقات کا الزام لگادیا۔ ثوبان بھی آگیا' مگر اس نے بھی عریشہ کو بچانے کی کوشش نہ کی۔ عریشہ کو بے حد صدمہ ہوا' وہ بے ہوش ہو گئی۔

فہد نے مریم کے سسرال فون کرکے مریم اور اپنی محبت کے بارے میں بتادیا۔ انہوں نے مریم کے رشتے سے انکار کردیا۔

ثوبان نے سنعیہ سے شادی کی بات کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ اسے اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ شادی ہم پلہ شخص سے ہی کرنی چاہیے۔

عریشہ ہر وقت گم صم رہنے لگی۔ وہ زندگی سے دور چلی گئی تھی' مگر پھر ابرار کی کوششوں سے وہ رفتہ رفتہ زندگی کی طرف واپس آنے لگی۔

مریم کے لیے بانو ایک بار پھر اپنے دیور کا رشتہ لے کر آگئی۔ اس نے مریم کے کمرے کی تلاشی لی تو مریم کا موبائل اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ مریم پر چیخنے لگی۔ اسی وقت نعمان وہاں آگیا۔

۸

آٹھویں اور آخری قسط



مریم نے آنکھیں پورے زور سے میچ لیں۔
اسے پورا یقین تھا یہ موبائل اس کے سر پر لگے گا۔ موبائل کے ٹکڑے مریم کے آس پاس بکھر گئے۔
نعمان لپک کر اس کا گلا دبانے کو تھا مگر حمیدہ اور بانو نے اسے جکڑ لیا۔

”ماردوں گا اسے۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”اسے مار کے اپنی زندگی کیوں تباہ کرتے ہو..... یہ تو بے غیرت اور بے شرم ہو گئی ہے..... اس بے حیا کے لیے جیل کی ہوا کھاؤ گے؟“ بانو نے اس کا بازو پوری قوت سے دبوچ رکھا تھا۔

”تو کیا زندہ چھوڑ دوں کہ یہ گلیوں میں اپنے عاشق کے ساتھ ہماری عزت رولتی رہے؟“

”نکاح پڑھوا کے دفع کر۔ اس کا یہی علاج ہے.....“
نعمان رک کر کچھ لمحے تھر تھر کانپتی مریم کو خوں خوار نظروں سے دیکھتا رہا۔

”ٹھیک ہے! جمعہ کو اس کا نکاح ہے..... بس دو چار بندے آجائیں۔ مجھے تم لوگوں کی ہر شرط منظور ہے۔“

وہ بانو سے بازو چھڑا کر باہر نکل گیا۔
مریم جہاں کھڑی تھی، وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔

”بس! ہو گئے ارمان پورے.....“ بانو نے کھا جانے والی نظروں سے مریم کو دیکھا۔ ”تجھ جیسی لڑکیاں پیدا ہی اس لیے ہوتی ہیں کہ ماں باپ کے سروں پر کھ ڈال سکیں..... اماں! ہم بھی تو تھے ان ہی گلی محلوں میں کھیل کود کر جوان ہوئے..... عشق عاشقی کے یہ کھیل ہمیں تو نہ سوجھے۔ یہ نرالی پیدا ہوئی تھی۔“ بانو بھی گرج برس کر چلی گئی۔

مریم نے دھندلائی آنکھوں سے ماں کو دیکھا..... اور بھاگ کر حمیدہ کے پیر پکڑ لیے۔

”اماں! میں مرجاؤں گی..... ایسا مت کر..... میں فہد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“

”زندہ تو تو ویسے بھی نہیں بچے گی مریم۔“ حمیدہ نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”عافیت اسی میں ہے کہ خاموشی سے نعمان کی بات مان لے۔“

مریم نے ان کے پیر چھوڑ دیے۔

”کتنے عجیب لوگ ہو..... عریشہ کو اس کی مجبوری دلانے کے لیے خود اسی کے منہ سے انکار کہلوا دیا..... راتوں کو اٹھ اٹھ کر ثوبان کے کمرے میں جاتی تھی تو لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنی ساری رقم ثوبان پر لٹا دی۔ تم لوگ خوش ہو کر تالیاں بجاتے رہے۔ صرف اس لیے کہ وہ یہ سب آپ کے بیٹے کے لیے کر رہی تھی اور عریشہ آپ کی نہیں، عادلہ کی بیٹی تھی..... اسی لیے سب نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں..... اور میں یہ سب کسی اور کے لیے کر رہی ہوں تو قابل سزا ہوں؟ کتنا دوغلا پن ہے آپ لوگوں میں.....“

”تو واقعی پاگل ہو گئی ہے۔“ حمیدہ کو یہ سچی باتیں ہضم نہیں ہوئی تھیں۔ تب ہی غصے میں بکتی جھکتی باہر نکل گئیں۔

”کاش! میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں.....“

”کل سے کمرے میں بند ہے۔ باہر ہی نہیں نکلا..... پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ گیا تو بڑا خوش خوش تھا۔ دفتر بھی نہیں گیا۔“

حمیدہ ابھی مریم کی فکر سے نکلی نہیں تھیں کہ ثوبان کی فکر لاحق ہوئی۔

”میرے سر پر کھڑی ہو کر ٹر ٹر نہ کر! جس کا جو دل چاہتا ہے کرے۔ میں نہ پہلے کسی کھاتے میں تھا، نہ اب ہوں۔“ برکت حسین نے بے زاری سے لتاڑا تو وہ دل مسوس کر اٹھ گئیں..... گھر میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس سے وہ دل کا حال کہہ سکتیں۔ فاطمہ نے بھی آنا چھوڑ رکھا تھا۔

بھاری بھر کم وجود کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنا آسان نہ تھا..... مگر وہ ہمت کر کے اوپر تک آگئیں۔ ثوبان اوندھا لیٹا تھا۔

”ثوبان! ابھی تک سویا ہے؟“
ثوبان کروٹ بدل کر سیدھا ہوا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی سرخ آنکھیں رت جگوں کی آماجگاہ تھیں۔ بکھرے بال، بڑھی شیو۔ اس نے آسمان چھونے کی خواہش میں زمین سے پاؤں بھی اٹھا لیے تھے۔ منہ کے بل تو گرنا ہی تھا۔

”تجھے کیا ہوا ہے..... بخار ہے؟“

”نہیں! ٹھیک ہوں۔ آپ اوپر کیوں آئی ہیں؟“
ثوبان کے لہجے میں حد درجہ بے زاری تھی۔

”تجھے ہی دیکھنے آئی تھی..... ورنہ مجھ سے کہاں سیڑھیاں چڑھی جاتی ہیں۔ کل سے نیچے ہی نہیں اترا..... نہ کھانا، نہ ناشتا.....“

”مر تو نہیں گیا تھا..... آہی جاتا نیچے۔“

”اللہ نہ کرے، کیسی عجیب بات کر رہا ہے۔“ حمیدہ نے دہل کر کلیجے پر ہاتھ رکھا۔

”اماں! جاؤ نیچے۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔“

”تو تو بڑا خوشی خوشی گیا تھا اس لڑکی سے بات کرنے..... کیا ہوا؟“ حمیدہ بھی کہاں ہمت ہارنے والی تھیں، جب تک بات کی تہہ تک نہ پہنچ جاتیں۔

”کیا ہونا تھا۔ اس منحوس گھر میں پہلے کچھ سیدھا ہوا ہے جو اب ہوتا۔“ وہ پھٹ پڑا۔ ”کیا کیا ہمارے باپ نے ہمارے لیے؟ ساری عمر پلنگ پر بیٹھ کر جلیبیاں کھا کر گزار دی۔ کیا ہے ہمارے پاس؟ یہ دو ٹکے کا گھر..... وہ بھی وہاں، جہاں اس کی گاڑی بھی نہیں آسکتی..... کیسے ہاں کر دیتی وہ..... ہماری تو ساری زندگی سسک سسک کر گزر گئی اور آگے بھی اسی طرح گزرے گی..... کیڑے مکوڑے ہیں ہم..... کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی۔“

”کبھی رب کا شکر بھی ادا کر لیا کر۔“ حسب فطرت حمیدہ کو تاؤ آگیا۔

”سکھایا تھا؟“ وہ مڑ کر ماں کو لال لال آنکھوں سے گھورنے لگا۔ ”کبھی سکھایا تھا ہمیں شکر کرنا.....؟ میں نے تو ساری زندگی اس گھر میں ہر کسی کو روتے ہی دیکھا۔ پیٹ بھرا ہوتا تھا، تب بھی وہی واویلا کہ ہائے! ہم تو بھوکے مر گئے۔“

”اس لڑکی نے نا کر دی تو تپ ہم پر کیوں نکال رہا ہے۔ تجھے پڑھایا لکھایا..... نعمان کے منہ میں نوالہ ڈالنے سے پہلے تیرے منہ میں ڈالا۔ اچھی سے اچھی چیز تیرے لیے رکھی..... اب یہ صلہ دے گا ہمیں؟“

حمیدہ کو سچ مچ صدمہ ہوا۔ اپنی ساری اولادوں میں سے وہی سب سے پیارا تھا..... اس کی خاطر ساری اولاد سے ناانصافی کر جاتیں۔ آج وہی طعنے دے رہا تھا۔

”تو کیا نرالا کر دیا..... سارے ماں باپ کرتے ہیں۔“

اب کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔

”ٹھیک کہا..... سارے ہی کرتے ہیں۔ پر ساری اولادیں وہ نہیں کرتیں، جو ہماری اولاد کر رہی ہے۔“

”اپنا بویا ہی سامنے آتا ہے اماں!“ وہ بڑبڑایا۔

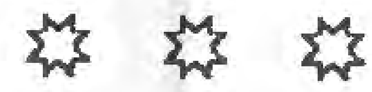
”پڑا رہ اپنے حجرے میں..... پڑا رہ..... پر کسی لڑکی کے پیچھے زندگی نہیں برباد کی جاتی۔ تیری نوکری ہے اور.....“

”وہ نوکری بھی تو اسی کی دین تھی۔ چھوڑ آیا ہوں۔“

”تو نے نوکری بھی چھوڑ دی.....“ حمیدہ کو تو چکر ہی آگئے۔

”ہاں.....“ اس نے باتھ روم میں جا کر دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا۔

حمیدہ بے دم سی ہو کر وہیں بیٹھ گئیں۔
”یا اللہ! یہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟“



مریم نے کھڑکی کا ذرا سا پٹ کھول کر جھانکا۔
نعمان نہانے کی تیاری میں تھا۔ اس نے اپنا کرتا اتار کر تار پر ڈالا اور تولیہ اتار کر باتھ روم میں گھس گیا۔ مریم کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کے پاس یہی پانچ دس منٹ تھے۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آئی۔ باورچی خانہ سے مسالہ بھوننے کی خوشبو آرہی تھی۔ وہ دبے پاؤں تار تک آئی۔ نعمان کا کرتا اٹھا کر اس کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ اس کے ہاتھ ہی نہیں، پورا وجود

کانپ رہا تھا۔

کوئی بھی آجاتا تو یہ آخری رستہ بھی بند ہو جانا تھا۔

تب ہی گوہر مقصود ہاتھ آ لگا۔

اس نے کرتا تار پر پھینکا اور تیزی سے کمرے میں آ گھسی۔

کانپتے لرزتے ہاتھوں سے نعمان کے سیل پر فہد کا نمبر ملایا۔

یہ نمبر تو اس کی روح پر لکھا تھا۔

دوسری بیل پر کال ریسیو کرلی گئی۔

"ہیلو......"

"فہد...... میں مریم بات کر رہی ہوں۔" وہ تیزی سے مگر سرگوشی میں بولی۔

"مریم! کہاں غائب ہو؟ تمہارا نمبر کیوں بند ہے؟"

"میرا موبائل ان لوگوں نے توڑ دیا ہے۔"

"تو گھر والوں کو پتا چل گیا کہ ہم......"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے فہد! گھر والوں نے میری شادی طے کر دی ہے' جمعہ کو نکاح ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"پلیز کچھ کرلو...... میرے پاس تم سے رابطے کا یہی آخری موقع ہے۔" وہ رو پڑی۔

"تو ٹھیک ہے! تم کسی طرح گھر سے نکل آؤ...... آگے میں سنبھال لوں گا...... اگر گھر والے سیدھے طریقے سے ہماری بات نہیں مانتے تو یہی سہی۔ اب ہمیں یہ قدم اٹھانا ہی ہو گا۔"

"میں تیار ہوں۔" مریم کے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔

"تو پھر پرسوں شام کو چار بجے کسی بھی طرح نکل آنا۔ میں تمہیں اس پارک میں اسی جگہ ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے! اب بند کرتی ہوں۔ کسی کو پتا نہ چل جائے۔"

"آئی لو یو۔"

مریم کے پاس جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے فون تیزی سے بند کر کے نمبر ڈیلیٹ کر دیا۔ موبائل واپس کرتے میں ڈال کر واپس آ کر پلنگ پر گر گئی۔

اسے لگا' وہ بہت لمبا سفر طے کر چکی ہے۔ حالانکہ اسے ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

عریشہ کاریڈور میں کھڑی برستے مینہ میں بھیگے سبز زیتون ڈھونڈ رہی تھی۔ بارش اتنی شدید تھی کہ بارش کی چادر لان کا سارا منظر چھپا لیتی۔ عقب میں ہلکی پھلکی باتوں کی آواز کے ساتھ برتنوں کی کھنکھناہٹ بھی شامل ہو گئی۔ گویا فاطمہ سب کے لیے چائے لے آئی تھی۔

"تو تمہارا طویل سفر تمام ہونے کو ہے......" نبیلہ نے پوچھا۔

"ان شاء اللہ بہت جلد......" ابرار کی دھیمی آواز اور مضبوط لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"ماں کو کب لاؤ گے؟" محسن نے دریافت کیا۔

"بہت بے تاب ہوں...... بس! پہلے ایک اچھا سا گھر ڈھونڈ کر سیٹ کرلوں۔" اس نے مطمئن انداز میں بتایا۔ پھر فاطمہ سے پوچھنے لگا۔

"آپ ابھی تک یہیں ہیں؟"

"کیا مطلب......؟" چائے بناتی فاطمہ نے الجھ کر دیکھا۔

"برکت ماموں ملے تھے۔ بتا رہے تھے' جمعے کو مریم کا نکاح ہے۔"

فاطمہ کی نگاہ نبیلہ سے ٹکرائی۔

"ہاں...... بہت سادگی سے کر رہے ہیں...... محسن! کل فاطمہ کو چھوڑ آنا......" نبیلہ نے بات سنبھالی۔

"اور آپ......؟" محسن نے پوچھا۔

"میں عین نکاح کے وقت جاؤں گی۔"

فاطمہ نے مشکور نگاہوں سے نبیلہ کو دیکھا۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ نبیلہ کا یوں جانا محض دنیا کے دکھاوے کے لیے ہے' ورنہ وہ کبھی اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہتیں۔

"تم اب بھی برکت بھائی سے ملتے ہو؟" نبیلہ نے پوچھا۔

"سر راہ مل جائیں تو رک جاتا ہوں۔ میں نے معاف خدا پر چھوڑ رکھا ہے۔" ابرار نے مضبوط لہجے میں کہا۔ نبیلہ نے ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اسی لیے اتنے پر سکون ہو۔"

محسن نے الجھ کر ابرار اور نبیلہ کو دیکھا۔

فاطمہ نے عریشہ کے لیے چائے نکالی تھی۔ ابرار نے بارش کے پس منظر میں کھڑی عریشہ کو دیکھا۔ وہ اتنی گم تھی کہ احساس بھی نہ ہوا۔ بارش اسے بھگو رہی تھی۔

ابرار نے لاشعوری طور پر اس کا کپ اٹھایا اور اس کے قریب چلا آیا۔

فاطمہ نے ٹھٹک کر محسن کو دیکھا۔ محسن نے نبیلہ کو۔

نبیلہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

"چائے......"

عریشہ چونک کر مڑی۔ "میں لے لیتی۔"

"کوئی بات نہیں' میں لے آیا ہوں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا تو عریشہ نے کپ پکڑ لیا...... اس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو چائے کی گرمائش سکون دینے لگی۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی زندگی کی ترجیحات طے کرلی ہیں۔"

"پتا نہیں! شاید یہ خود کو مصروف رکھنے کا بہانہ ہے۔"

"جو بھی ہے اچھا ہے...... ہمیں زندگی اس لیے نہیں ملی کہ دوسروں کی خاطر ضائع کی جائے یا ماضی کی ندامتوں کی نذر کر دی جائے۔"

"تمہیں وعظ کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔"

عریشہ کا لہجہ بہت زیادہ تلخ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ برا مان گیا۔

"میں ہر کسی کو نصیحتیں نہیں کرتا۔" وہ جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

عریشہ نے ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا...... سب لوگ باتوں میں مصروف تھے اور وہ آسانی سے ان میں شامل ہو گیا تھا۔

وہ خاموشی سے شاخوں میں چھپے سبز زیتون تلاشنے لگی۔

☼ ☼ ☼

بانو نے حمیدہ کو صاف منع کر دیا تھا کہ "گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں...... مجھے پیسے دے دینا...... جو کچھ خریدنا ہوا۔ خود ہی خرید لوں گی...... تو بس گھر میں رہ کر اس پر نظر رکھ۔" سو وہ ہمہ وقت گھر میں موجود رہتیں۔

...... مریم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں وہ گھر سے کیسے نکل پائے گی۔ حمیدہ کو نہانا بھی ہوتا تو چپکے سے دروازے کی چٹخنی باہر سے چڑھا دیتیں اس نے اپنے چھوٹے سے بیگ میں دو جوڑے اور چند سو روپے جو اس کے پاس رکھے تھے۔ سنبھال کر رکھ لیے۔ اب اسے ایک ذرا سے موقع کی تلاش تھی۔

گھڑی کی سوئیاں چار پر جا رکیں۔ مریم نے بے چین ہو کر کمرے سے باہر جھانکا...... حمیدہ بہت بے دلی سے ایک دوپٹے پر کرن ٹانک رہی تھیں۔

"اب کیا کروں؟ اماں کو کیسے یہاں سے ہٹاؤں؟"

اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے سوچا۔ اس کا ذہن پھرکی کی طرح گھوم رہا تھا۔ یہی ایک گھنٹہ تھا۔ پھر تو برکت حسین نے بھی مسجد سے واپس آ کر بیٹھک سنبھال لینی تھی۔ تب نکلنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ تب ہی دماغ میں اک جھماکا ہوا۔

تھوڑی دیر میں اس کی کراہیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

"کیا ہوا؟" حمیدہ دروازے میں آ کھڑی ہوئیں۔

"اماں! پیٹ میں بہت درد ہے۔" وہ پلنگ پر دہری ہو کر ایک ہاتھ سے پیٹ دبائے کراہ رہی تھی۔

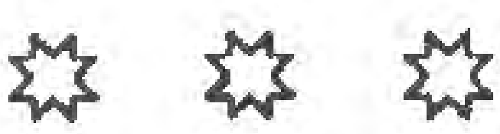
"ایسے کیسے اچانک درد ہونے لگا؟" حمیدہ نے ناگواری سے پوچھا۔

"صبح سے ہی تھا۔"

"آ جائے تیرا باپ تو...... گولی منگوا دیتی ہوں۔"

"مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔"

"نہیں، ہو رہا تو نہ ہو۔" وہ بے رخی سے بولیں۔
"اماں! میں مر جاؤں گی۔ مجھے بہت درد ہے۔"
مریم رو پڑی۔ حمیدہ کتنی بھی سنگدل ہوں، تھیں تو ماں۔
"اچھا! تیرے لیے پودینے اور سونف والی چائے بنا دیتی ہوں۔"
"اماں! اس سے کیا ہو گا۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا تو یہ ساتھ والوں کی ثریا سے درد کی گولی ہی لا دیں۔"
مریم نے پیٹ میں مکیاں مارتے ہوئے کہا.....
حمیدہ سوچ میں پڑ گئیں۔ ثریا کا گھر کون سا دور تھا۔ یہ دروازے سے دروازہ ملا تھا..... وہ ایک ہی منٹ میں جا کر واپس بھی آجاتیں..... یہ سارے محلے کو پتا تھا کہ ثریا کے گھر میں معمولی درد و بخار کی دوا موجود ہوتی تھی۔
"اچھا! میں لاتی ہوں۔"
"آپ لے کر آئیں..... میں باتھ روم میں ہوں۔"
وہ کراہتی ہوئی اٹھی اور حمیدہ کی نظروں کے سامنے باتھ روم میں چلی گئی تو حمیدہ مطمئن ہوتی باہر نکلیں۔
مریم نے صرف باتھ روم کا نل کھولا..... جیسے ہی بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ وہ لپک کر کمرے میں گئی۔ چادر اوڑھ کر بیگ بغل میں دبائے باہر نکلنے میں اسے صرف چند لمحے لگے تھے..... حمیدہ کے سلام دعا کے بعد گولی لے کر آنے کے عرصے میں وہ گلی عبور کر کے مین سڑک پر پہنچ گئی تھی۔
حمیدہ نے باتھ روم کے بند دروازے کے دوسری طرف گرتے پانی کی آواز سنی۔
"یہ گولی رکھ رہی ہوں۔ نکل کر کھا لینا۔ میں چائے بناتی ہوں۔" حمیدہ نے بلند آواز میں کہا اور گولی رکھ کر خود باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ ایک کپ چائے بنا کر کمرے میں آئیں تو مریم ابھی تک باتھ روم میں تھی۔ حمیدہ نے کپ رکھ کر تھوڑی انتظار کیا..... پھر تشویش کے ساتھ جا کر دروازہ دھڑ دھڑایا۔ دوسری طرف صرف گرتے پانی کی آواز تھی۔
"میں نے کہا سو گئی ہے یا مر گئی ہے؟"
حمیدہ کے ہاتھ کے زور سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔
حمیدہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
خالی باتھ روم میں نل پورا کھلا تھا..... ٹب بھر کر پانی تواتر سے نیچے بہہ رہا تھا۔
"مریم....." حمیدہ نے پاگلوں کی طرح اسے پورے گھر میں ڈھونڈا..... جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بچی ہے، شرارت کر کے پلنگ کے نیچے جا چھپی ہو..... پلنگ کے نیچے بھی دیکھ لیا۔ اپنے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ گھسٹتے ہوئے گلی میں دیکھا۔
پوری گلی سنسان تھی۔
حمیدہ کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔
وہ صحن میں کھڑی ہو کر دھاڑیں مار مار رونے لگیں۔
"کیا ہو گیا حمیدہ! تجھے، پاگل ہو گئی....." برکت حسین نے نماز والی ٹوپی اتار کر ہاتھ میں لیتے ہوئے حیرت اور گھبراہٹ سے پوچھا۔
حمیدہ اپنا سر پیٹنے لگیں۔
"تیرا دماغ ٹھیک ہے؟ کون مر گیا ہے؟"
"مریم مر گئی ہے....."
"کیا؟" برکت حسین نے نا سمجھی سے حمیدہ کو دیکھا۔
"حمیدہ مر گئی ہے..... برکت حسین مر گیا ہے۔ ہم سارے مر گئے ہیں..... برکت حسین! مریم ہم سب کو مار گئی ہے۔"
برکت حسین کے ہاتھ سے ٹوپی چھوٹ کر نیچے گری۔ انہیں ایک ہی پل میں معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ ان کی رنگت خطرناک حد تک زرد پڑ گئی۔
پھر وہ پورے قد سے گرے تھے۔ حمیدہ کے لبوں سے چیخیں نکل گئیں۔



فہد بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔
عاصم اندر آیا۔ وہ اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کی گاڑی فہد کو استعمال کرنی تھی اور اسی کے گھر میں ایک

دو دن ٹھہرنا تھا۔

"یار! تو نے کتنی دیر لگا دی ہے..... وقت دیکھا ہے؟ گاڑی لایا ہے؟" فہد خود بھی گھبرایا ہوا تھا سو ایک ہی سانس میں سوال پر سوال کرتا رہا۔

"ہاں! لایا ہوں۔" عاصم صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔

"تو بیٹھ کیوں رہا ہے..... ہمارے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے۔"

"فہد! میری بات سُن۔ میں نے بہت غور کیا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں یہ ٹھیک نہیں کر رہے۔" عاصم نے سنجیدگی سے کہا تو متحیر سا فہد اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا ٹھیک نہیں کر رہے؟ ہم دونوں نے اپنے اپنے گھر والوں کو منانے کی پوری کوشش کی..... مگر وہ نہیں مانے..... ہمارے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تم لوگوں نے کوشش کی۔ گھر والے نہیں مانے تو سمجھو! وہ تمہارے نصیب میں ہی نہیں تھا۔ مگر اس طرح گھر سے بھاگنا' یہ غلط ہے۔"

فہد کی مٹھی بھینچ گئی۔ اس کا دل چاہا' وہ مکا عاصم کے منہ پر دے مارے۔

"اب جبکہ وہ گھر سے نکل گئی ہوگی۔ اب تجھے لگ رہا ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تو مجھے پہلے بتاتا' میں کوئی اور بندوبست کر لیتا۔"

"فہد! میں پورے خلوص سے تمہاری مدد کرنے جا رہا تھا۔ مگر عین وقت پر میرا حوصلہ پست ہو گیا۔" عاصم نے بے بسی سے کہا۔ "ذرا سوچ! اس کے بھائی چُپ تو نہیں بیٹھیں گے۔ سب سے پہلے میری گاڑی ٹریس ہوگی..... ذرا ٹھنڈے دماغ سے غور کرو۔ تمہارا گھر ہے' ماں اور بہنیں ہیں۔ کل کو پولیس انہیں گھسیٹتے ہوئے لے جائے گی تو تو کیا کرے گا؟ اپنی محبت پانے کے لیے تو اپنی ماں بہنوں کو تھانے کچہری کا منہ دکھائے گا.....؟ کل کو تیری بہنوں کی شادیاں ہونی ہیں۔ لوگ کیسے ایسے شخص کی بہن سے رشتہ جوڑیں گے جو کسی کی بہن کو بھگا لے گیا ہو؟ بات صرف تمہاری زندگیوں کی تو نہیں ہے..... تم دونوں سے وابستہ اور لوگ اور رشتے بھی ہیں فہد۔"

فہد ساکت سا عاصم کا منہ دیکھنے لگا۔

عاصم نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر ٹکائے۔

"میں نہ تمہارا دشمن ہوں نہ مریم کا۔ جوش میں آ کر تمہارا ساتھ دینے کو تیار بھی ہو گیا تھا..... مگر اب احساس ہو رہا ہے کہ میں غلط تھا..... میرا گھر ہے' گھر والے ہیں۔ میری جاب ہے..... میں اس سب کو رسک میں نہیں ڈال سکتا۔ ایسی باتیں کبھی بھی چھپی نہیں رہتیں۔ سامنے آجاتی ہیں۔ جوش سے نہیں' ہوش سے کام لے یار۔"

فہد ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"آج تیرے گھر والے اور کل کو تیری اولاد مشکلات کا سامنا کرے گی۔ گھر سے بھاگی عورت کی اولاد معاشرے میں کبھی بھی سر اٹھا کر نہیں جی سکتی۔"

"میں اس سے محبت کرتا ہوں عاصم!" فہد کا لہجہ بے بس سا تھا۔

"اس محبت کی خاطر دربدر کی ٹھوکریں کھا لے گا؟ اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈال سکے گا.....؟ تھانے کچہری کے چکر لگا لے گا؟ خود کو اچھی طرح جج کر لے۔"

فہد نے سر جھکا لیا۔

"وہ وہاں میرا انتظار کر رہی ہوگی....."

"کچھ دیر انتظار کرے گی..... پھر مایوس ہو کر چلی جائے گی۔"

"اور اس کے گھر والے؟" اس نے سر اٹھایا۔

"تھوڑی دیر مار پیٹ اس خواری سے بہتر ہے' جو تم دونوں اٹھانے جا رہے تھے۔" عاصم نے اطمینان سے کہا۔ وہ گویا گھر سے فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ فہد کو اس کے ارادے سے ہر صورت روک کے رہے گا۔

فہد کا وجود بھنور میں پھنسی کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا۔



مریم نے بے قراری سے پارک کے داخلی راستے کی طرف دیکھا۔

سارے رستے سنسان تھے۔

کل کی بارش کا پانی ابھی بھی ان راستوں پر جمع تھا۔ مریم کے پاس گھڑی نہیں تھی کہ وقت کا اندازہ کر سکتی..... مگر گہری ہوتی شام اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس کے پاس فون بھی نہ تھا کہ فہد کے ساتھ رابطہ کر سکتی۔

اس وقت گھر میں کیا ہو رہا ہو گا؟" اس تصور کے ساتھ ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

موسم خوشگوار تھا مگر اسے پسینے آ رہے تھے۔

"اگر وہ نہ آیا تو....." اس کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ ایک بار تو جی میں آئی' واپس پلٹ جائے مگر واپسی کا مطلب تھا' فہد سے ہمیشہ ہمیشہ کی جدائی۔

"نہیں! وہ آجائے گا۔ کہیں پھنس گیا ہو گا۔" اس نے پسینے سے بھیگتی ہتھیلیاں کالی چادر سے رگڑتے ہوئے خود کو تسلی دی۔ شام کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ اس کے اوپر سے پرندوں کی قطاریں گھروں کو لوٹنے لگیں۔

وہ شام ڈھلے گھونسلا چھوڑنے والے پرندے کی طرح متوحش اور ڈری ہوئی تھی۔ تب ہی کوئی آہستگی سے بنچ کے دوسرے کنارے پر آ بیٹھا۔

مریم نے چونک کر بڑی آس کے ساتھ گردن گھمائی۔ پھر تیزی سے چادر کھینچ کر ہونٹوں میں دبا لیا۔

"آئی ایم سوری مس! لیکن کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں....." وہ جو کوئی بھی تھا' بہت شائستہ لب و لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

مریم بغیر جواب دیے تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

"میں بہت دیر سے آپ کو یہاں پریشان بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔" وہ بھی کھڑا ہو گیا..... ملگجے اندھیرے میں دور بتیاں جلنے لگیں۔ مریم کے قدموں تلے زمین کھسک گئی۔

"فہد نہیں آیا تھا..... فہد نے اسے دھوکا دیا تھا۔" بڑھتی ظلمت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

وہ ڈولتے قدموں سے پارک کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

"بات نہیں! میں کوئی ایسا ویسا انسان نہیں ہوں۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی یہاں سے جا چکا ہوتا۔ مگر اکیلی لڑکی کو اس طرح سنسان پارک میں چھوڑنا میری غیرت نے گوارہ نہیں کیا۔ مجھے نہیں پتا' آپ کون ہیں۔ مصیبت کی ماری ہیں یا محبت کی' مگر میں خلوص نیت سے آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں سسٹر....."

مریم ایک جھٹکے سے رکی۔

"آپ کے پاس موبائل ہے....."

"جی ہے..... آپ کو کال کرنی ہے؟"

"ظاہر ہے! اسی لیے مانگ رہی ہوں۔" وہ جھنجلائی۔

"سوری....." اس نے شرمندہ ہو کر جیب سے موبائل نکال کر دیا۔ مریم فہد کا نمبر ملاتے ہوئے ذرا فاصلے پر جا کھڑی ہوئی۔

اس کا ہاتھ اور دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"اگر فہد نے کال ریسیو نہ کی تو.....؟"

☼ ☼ ☼

فہد کا موبائل بج اٹھا۔ فہد نے سر اٹھا کر دیکھا..... عاصم اس کا موبائل اٹھا رہا تھا۔

"کس کا فون ہے۔"

"پتا نہیں! کوئی نام نہیں' صرف نمبر ہے۔" عاصم نے فون اس کی طرف بڑھایا۔

فہد نے دیکھا' وہ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ اس نے کال کاٹ دی۔

مریم کا دل دھک سے رہ گیا۔

کال ریسیو نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پیروں تلے سے جان نکل گئی۔ وہ جہاں کھڑی تھی' وہیں بیٹھ گئی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" اجنبی گھبرا کر قریب چلا آیا۔

مریم نے بے دردی سے آنکھوں سے دھند رگڑ دی اور کپکپاتی انگلیوں سے میسج لکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کبھی انگلیاں گڑبڑ کر دیتیں اور کبھی آنکھوں سے بہتا پانی۔

اجنبی نے نرمی سے موبائل اس کے ہاتھ سے لے

لیا۔

"کیا لکھوں۔۔۔"

"کیا لکھوں۔۔۔" مریم کا ذہن صاف سلیٹ تھا۔

"مریم۔" پھر اس کے لبوں سے نکلا۔ اجنبی چند لمحے منتظر رہا۔ پھر اس نے "مریم" ٹائپ کر کے اسی نمبر پر سینڈ کر دیا۔ جس پر کال کی گئی تھی۔

"ٹوں۔۔۔ ٹوں۔" اسی نمبر سے میسج تھا۔

"مریم۔۔۔" فہد ایک دم سے سیدھا ہو بیٹھا۔

"مریم کا میسج ہے۔"

"رہنے دے! مایوس ہو کر بیٹھ جائے گی۔" عاصم نے بے زاری سے کہا۔ مگر فہد نے کال ملا لی تھی۔

اجنبی نے بجتا موبائل مریم کی طرف بڑھایا۔ مریم نے جھپٹ کر موبائل کان سے لگایا۔

"فہد۔۔۔ فہد تم کہاں ہو۔"

"تم کہاں ہو؟"

"میں وہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اندھیرا ہو گیا ہے۔ تم ابھی تک آئے کیوں نہیں؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مریم! میری بات سنو۔ میرے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔ میں نہیں آپاؤں گا۔ تم۔۔۔ تم گھر واپس چلی جاؤ۔"

مریم کو لگا زمین و آسمان گھوم گئے ہیں۔

"واپس چلی جاؤں۔۔۔؟ میں کیسے واپس چلی جاؤں؟ اندھیرا ہو رہا ہے۔ گھر میں سب کو پتا بھی چل چکا ہو گا۔ میں واپس کیسے جا سکتی ہوں؟ وہ لوگ مجھے جان سے مار دیں گے۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ اس وقت گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہے۔ تم بس واپس چلی جاؤ۔۔۔ میں اس وقت زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ موبائل کی بیٹری لو ہو رہی ہے۔"

"فہد! میری بات سنو۔۔۔ تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو۔ میں تو ساری کشتیاں جلا کر نکلی ہوں۔ واپس کیسے جاؤں؟ میں تو۔۔۔"

دوسری طرف رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔

مریم نے دیوانہ وار وہ نمبر پریس کیا مگر موبائل آف ہو چکا تھا۔

"بس کریں؟ میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔" وہ ایک ہی پل میں "آپ" سے "تم" پر آیا۔۔۔ گویا اس کی عزت کا گریڈ فی الفور گھٹ گیا تھا۔۔۔ کیونکہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی تھی۔

"چلو! میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"

"کون سا گھر؟ جسے وہ اپنی مرضی اور خوشی سے چھوڑ آئی تھی۔۔۔ اب وہ گھر جائے بھی تو کس منہ سے۔۔۔ اور اگر چلی جائے تو وہ لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

اسے جھرجھری آگئی۔

"دیکھو! اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ اگر کوئی پولیس والا نکل آیا تو ہم دونوں دھر لیے جائیں گے۔" وہ جھنجلایا۔

پولیس کے نام پر وہ تھرا اٹھی۔

"میں ٹیکسی روکتا ہوں۔۔۔" وہ مریم کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر تیزی سے بیرونی رستے کی طرف بڑھا۔۔۔ مریم نے سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔ آسمان تاریک تھا اور لمبے لمبے درخت دیو ہیکل صورت اختیار کر رہے تھے۔۔۔ پرندوں کی آوازیں سو گئی تھیں اور اتنی گہری خاموشی تھی کہ روح کو گھائل کرتی تھی۔

"کیا اس رات کی کبھی سحر ہو گی۔" مریم نے گردن گھما کر دیکھا۔۔۔ وہ شخص مڑ مڑ کر اسے دیکھتے موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔۔۔ مریم کی دم توڑتی حسیات جاگ اٹھیں۔

وہ کون تھا۔

اتنی دل جمعی سے اس کی مدد پر آمادہ کیوں تھا؟

مریم نے اپنی بکھری قوتوں کو مجتمع کیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دوسرے رستے کی طرف بڑھ گئی۔۔۔ باہر نکلنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔

دو سائے اسے دیوانہ وار ڈھونڈ رہے تھے۔

مریم کے ہاتھ سے چھوٹا سا بیگ گر گیا۔ وہ وحشی ہرنی کی طرح دوڑتی چلی گئی۔

سنسان سڑک پر دو سائے بہت دور مگر تیزی سے اس کے پیچھے لپکتے آ رہے تھے۔ یہاں کوئی گھر بھی نہ تھا، جہاں وہ پناہ لے لیتی۔ صرف دو رویہ اونچے لمبے درخت تاریکی اوڑھے بے حسی سے بے بس ہوتی چڑیا اور اس کے تعاقب میں جھپٹتے دو بازوؤں کو دیکھ رہے تھے۔

دور سے کسی ٹیکسی کی لائٹس جھلملائیں۔

ہمت ہارنے سے ذرا پہلے مریم سڑک کے درمیان آگئی۔ ٹیکسی کے ٹائر چیختے چلاتے عین اس کے سر پر رکے۔

"کیا مصیبت ہے بی بی تم کو۔۔۔ یہ ٹیکسی روکنے کا کون سا۔۔۔"

مریم اس کے جملے کے درمیان ہی پچھلا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

"جلدی چلو بھائی۔۔۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے دور لے جاؤ۔۔۔ وہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے۔"

"ایں۔۔۔! نہ بی بی نہ۔۔۔ ہم کو پرائے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑانی۔ تم فوراً "نیچے اترو۔۔۔ میں نے اپنی ٹیکسی کو آگ نہیں لگوانی۔" ڈرائیور ڈر گیا۔

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" وہ بلبلائی۔

"لڑکی۔۔۔ تو مجھ پر رحم کر۔۔۔ میری ٹیکسی سے اتر جا۔"

ڈرائیور نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہیں اللہ رسول کا واسطہ! تمہاری بہنوں کی قسم، میری عزت بچا لو۔"

ڈرائیور نے تذبذب سے سامنے آتے لوگوں کو دیکھا۔ عقب میں وہ بلک رہی تھی منتیں کر رہی تھی۔

مریم کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

وہ لوگ عین سر پر آگئے تھے۔ وہ ان کی آوازیں سن سکتی تھی۔

"حرامزادی! ہم ۔۔۔ سے بچ کر کہاں جائے گی۔"

ٹیکسی کی دونوں سائیڈوں پر دو عفریت کھڑے تھے۔

مریم نے چیختے ہوئے گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا۔

تب ہی رحم اک معجزے کی طرح اس غریب ڈرائیور کے دل پر اترا۔ ٹیکسی ایک جھٹکے سے بڑھی اور گولی کی طرح نکلتی چلی گئی۔

وہ لوگ ٹیکسی پر ہاتھ مارتے رہ گئے۔

"بات سنو لڑکی! ہوش و حواس میں ہو؟" ڈرائیور نے مین روڈ پر آ کر لب کھولے۔۔۔ جواباً" وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

"اب سیدھی طرح اپنے گھر کا پتا بتا دے۔۔۔ ورنہ میں یہیں اتار کر چلا جاؤں گا۔" مریم نے اک روانی میں وہی پتا دیا تھا جہاں سے وہ بھاگی تھی۔

چند لمحوں میں احساس ہو گیا تھا۔۔۔ اس کے لیے اپنے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں۔

"شکر ہے! زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔ آج کا دن ہی خراب ہے۔ صبح سے ایک سواری نہیں ملی اور جو ملی بھی تو۔۔۔"

مریم نے کھڑکی کے شیشے پر گال ٹکا دیا۔

"کیا ہو گا" گالیاں دیں گے، ماریں پیٹیں گے" گلا دبا دیں گے۔"

وہ جن ہولناک لمحوں سے باہر نکلی تھی" اس کے بعد اب کچھ بھی ڈرانے والا نہیں تھا۔

گلی سنسان نہیں تھی۔

وہاں روشنی تھی اور لوگ بھی۔

ڈرائیور کو اچھی طرح اندازہ تھا' اسے کرایہ نہیں ملے گا۔۔۔ سو گلی کے موڑ پر اتار کر چلا گیا۔

اپنی گلی دیکھ کر مریم گویا جی اٹھی۔

مگر یہ گھر کے سامنے ہنگامہ سا کیا تھا۔

کالی چادر میں چہرہ چھپائے وہ گھر کے قریب ہوئی۔

گھر کے اندر سے بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مریم کے حوصلے پست ہونے لگے۔

مگر اب پلٹتی بھی تو کہاں جاتی۔

آگے زندگی تھی یا موت' پیچھے والی ذلت سے بہتر تھی۔

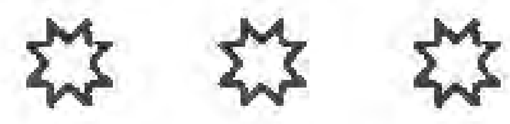
مگر وہ نہیں جانتی تھی' جب بیٹی گھر سے بھاگتی ہے تو ذلت کا تعویذ گھر کے دروازے میں گاڑ جاتی ہے۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے صحن کے وسط میں پڑی میت

کو دیکھا اور میت کے گرد بیٹھے لوگوں نے اسے۔
پھر ایک طرف سے نعمان جھپٹا دوسری طرف سے بانو۔

"مار ڈالا ہمارے باپ کو اب کیا لینے آئی ہے.... وہیں مر کھپ جاتی۔" اسے وجود پر پڑتی ضربات کا احساس نہیں تھا.... وہ سپید چادر کے نیچے چھپے چہرے کو کھوج رہی تھی۔ تب ہی حمیدہ نے چادر ہٹادی۔

"دیکھ لے.... تیری دی ہوئی ذلت سے باپ کا سیاہ پڑتا چہرہ.... تب ہی تو وہ چہرہ ہی چھپا گیا۔ تو نے ہم سب کو مار دیا مریم۔"

عورتوں نے بانو کو مردوں نے نعمان کو کھینچ لیا۔
مریم باپ کے مردہ پیروں میں گر گئی۔

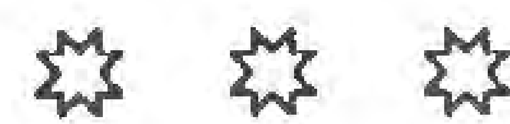


"خدا کے لیے نبیلہ! اسے یہاں سے لے جانا.... یہاں رہی تو نعمان اسے مار مار کر مار ہی دے گا.... جہاں سامنے آتی ہے وہیں پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔" حمیدہ نے نبیلہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

نبیلہ نے تاسف سے ٹوٹی بکھری حمیدہ کو دیکھا۔
کل تک جس شوہر کو در خور اعتنا نہ جانا' آج اسی کے جانے پر یوں بیٹھی تھیں گویا زندگی میں کچھ بھی باقی نہ رہا ہو.... مریم نے انہیں پوری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"فاطمہ! مریم کی تیاری کر دو' ہمارے ساتھ جارہی ہے۔" انہوں نے ایک طویل سانس لے کر فیصلہ سنایا۔

محسن نے ذرا ناگواری سے سب کو دیکھا۔ شاید وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ مگر خاموشی سے باہر نکل گیا۔
مریم نہیں گویا اک بے جان بت تھا جو ان کے ساتھ آیا تھا۔



"یہ کھانا کھالینا...." فاطمہ نے بہت بے زاری سے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔
مریم نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ٹرے کو دیکھا۔

"اور میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں.... جو تین ٹائم کھانا لا کر سامنے رکھوں۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں خود کے لے لیا کرو۔" کیسا اجنبی اور روکھا سا انداز تھا۔ ان چند گھنٹوں نے اس کی پوری زندگی الٹ کر رکھ دی تھی

"فاطمہ آپی...."
"مت کہو مجھے آپی۔" وہ غرائی۔

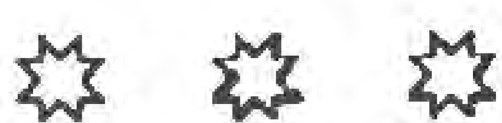
"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" مریم تنہا کمرے میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ عریشہ تک اس کے پاس نہ آئی۔

"نہیں' بہت خوش ہوں.... تم نے اتنا بڑا کارنامہ کیا ہے کہ مجھے تو تمہیں پھولوں کے ہار پہنانے چاہئیں۔ پہلے گھر والوں کے کرتوتوں نے مجھے ہر کسی کے سامنے شرمندہ کیے رکھا اور اب تم نے.... تم نے تو مجھے کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا.... تم نے اپنی زندگی تو تباہ کی ہی تھی' میری زندگی بھی اجیرن کر دی ہے.... میرا کیا قصور ہے' میں کس بات کی سزا بھگت رہی ہوں؟ شرم آتی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ میں اس گھر میں پیدا ہوئی' جہاں کا ہر بندہ اپنی غرض کا غلام ہے۔ نفرت ہے مجھے تم سب سے.... میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی' جس نے میرے باپ کو مار ڈالا۔"

مریم کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ فاطمہ ہسٹریک ہو رہی تھی۔ اس کی بلند ہوتی آواز پر محسن اور نبیلہ آگئے۔

"فاطمہ آپی...." مریم نے اٹھ کر اسے پکڑنا چاہا۔
"دور رہو مجھ سے...." فاطمہ نے اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔ مریم بیڈ پر گری اور وہیں سسکنے لگی.... محسن فاطمہ کو سنبھال کر باہر چلا گیا۔ نبیلہ نے تاسف سے مریم کو دیکھا۔

"اب رونے کا فائدہ مریم.... گھر سے قدم نکالنے سے پہلے ایک بار تو سوچا ہوتا۔"



"کیا ہو گیا ہے فاطمہ! خود کو سنبھالو۔ اپنی حالت

دیکھو..... اس حالت میں اتنی ٹینشن نہ تمہارے لیے ٹھیک ہے نہ بچے کے لیے۔" محسن نے پانی کا گلاس فاطمہ کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے رسان سے سمجھایا۔

"میں کیا کروں محسن! میں جب بھی مریم کو دیکھتی ہوں۔ میری نظروں کے سامنے ابا کی بند آنکھیں آ جاتی ہیں۔"

"لیکن اس طرح کرنے سے وہ واپس تو نہیں آجائیں گے۔"

"آپ سوچ نہیں سکتے محسن! کہ میں اپنے گھر والوں کی وجہ سے کتنی شرمندہ ہوں۔"

"تم کیوں شرمندہ ہوتی ہو؟"

"کاش! آپ نے مجھ سے شادی نہ کی ہوتی تو ساری ٹینشن سے دور رہتے۔ پہلے گھر والوں کی حرکتوں کی وجہ سے عریشہ اور اب اپنے کرتوتوں کی وجہ سے مریم....."

"ہم تب بھی یہی کررہے ہوتے فاطمہ!" نبیلہ نے کمرے میں آکر رسان سے کہا..... محسن نے اٹھ کر ماں کو جگہ دی۔

"کیونکہ وہ کوئی غیر نہیں' میرے بھائی کا گھر ہے..... میں خود کو اس گھر کے مسائل سے دور نہیں رکھ سکتی۔"

"پھوپھو! یہ تو آپ کا ظرف ہے..... ورنہ کون اتنا کرتا ہے' خواہ اپنے ہی کیوں نہ ہوں..... وہ بھی اتنی بدنامی اور ذلت....."

"یہ مکافات عمل ہے فاطمہ..... کانٹے بو کر یہ توقع رکھنا کہ پھول کھلیں گے' بے وقوفی ہی ہوگی..... بھابھی نے ہمیشہ دوسروں کے رستے میں کانٹے بچھائے تھے۔ خود لہولہان کیسے نہ ہوتیں۔ لیکن اس سب کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے..... کیونکہ تم بہت پیاری بیٹی بھی ہو اور بہو بھی۔" انہوں نے شفقت سے فاطمہ کے سر پر ہاتھ رکھا.....

"میں مریم کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ بہت بدنامی ہوگئی ہے۔ اب اس کا کیا بنے گا۔"

نبیلہ ہلکا سا مسکرائیں..... بہن تھی۔ تمام تر ناراضی اور نفرت کے باوجود فکر اپنی جگہ موجود تھی۔

"ان شاء اللہ! کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی پر بھی زندگی کے سارے دروازے بند نہیں کرتا..... کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی روزن کھلا ہی ہوتا ہے۔ میں اسی لیے مریم کو یہاں لے آئی تھی..... اللہ بہتر کرے گا۔"

"امی! اس سے کہیں' پلیز ٹینشن مت لیا کرے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں بالکل..... مجھے اپنا پوتی پوتا بالکل صحت مند چاہیے' تمہارے سمیت..... میں ملازمہ سے کہتی ہوں' تمہارے لیے فریش جوس نکال دے۔"

وہ کہہ کر چلی گئیں۔

"اب ہوگئی تسلی....." محسن نے شرارت سے کہا تو فاطمہ مسکرادی۔ اس کے دل میں نبیلہ کی قدر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ورنہ کوئی اور ساس ہوتی تو طعنے مار مار کر جان ہی نکال دیتی۔

☆ ☆ ☆

عریشہ گیٹ سے اندر آئی تو لان میں گم صم بیٹھی مریم پر نظر پڑی۔ وہ ماحول سے بالکل بیگانہ ہو کر بیٹھی تھی۔ عریشہ کو اس میں اپنا آپ دکھائی دیا۔ دونوں نے محبت کے نام پر بہت بری چوٹ کھائی تھی۔

"مریم!" وہ اس کے قریب آگئی۔ عریشہ کی آواز پر مریم بری طرح چونکی۔

"کیا سوچ رہی ہو....."

"کچھ سوچنے کے لیے بچا ہی کیا ہے..... بس پچھتاوے ہیں۔ جنہیں روز بیٹھ کر گننا شروع کردیتی ہوں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوتا..... پچھتاووں کی آگ کبھی نہیں بجھتی..... خواہ اسے دل میں دفن کردو۔ یہ تب بھی سلگتی رہتی ہے۔"

"ابا زندہ ہوتے تو میں پیر پکڑ کر معافی مانگ لیتی۔" وہ سسکی۔

عریشہ دھک سے رہ گئی۔

کبھی تو وہ سوچا کرتی تھی۔ "ماں زندہ ہوتیں تو معافی مانگ لیتی۔"

"اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا عرشی؟ محبت کی اتنی بڑی سزا..... نبھانا نہیں تھا تو مجھے اس مقام تک کیوں لایا.....؟ مجھے کیوں بدنامی کے اندھے کنوئیں میں دھکیل گیا؟ وہ ایک بار مرے سامنے آجائے میں اس کا گریبان پکڑ کر پوچھوں تو....." وہ بلکنے لگی۔ عریشہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"ان سوالوں کے جواب تو میں بھی ڈھونڈتی ہوں مریم۔ مجھے ملیں تو تمہیں بتاؤں؟" عریشہ کے لب کپکپائے۔ مریم نے دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

دونوں کے چہرے پر ایک ہی دکھ رقم تھا۔

دونوں کی آنکھوں میں ایک سے پچھتاوے تھے۔

عریشہ نے چاہا کہ وہ نہ روئے..... مگر مریم اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی۔

ہم پرندے ہیں نہ مقتول ہوائیں پھر بھی
آ کسی روز کسی دکھ پر اکٹھے روئیں

☆ ☆ ☆

حمیدہ بیٹھک کے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ وہی پلنگ جو کبھی برکت حسین کے وجود سے آباد ہوتا تھا۔ جن کی گونج دار آواز پورے گھر میں سنائی دیتی..... آج اسی گھر کے درودیوار میں روح کو چیرنے والی خاموشی سرایت کر گئی تھی۔ وہ جب بھی گھر کے سناٹے سے تنگ آجاتیں تو یہیں آکر گھنٹوں بیٹھی رہتیں۔ ثوبان اور نعمان گھر پر ہی نہ ہوتے۔ ثوبان نئی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ نعمان سنا تھا' اب دکان پر بھی نہیں بیٹھتا۔ کسی کو فکر ہی نہ تھی کہ گھر میں کوئی راشن ہے یا نہیں ہے۔ حمیدہ کس حال میں ہیں۔ ہر کوئی بس منہ چھپائے پھرتا تھا۔

حمیدہ بیٹھک میں آکر گلی والی کھڑکی کھول کر سنسان گلی کو تکتی رہتیں۔ کبھی دماغ کی رو بھٹک سی جاتی۔ یوں لگتا ابھی ابھی وین رکی ہے۔ عریشہ اور مریم کالج سے گھر آگئی ہیں۔ وہ چولہا جلا کر بلاوجہ روٹیاں بنانے لگتیں..... اور انہیں روٹیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بلی کو ڈالتے ہوئے روتی جاتیں۔ کبھی آتے جاتے نمازیوں میں برکت حسین کو کھوجنے لگتیں۔

کبھی یاد آتا' ثوبان اوپر بھوکا بیٹھا ہے..... تو اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ جاتیں..... اور خالی کمرے میں دھاڑیں مار مار کر روتیں۔

کبھی بغیر سوچے سمجھے اسٹور کا نمبر ملا کر سودے گنوانے لگتیں۔ حالانکہ دوسری طرف کوئی بھی فون نہ اٹھاتا تھا۔

اس دن نعمان اور ثوبان اتفاقاً اکٹھے ہی گھر آگئے تھے۔

"خدا کے لیے گھر آجایا کرو۔ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"نوکری ڈھونڈ رہا ہوں اماں! گھر بیٹھ کر کیا کروں؟" ثوبان نے جوتا اتار کر دور پھینکا۔

"اور اسے تم گھر کہتی ہو اماں! وحشت ہوتی ہے اس کی دیواروں سے۔" نعمان نے منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے سختی سے کہا۔

"پھر مجھے بھی کہیں چھوڑ آؤ..... میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں..... یہ اکیلا پن تو مجھے مار ڈالے گا۔"

"اماں! اب یہ ڈرامے بازیاں مت کریں۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے دیں۔" ثوبان نے بے زاری سے کہا۔

"گھر میں کوئی راشن نہیں تھا..... میں کیا پکاتی۔" ثوبان نے نعمان کو دیکھا۔ برسوں سے گھر میں راشن ڈلوانے کی ذمہ داری اسی پر تھی۔

"تو اسٹور پر کیوں نہیں جاتا؟" حمیدہ نے نعمان سے پوچھا۔

"آپ کیوں نہیں جاتیں' محلے میں اپنی سہیلیوں کے پاس؟" نعمان نے تولیہ تار سے کھینچتے ہوئے بے حد طنزیہ لہجے میں کہا۔

حمیدہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

"وہ تو ایک بار کالک مل کر گئی ہے..... لوگ بار بار

ملتے ہیں..... بہانے بہانے سے سوال کرتے ہیں..... میرا تو دل کرتا ہے آگ لگادوں ہر چیز کو۔" وہ بھڑکا۔

"تجھے نوکری نہیں ملی ثوبان؟" حمیدہ نے بات ہی بدل دی۔

"نوکری کوئی حلوائی کی دکان پر پڑے لڈو نہیں ہیں' جو میں جاکر اٹھالوں.....۔" وہ غصے سے بولا۔

"تو کہا کس نے تھا' پہلی نوکری کو لات مارو یا برداشت نہیں ہوا کہ جس کمپنی کا مالک بننے کے خواب دیکھ رہے ہو۔ وہاں ملازم بن کر کام کرو.....۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" ثوبان سے نعمان کا طنز برداشت نہیں ہوا۔ "نہ تم میرے اور عریشہ کے درمیان آتے' نہ یہ سب ہوتا۔ مگر تمہیں تو دکان اور مکان چاہیے تھا۔ لو اب لے لو.....۔"

"میرے منہ نہ لگنا ورنہ منہ توڑ دوں گا۔" دونوں اپنی اپنی فرسٹریشن ایک دوسرے پر نکالنے لگے۔

حمیدہ نے دونوں کو لڑتے دیکھا اور جاکر بیٹھک میں بیٹھ گئیں۔

"پاگلوں کی طرح لڑ رہے ہیں دونوں..... سیاپا تو میرا تھا..... میں نعمان کی شادی اس استانی سے کرادیتی تو یہ سب نہ ہوتا۔"

☼ ☼ ☼

"تم واپس اسکول جوائن کرلو۔" نبیلہ نے مریم کو مشورہ دیا۔

"میں..... میں وہاں کیسے جاسکتی ہوں۔" مریم ڈر گئی۔ محلے میں موجود ساتھی ٹیچرز کی بدولت یہ قصہ بہت دور تک پھیل گیا تھا۔

"اب لوگوں کو فیس تو کرنا ہی پڑے گا..... یوں بیٹھ کر زندگی تو نہیں گزرے گی..... ایک بار اچھی خاصی ٹھوکر لگ گئی ہے۔ امید ہے عقل آہی گئی ہوگی۔" نہ چاہتے ہوئے ان کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

مریم سر جھکا کر لب چبانے لگی۔

"محسن سے کہتی ہوں..... کسی اور اسکول میں تمہارے تبادلے کی کوشش کرے۔ جب تک کسی ڈھنگ کی جگہ رشتہ نہیں ہو جاتا..... مصروفیت تو ڈھونڈنی ہوگی۔"

مریم نے چونک کر سر اٹھایا..... کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نبیلہ بول اٹھیں۔

"اب یہ مت کہنا کہ تمہیں شادی نہیں کرنی۔ کیونکہ میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا..... بتایا ہے۔"

مریم نے دوبارہ سے سر جھکالیا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔" ابرار کی زوردار آواز پر ناشتے کی میز پر بیٹھے افراد چونک گئے۔

"گویا' میں بہت وقت پر آیا ہوں۔ ابھی ناشتا شروع ہوا ہے۔" گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس گھر میں ابرار کی بے تکلفی خاصی بڑھ گئی تھی۔ ایگزامز کے بعد وہ فارغ تھا اور ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھا رہا تھا۔

"خالہ! آپ کو پوتے کی بہت بہت مبارک ہو....." اس نے خوش دلی سے کہا۔ نبیلہ مسکرادیں۔

"تمہیں بھی..... آخر! تم ہی تو اس کے چاچو ہو۔"

رات ہی فاطمہ کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ مریم اور حمیدہ ہسپتال میں اس کے پاس تھیں۔ نبیلہ اور عریشہ کو ناشتا لے کر جانا تھا۔

"ہسپتال کون کون جائے گا؟ محسن بھائی نے گاڑی دے کر بھیجا ہے۔" وہ عریشہ پر اک سرسری نگاہ ڈال کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عریشہ نے پوری توجہ انڈے کی طرف مبذول کرلی۔

"سب ہی چلیں گے' پہلے تم ناشتا کرلو۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ..... اور عریشہ بی بی! اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں۔" عریشہ نے آہستگی سے کہا۔

"جلدی سوچیں! وقت تو ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل جاتا ہے۔" وہ توس پر مکھن لگانے لگا۔

"میں لیکچرر شپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" عریشہ نے تذبذب سے کہا۔

"فائن! تب اتنا نہ سوچیں' عمل کرلیں۔ میری مدد کی ضرورت ہوئی تو حاضر ہوں۔"

"تم کیا نیکی کے فرشتے ہو؟" عریشہ ہنسی۔

"تمہاری ہنسی اتنی بری تو نہیں' پھر مسکرانے میں اتنا تکلف کیوں کرتی ہو۔" ابرار کے اچانک کہنے پر عریشہ نے سٹپٹا کر نبیلہ کو دیکھا۔ وہ انہماک سے چائے پینے لگیں۔

"میں سامان پیک کرلوں۔" عریشہ اٹھ گئی۔

"یہ کیا بے ہودگی تھی؟" عریشہ کے جانے کے بعد نبیلہ نے گھورا۔

"میں نے تو صرف تعریف کی تھی۔" ابرار نے معصومیت سے کہا۔

"پرائی لڑکیوں کی تعریف کرتے شرم نہیں آتی؟" انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"مجھے تو وہ کبھی بھی پرائی نہیں لگی۔" ابرار کا لہجہ مدھم ہوگیا۔

نبیلہ نے اسے غور سے دیکھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا سلائس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"خالہ! آپ سے کیا پردہ؟ شروع ہی سے ہر بات آپ سے شیئر کرتا آرہا ہوں..... جب بھی لائف پارٹنر کے بارے میں سوچا' ایک اسی کا خیال آتا تھا۔" وہ سادہ مزاج تھا۔ سادگی سے اظہار کرگیا۔

عریشہ کچن کے دروازے میں ہی رک گئی۔

"سب کچھ جانتے بوجھتے.....؟" نبیلہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ اتنی اہم باتیں نہیں ہیں کہ میں انہیں یاد رکھوں۔" ابرار نے لاپروائی سے کہہ کر سلائس اٹھا لیا۔

"اور اگر عریشہ کو اعتراض ہوا؟"

"اسے پورا حق حاصل ہے..... آپ سے اس لیے شیئر کر رہا ہوں کہ زندگی میں جب بھی اس کے بارے میں کچھ سوچیں' مجھے ضرور ذہن میں رکھیں..... کیونکہ میرا کام کوشش کرنا ہے۔ باقی میں نصیب پر چھوڑ دیا کرتا ہوں۔"

"اسی لیے اتنے مطمئن اور پرسکون رہتے ہو۔"

"جی! اور ذرا دیکھ لیں' محترمہ کچن میں جاکر سو تو نہیں گئیں۔ وہاں ناشتے کے لیے لوگ بے تاب بیٹھے ہوں گے۔"

"دیکھتی ہوں۔" نبیلہ کہہ کر اٹھ گئیں۔ عریشہ مڑ کر سامان بیگ میں رکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

مریم کو شک سا تھا کہ وہ اسکول میں تبادلہ ہوکر آنے والی سینئر ٹیچر کو جانتی ہے۔ جانتی نہیں تو کم از کم دیکھا ضرور ہے۔ تب ہی بریک ٹائم میں ان کے پاس جا بیٹھی

"جب سے آپ سے ملی ہوں' اسی الجھن میں ہوں کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے؟"

"ہم لوگ پہلے اسی شہر میں رہتے تھے' اس لیے آتے جاتے ملاقات ہوگئی ہوگی۔ ابا ہیڈ ماسٹر تھے..... ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد آبائی شہر چلے گئے تھے۔"

"تو واپسی کیسے ہوئی؟"

"ابا کی وفات کے بعد رشتے داروں کی آنکھیں ہی بدل گئیں تو سوچا اگر تنہا اور کرائے کے گھر میں ہی رہنا ہے تو اس شہر میں کیوں نہیں۔ جہاں ساری زندگی گزری ہے۔" اس کی آنکھیں اداس اور مسکراہٹ خوب صورت تھی۔

"شادی نہیں کی؟" مریم جب سے اس اسکول میں آئی تھی' اس نے کسی سے بھی دوستی نہیں کی تھی' مگر اس لڑکی میں ایسی کشش تھی کہ وہ بے اختیار کھنچتی چلی گئی۔

"چھوڑو یار..... اس ملک میں اچھے رشتوں کا خاصا کال ہے۔" اس نے ہنس کر بات ٹال دی۔

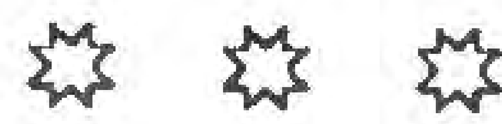
"آپ کا نام کیا ہے؟"

"عائشہ....."

"میں مریم ہوں۔"

عائشہ بھی تنہا تھی اور مریم بھی..... دونوں میں چپکے سے اس دوستی کا آغاز ہوگیا' جس نے آگے چل کر

زندگی کی بہت سی گرہیں سلجھاتی تھیں۔



"کب آئے گا؟" ماسٹر الیاس کی بیٹھک کی پرانی سی دری پر بیٹھی، پرانے ٹی وی پر نظریں جمائے آنکھیں پتھرانے لگی تھیں۔ جمیلہ نے بے تابی سے پہلو بدلا۔

"بس آنے والا ہے۔" ماسٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔

"فخر پاکستان میں آج ہم آپ کی ملاقات کرواتے ہیں..... C.A کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے اور یونیورسٹی کا بیس سالہ ریکارڈ توڑنے والے نوجوان ابرار علی سے..... جن کا تعلق پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے مگر انہوں نے ہمت اور حوصلے سے نامساعد حالات کو نہ صرف اپنے حق میں ہموار کیا بلکہ....." کمپیئر نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

جمیلہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔

ابرار علی اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"اس دیلے آوارہ کو کوئی کم ہے، جو گھر واپسی کی جلدی ہو۔ صبح صبح دیر اٹھے ڈکار کے بستہ لٹکا کر چلتا بنتا ہے..... تو تو شہر بھیج کے بے فکر ہو جاتی ہے کہ پتر کالج جارہا ہے، اب وہاں نہ جانے کیا کیا گل کھلا رہا ہو گا۔"

ابرار علی کمپیئر سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

"اتنا مان بھی اچھا نہیں جمیلہ! جب کوئی دھیلا کما کے تیرے ہاتھ پر رکھے گا، تب اچھلنا..... ابھی تو کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔"

ابرار علی کرسی پر بیٹھ رہا ہے۔

"چل! اب دیکھ لیں گے..... چاچے کے بغیر کون سا تیر مارے گا۔ چار دن میں دھکے کھا کر واپس نہ آیا تو میرا نام بھی کبری نہیں۔"

"ایسے ہی نوجوان ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں فخر ہیں۔" کمپیئر کہہ رہا تھا۔

جمیلہ دھواں دھار رونے لگی۔

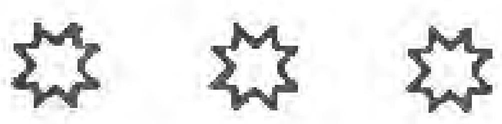
اس کے بیٹے کی مشکلوں کا سفر تمام ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی منزل پالی تھی۔

"میں اس سب کا کریڈٹ اپنی ماں کو دیتا ہوں جس کی ہمت اور دعاؤں نے راستے میں چراغ جلائے رکھے۔" ابرار علی کہہ رہا تھا۔

"بلو..... میرا بلو....." وہ ہنس رہی تھی، رو رہی تھی۔ ماسٹرنی نے اسے ساتھ لگا لیا۔

"اب تو آنسو پونچھ لے جمیلہ۔ اب تو تیرے اچھے دن آئے ہیں۔" ماسٹر الیاس نے صافے سے آنکھیں صاف کیں۔



"آئی ایم پراؤڈ آف یو....." محسن نے ابرار کو بھینچ لیا۔ ابرار کی آنکھیں نم اور سرخ تھیں۔ کل اسے جوائن کرنا تھا.....

اور اس نے پوری رات ایک پل کے لیے بھی سجدے سے سر نہیں اٹھایا تھا..... یہ سجدۂ شکر اس پر واجب تھا۔ جس نے مشکلیں دی تھیں..... اسی نے ہمت اور حوصلہ بھی دیا تھا۔ ان مشکلوں سے نکلنے کا رستہ بھی سجھایا تھا۔

"یہ سب آپ لوگوں کے تعاون سے ہوا ہے محسن بھائی!" اس نے خلوص دل سے کہا۔

"نہیں! یہ تمہاری اپنی کاوش ہے ابرار۔"

"اب ماں کو بھی لے آؤ بیٹا۔" نبیلہ نے کہا۔

"جی! اس ویک اینڈ پر جارہا ہوں۔"

"گھر کا ارینج ہو گیا؟" محسن نے پوچھا۔

"جی! ہو گیا....."

"لیکن پہلے تم جمیلہ کو لے کر یہاں آؤ گے۔" نبیلہ نے پابندی لگائی۔

"انہیں یہاں تو لانا ہی ہے۔ کیونکہ اصل بات تو وہی کریں گی۔" نبیلہ مسکرادیں۔ محسن نے الجھ کر اماں کو دیکھا۔

"اچھا خالہ! محسن بھائی! اب میں چلتا ہوں، بہت کام رہتے ہیں۔" ابرار خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

"یہ کیا کہہ رہا تھا۔ کون سی اصل بات؟"

"عریشہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"واقعی؟ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

"ابرار جیسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں محسن! ان کی نگاہیں تو آسمان چھوتی ہیں۔ مگر قدم مضبوطی کے ساتھ زمین پر جمے رہتے ہیں۔ انکساری ان کا وصف اور حوصلے ان کا امتیازی نشان ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہیں۔ میں نے اسے ہر کامیابی کے بعد پہلے سے زیادہ جھکتے دیکھا ہے۔"

"پھل دار درخت ہمیشہ زمین کی طرف جھکتا ہے۔ شاید خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے۔" نبیلہ نے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اس کی بہت بری حالت ہے کبراں.... دیکھ کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس کی حالت نہیں ہے گھر پر کیس کروانے والی۔ آپریشن ہوگا۔ شہر لے جانا پڑے گا۔" گاؤں کی دائی بیٹھی کہہ رہی تھی۔ اصغر اور کبریٰ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"دو دن سے بڑی تکلیف میں ہے.... کسی بھینس کی طرح ڈکراتی ہے.... جیسے جان نکل رہی ہو۔"

کبریٰ نے تڑپ کر اصغر کو دیکھا۔

"تو کیوں چپ کر کے بیٹھا ہے۔ جا! اسے لے کے آ.... ہائے! میری اکو اک دھی.... کن ظالموں کے پلّے پڑ گئی۔" وہ سینہ کوٹنے لگی۔ "وہ مر جائے گی۔"

حوصلہ رکھ کبراں...." جمیلہ نے تسلی دینا چاہی۔

"کیسے حوصلہ کروں؟ میری دھی مر رہی ہے جمیلہ۔"

"بھا اصغر! ایسے کیوں بیٹھا ہے؟ جا کر بات تو کر.... ان کے پاس کوئی روپے پیسے کی کمی ہے۔ شہر کیوں نہیں لے جا رہے.... نہیں لے جا سکتے ناں! ہم لے جاتے ہیں۔"

"میں گئی ناں، مجھے میری بشریٰ سے نہیں ملنے دیا چوہدرائن نے.... کچھ کر لے اصغر.... نئیں تے بٹھا رونا پیے گا۔"

"دیکھتا ہوں۔" اصغر صافہ اٹھا کر تھکے تھکے انداز میں اٹھ گیا۔

"وہ ڈھاڈے لوگ ہیں پر دھی تاں ہماری ہے نا۔"

"اللہ بہتر کرے گا.... کبراں! حوصلہ پھڑ۔" جمیلہ نے سب کچھ بھلا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

"اوئے اصغر! میری گل سن لے کن کھول کے۔" چوہدری یاسین نے بڑے کرّوفر سے حقے کی کش لگاتے ہوئے کہا۔ اصغر اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"بیٹیاں اس طرح نہیں بستیں.... دوسرے تیسرے دن کبھی تو آجاتا ہے، کبھی تیری زنانی۔"

"چوہدری صاحب! اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے میرے ساتھ بھیج دو.... میں شہر کے ہسپتال لے جاؤں گا۔"

"ناں! تجھے یہ زنانیوں والی باتیں کون بتاتا ہے۔ شرم کر شرم.... پہلے ہماری زنانیاں شہر جا کے بچے جنتی رہی ہیں؟ ایک تو پہلے ای اپنی دھی کو کوئی عقل مت نہیں دی۔ اوپر سے یہ نخرے...." وہ گرجے۔

"چوہدری یاسین! رحم کر.... رحم۔" اصغر نے بہت مجبور ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"چل ٹھیک ہے! جا لے جا فر.... پر واپس نہ چھڈن آئیں۔"

"ابا جی...." بشریٰ کا شوہر اندر سے خود بھی شہر لے جانے کا حامی تھا۔ مگر کہنے کی ہمت نہ تھی۔

"ارے! چپ کر اوئے.... ہاں بھئی! دس فر.... ٹھیک ہے! ہمارے پتر کو رشتوں کی کمی نہیں ہے.... ادھر وہ جائے گی، ادھر میں دوجا ویاہ کر دوں گا۔"

چوہدری یاسین نے اصغر کی بولتی ہی بند کر دی تھی

☼ ☼ ☼

اصغر کو اندر آتا دیکھ کر کبریٰ لپک کر قریب آئی۔ جمیلہ نے اصغر کے عقب میں دیکھا۔

"لے آیا بشریٰ کو.... کہاں ہے؟" اصغر نے صافہ اتار کر چارپائی پر پھینکا۔ "نہیں آنے دیا چوہدریوں نے۔ وہ کہتے ہیں بچے پکے ای لے جاؤ.... پتر کا دوجا ویاہ

کردیں گے۔" وہ خود ہی ڈھے گیا۔

"ہائے! میں مر گئی.... اے کس طراں ہو سکدا اے۔" کبریٰ نے دہل کر کلیجے پر ہاتھ رکھا۔

"چھوڑ آیا میں...."

"چھوڑ آیا....؟ کیوں چھوڑ آیا....؟ تو لڑ بھڑ کے اسے لے آتا۔"

"کیسے لے آتا؟ میں کلا (اکیلا)، وہ اتنے سارے.... کیسے لے آتا میں۔" اصغر سر پر ہاتھ رکھ کے رونے لگا۔ "طلاقن کہلانے سے بہتر ہے، وہ مر جائے۔"

"اللہ نہ کرے...."

"نہیں پتا ہے، میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے.... میں کلا تھا، میں کلا ہوں.... ہائے ربا!.... مجھے بھی پتر دیا ہوتا.... اج میری بانہہ پھڑ کے کھڑا ہوتا تو ان کی جرات تھی۔ پر میرا تو کوئی وی نہیں.... میں تے کلا رکھ (اکیلا درخت) وا۔"

"کس نے کہا کہ تیرا کوئی نہیں ہے؟" جمیلہ نے بجلی کی طرح آنکھوں سے پلو ہٹایا۔

"بلو۔" اصغر نے برستے آنسوؤں میں بھتیجے کو دیکھا، جس کی شان اور اٹھان ہی اور تھی۔ اس کے عقب میں کھلے دروازے سے سفید گاڑی جھانک رہی تھی۔

"میں ہوں نا تیرا.... بھتیجا بھی، بیٹا بھی، بازو بھی۔"

اصغر نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا گیا۔ ابرار نے اسے مضبوط بازوؤں میں سنبھال لیا۔

کبریٰ اپنا رونا بھول گئی تھی۔

"آؤ! بشریٰ کو لے کر آتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں، وہ لوگ کیسے نہیں آنے دیتے۔"

کبریٰ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ چاچا، چاچی کو چپ کراتے ہوئے اس نے ماں کو دیکھا۔

وہ آنسوؤں میں مسکرا رہی تھی۔ جمیلہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گویا بیٹے کی اعلا ظرفی کی داد دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بلو! اب میں اس گھر میں رہوں گی؟" جمیلہ نے حیرت و اشتیاق سے گھر کی ایک ایک چیز کو دیکھا۔ حالانکہ ابھی وہاں بہت ہی تھوڑا سامان تھا۔

"ہاں...." وہ آسودگی سے مسکرایا۔

"دیکھ تو! کیسے چکنے چکنے فرش ہیں۔ میں نے تو یہاں سے ضرور ہی گر جانا ہے۔"

"نہیں گرتیں میں ہوں نا۔" ابرار ہنسا۔

"ہاں! تو تو جیسے سارا دن میرے گوڈے سے لگ کر بیٹھا رہے گا۔" جمیلہ نے ناراضی سے دیکھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے آیا۔

"ہائے ربا! یہ باورچی خانہ ہے۔" جمیلہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ "کانچ کے برتن، گیس کے چولہے، نہ پتر نہ، یہ سارا کج میرے بس کی گل نہیں ہے۔"

"حد ہو گئی اماں! تمہاری خاطر تو سارا کچھ کر رہا ہوں،"

"وے پاگلا! تیری ماں نے ساری حیاتی مٹی لیپ کے چولہا جلایا ہے۔ وہ کیا جانے ان گیس کے چولہوں کو۔"

"اس کا مطلب ہے، سب بے کار گیا۔" ابرار نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"بے کار کیوں؟ کسی اچھی سی شہری لڑکی سے شادی کر لے۔ سب کج کام میں آجائے گا۔"

"اور اگر اس لڑکی نے کہا کہ میری ساس پینڈو ہے۔ مٹی لیپ کر چولہا جلانے والی.... مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا تو پھر؟" ابرار نے چھیڑا۔

ایک لمحے کو جمیلہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر وہ جلال میں آئی۔

"گُت سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دوں گی۔"

"لیکن ایک مسئلہ ہے نا۔ شہر کی لڑکیوں کی گُت نہیں ہوتی۔" دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ جمیلہ نے پیار اور آسودگی سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"تو نے اچھا کیا جو اپنے چاچا، چاچی کو معاف کر دیا۔"

"اماں! میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا۔ بلکہ میں تو ان کا احسان مند ہوں.... وہ مجھے اس طرح نہ

دھتکارتے..... گھر سے نہ نکالتے تو شاید میں اس مقام تک کبھی نہ پہنچتا۔"

اس دن وہ لوگ بشریٰ کو لے کر فوراً" شہر پہنچے تھے۔ اور بڑی مشکلوں سے بشریٰ اور اس کے بچے کی جان بچی تھی۔ ابرار نے چوہدری صاحب سے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ پولیس کیس ہے..... لیکن کیونکہ اس کی رشتے داری بھی ہے اور بشریٰ کی جان بھی بچ گئی سو وہ یہ قدم نہیں اٹھا رہا..... کیونکہ یہ تو ابرار بھی جانتا تھا کہ ان زمین داروں کے لیے مقدمے بازی کسی کھیل سے زیادہ نہیں ہوتی ..... مگر ابرار کی بات چیت اور پوتے کی خوشی نے انہیں خاصا نرم کر دیا تھا۔

اصغر اور کبریٰ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہے تھے مگر ابرار نے اپنے کسی رویے سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کے اندر کوئی گلہ شکوہ بھی ہے۔ اصغر کو بے تحاشا شرمندگی کے ساتھ ساتھ بے پناہ تقویت کا احساس ہوا تھا۔

"آپ یہاں بیٹھیں' میں چائے بناتا ہوں۔" ابرار نے جمیلہ کو کرسی پر بٹھایا۔

"حق ہا..... اب میں فیر کرسی پر بیٹھ کر چائے پیوں گی۔" جمیلہ کو خود ہی شرم آگئی۔

ابرار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"عائشہ! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟" اسٹاف روم میں صرف وہ دونوں تھیں' جب مریم نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔ عائشہ نے چونک کر کاپی سے نظریں اٹھائیں۔

"بتائیں نا عائشہ!" مریم کے لہجے میں اداسی تھی۔

"محبت تو نہیں کہہ سکتی۔ ہاں! محبت کے احساس کو ضرور چھوا تھا۔"

"پھر.....؟"

"پھر کیا؟ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے گھر والے غالباً" راضی نہیں تھے..... ایک دن امی ان کے گھر تعزیت کے لیے گئیں اور....." وہ دھیرے دھیرے سب کچھ بتاتی گئی اور مریم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"آپ کس جگہ رہتی تھیں؟" مریم نے سنبھل کر پوچھا۔

عائشہ نے جگہ بتائی اور مریم کو یاد آگیا' اس نے عائشہ کو کہاں دیکھا تھا..... وہ محلے میں نکلنے کی عادی نہ تھی اور عائشہ بھی اسکول اور گھر کے علاوہ کہیں نہیں جاتی تھی۔ مگر ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے کہیں نہ کہیں دیکھا تو تھا۔

"اور تم...؟" عائشہ نے اپنی بات مکمل کر کے پوچھا

"میں نے تو محبت بھی کی اور دھوکا بھی کھالیا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"کون تھا وہ؟"

"مجھے چھوڑیں! تو آپ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ آپ کی امی نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔" مریم نے ٹالا۔

"ہاں! عزت بچانے کا یہی طریقہ تھا۔"

"اور آپ نے محبت کی قربانی دے دی؟"

"ظاہر ہے! محبت عزت سے بڑھ کر تو نہیں ہوتی۔" عائشہ نے رسان سے کہا تو مریم نظریں چرا گئی۔

"نجانے وہ کون لڑکیاں ہوتی ہیں..... جو اپنی محبت کی خاطر گھر والوں کو زندہ درگور کر دیتی ہیں۔" مریم کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"محبت پر بس کہاں چلتا ہے۔"

"محبت پر نہیں' لیکن بڑھتے قدموں پر تو بس ہونا چاہیے۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ یا تو انسان اپنی محبت کی خاطر لڑے۔ اگر لڑ نہیں سکتا تو ہتھیار ڈال دے۔ نعمان مجھ سے محبت کرتا تھا۔ میرے لیے بہت آسان تھا' اس کی محبت کو بغاوت بنا دیتی۔ لیکن میری نظروں کے سامنے میرے بوڑھے ماں باپ کے چہرے تھے۔ زمانے کے طعنے تو ایک طرف..... وہ تو میری طرف اٹھی انگلی دیکھ کر ہی مر جاتے..... سو میں نے پہلے ہی مرحلے پر ہتھیار ڈال دیے۔"

عائشہ کو اندازہ ہی نہ تھا کہ اس کے منہ سے نکلے لفظ مریم کی روح پر کوڑے برسا رہے ہیں اور وہ لب بھینچے اپنے اندر اٹھتی چیخوں کو روکنے کی سعی کر رہی تھی۔ تب ہی بات کرتے کرتے عائشہ کی نگاہ اس پر پڑی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" مریم کھڑی ہو گئی۔ "آپ جانتی ہیں میں کون ہوں؟"

عائشہ نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"میں نعمان کی بہن ہوں۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔

عائشہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ابرار گیٹ سے اندر آیا۔ لان میں بیٹھی عریشہ کو دیکھ کر اسی طرف آگیا۔ وہ فرصت سے بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" ابرار کی آواز پر اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔

"وعلیکم السلام۔"

"کیا ہو رہا ہے؟"

"غالباً" اسے اخبار کہتے ہیں۔"

"یقیناً"....." وہ سامنے بیٹھ گیا۔ عریشہ کچھ گھبرا سی گئی۔ وہ فوراً" اٹھنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ عریشہ! مجھے تم سے بات کرنی ہے؟" ابرار نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیسی بات؟" وہ ٹھٹکی۔

"کچھ خاص نہیں بس میں چاہتا تھا کہ امی کو لانے سے پہلے تم سے بات کر لوں۔ دراصل میری امی بہت سیدھی سادی ہیں اور مجھے تو وہ شہزادہ سمجھتی ہیں۔ تو انہیں بہت دکھ ہو گا اگر تم نے ان کے سامنے مجھے ریجیکٹ کر دیا۔ سو میں نے سوچا پہلے خود ہی کنفرم کر لوں کہ....." اس نے ذرا رک کر کان کھجایا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

عریشہ بھونچکی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابرار اسے یوں براہ راست پروپوز کرے گا۔

"مجھے اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟" وہ بہت دیر تک کچھ نہ بولی تو ابرار کو کہنا پڑا۔

"تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔" عریشہ نے نظریں چرائیں۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" ابرار نے کندھے اچکائے۔

"میرا ماضی اتنا بھی شفاف نہیں کہ یوں کندھے اچکا کر نظر انداز کر دیا جائے۔" عریشہ کو غصہ آگیا۔

"تو کس طرح کرنا چاہیے؟" ابرار نے سادگی سے پوچھا۔

"تم کس مٹی کے بنے ہو؟" عریشہ جھنجلائی۔

"میری نظر سامنے دیکھتی ہے..... پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھنا مجھے وقت کا زیاں لگتا ہے..... آپ سے غلطیاں ہو گئیں۔ آپ نے ان سے سبق بھی سیکھ لیا..... آپ نے ٹھوکر کھائی..... آپ سنبھل بھی گئے..... دیٹس اٹ..... اب ان غلطیوں کو لے کر روتے ہی رہیں؟"

"وہ غلطیاں نہیں گناہ تھے۔" عریشہ کی نگاہ جم گئی۔

"یہ خدا کا معاملہ ہے۔ میں نہیں جانتا۔" اس نے آرام سے ہاتھ جھاڑے۔ عرشیہ نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

ابرار نے اسے غور سے دیکھا اور اپنے مخصوص دھیمے انداز میں مسکراتے ہوئے ذرا آگے ہوا۔

"ایک دن میں بیمار تھا..... اک مہربان پری نے چائے بنا کر دی تھی اور دوا بھی..... میں نے بہت دل سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! اس مہربان پری کو سیدھا رستہ دکھانا۔ اس کے ساتھ وہی کرنا جو اس کے لیے بہتر ہو..... میں نے ثوبان کے اندر رتی بھر بھی اخلاص نہیں پایا تھا۔ وہ اپنی غرض کا بندہ تھا..... مجھے نہیں پتا' میرا دل تمہارے لیے کیوں دکھتا تھا۔ اپنی ٹف ترین روٹین میں تمہارے لیے کیوں سوچتا تھا..... مجھے نہیں پتا میں ہر نماز میں تمہارے لیے دعا کیوں کرتا تھا۔"

اس کے لہجے کا جذب' سادگی اور گہرائی.....

عرشیہ کی آنکھوں میں آنسو آئے۔
کیا خدا نے اس کی توبہ قبول کرلی تھی۔
یا ماں کی دعائیں اب بھی اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔
"مجھے تمہارے جواب کی جلدی نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو' سمجھ لو۔ بہتر ہے کسی سیانے سے مشورہ بھی کرلو۔" ابرار کے لہجے میں ہلکی سی شرارت جھلکی۔ "لیکن پلیز! یہ فیصلہ ماضی کو سامنے رکھ کر نہیں' اپنے حال اور مستقبل کو سامنے رکھ کر کرو۔۔۔ میں جواب لینے پھر آجاؤں گا۔" وہ کھڑا ہوا۔
"ابرار! تمہیں تو کوئی بھی اچھی لڑکی مل جائے گی۔"

"پھر تمہیں اچھا لڑکا کہاں سے ملے گا۔" ابرار نے بے چارگی سے کہا۔ عرشیہ جز بز ہو کر لب چبانے لگی۔ وہ کرسی پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔
"میں نے اچھی لڑکی ڈھونڈ کر ہی اس کے سامنے یہ پروپوزل رکھا ہے۔۔۔ اللہ حافظ۔" عرشیہ نے آنسوؤں کی دھند میں اسے گیٹ سے نکلتے دیکھا۔
اور ٹیرس پر کھڑی نبیلہ کے لبوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ کو دیکھ کر حمیدہ کھل سی گئیں۔
"شکر ہے فاطمہ! تو نے چکر تو لگایا۔۔۔ پہلے تو بانو ہر ہفتے آجاتی تھی۔ اب تو وہ بھی نہیں آتی۔ سارا دن ان دیواروں کو گھور گھور کر تنگ آجاتی ہوں۔ لڑکے ہیں تو وہ بھی گھر میں نہیں ٹکتے۔ چھوٹے ہی کو لے آتیں۔"
وہ ترسے ہوئے لہجے میں بولیں۔
"مریم اور عرشیہ کے پاس تھا۔۔۔ میں ڈرائیور کے ساتھ بازار تک گئی تھی تو ادھر آگئی۔" فاطمہ نے پھلوں کا تھیلا ان کے قریب رکھا۔
"اللہ تیرا بھلا کرے۔۔۔ کتنے دن ہو گئے پھل کی شکل بھی نہیں دیکھی۔۔۔" حمیدہ تیزی سے سیب نکال کر کھانے لگیں۔

"اماں لاؤ دھو دوں۔"
"بڑی بھوک لگی تھی۔"
"آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا؟"
"خود تو باہر سے کھا پی آتے ہیں۔۔۔ اور گھر میں کھانے لینے کو کوئی چیز نہیں۔"
فاطمہ تھیلا اٹھا کر کچن میں رکھنے گئی تو دل دکھ سے بھر گیا۔ گندے سندے کچن میں واقعی کچھ نہ تھا۔ فریج بھی خالی۔۔۔ وہ تھیلا اندر رکھ کر خاموش سی حمیدہ کے پاس بیٹھ گئی۔
"تھک جاتی ہوں اکیلے رہتے رہتے۔
آپ نے فرید کو بھی ماموں کے پاس بھجوا دیا۔ وہ ہوتا تو۔۔۔"
"کیا کرتی؟ اسکول سے آتا تھا تو سارا دن گھر میں الٹی سیدھی باتیں سنتا تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا اس لیے بھجوا دیا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں' مریم کو ہی لے آوں۔"
"مریم کو وہیں رہنے دیں۔ پھپھو نے ایک رشتہ دیکھا ہے اس کے لیے۔۔۔ لڑکے والے پسند کر گئے ہیں۔ اب لڑکے کو دیکھنے جانا ہے۔۔۔ دعا کریں' یہ رشتہ ہو جائے۔ مریم یہاں آئی تو کوئی نہ کوئی بات لڑکے والوں کے کانوں میں پڑ جائے گی۔"
"مریم مان گئی ہے؟"
"اب بھی نہ مانتی۔۔۔" فاطمہ نے تلخی سے کہا۔
"کمینی کیسی کھے ڈالی تھی سر میں۔۔۔ باپ کو بھی مار ڈالا۔"
"اپنا کیا ہی آگے آتا ہے اماں!" فاطمہ نے آہستگی سے کہا۔ حمیدہ نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔
"ہاں! اب بیٹھ کر میرا قصور ہی نکال۔"
"مریم کا دماغ اسی گھر سے خراب ہوا تھا اماں! آپ نے عرشیہ کو کبھی کسی بات کے لیے نہیں روکا ٹوکا تھا۔ بھلے ان دونوں کی شادی ہونا تھی۔۔۔ پھر بھی کچھ حدود تو ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے مرمٹنے' ہر چیز لٹانے اور محبتوں میں قربانی دینے کے سبق مریم نے پہلے سے پڑھے تھے اور یہ بھی کہ اپنی محبت کی خاطر

رشتوں کو دھوکا دینا کتنا آسان ہے۔۔۔۔ یاد ہے؟ آپ نے عریشہ کو کیسے استعمال کیا تھا؟"

"بس کر جا فاطمہ!" حمیدہ کی آواز بے بسی سے گھٹ کر رہ گئی۔

"اور مریم کو چھوڑیں۔ آپ نے نعمان کے ساتھ کیا کیا؟" فاطمہ کا لہجہ لاشعوری طور پر تیز ہو گیا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" انہوں نے نظریں چرائیں

"کیا ہرج تھا اگر اس کی شادی ماسٹر صاحب کی بیٹی عائشہ سے ہو جاتی؟"

"میں نے تو تم لوگوں کی خاطر کیا۔۔۔ بھائیوں کی شادی ہو جائے تو بہنوں کو پوچھتے تک نہیں۔" حمیدہ نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"اس کا مطلب تھا کہ آپ بیٹیوں کی خاطر بیٹے کے دل کی خوشی چھین لیں؟ اماں! ہر کسی کو اس کے نصیب کا ملنا ہوتا ہے۔ میں بھی حیران تھی کہ ٹھیک ہے' نعمان بھائی شروع ہی سے غصے والے تھے۔ مگر اتنے بے حس تو نہیں تھے۔۔۔۔ ہر کسی کا خیال رکھتے تھے۔ پھر ایک دم سے اتنے بدل کیسے گئے۔ اب سمجھ میں آتا ہے' وہ یہ سب انتقاما" کر رہے تھے۔ کیونکہ معاف کرنے کا ظرف تو ہم میں سے کسی میں بھی نہیں ہے۔" وہ بس بولتی چلی گئی۔ جیسے یہاں صرف اپنی بھڑاس نکالنے آئی ہو۔

"تجھے یہ سب کس نے بتایا؟"

"عائشہ' مریم کے ساتھ پڑھاتی ہے اور اہم بات یہ کہ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔"

"اچھا۔" حمیدہ چپ سی ہو گئیں۔

"اماں!" فاطمہ نے ان کا ہاتھ تھاما۔ "نعمان بھائی کو ان کے دل کی خوشی دے دیں۔ ورنہ اس گھر کی دیواروں سے یہ خاموشی اور وحشت ساری زندگی لپٹی رہے گی۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ اب آپ بھی بدل جائیں۔ یہ گھر گھر نہیں لگتا' اک ویران سرائے بن کے رہ گیا ہے۔ میکہ کیسا بھی ہو' لڑکی کا مان ہوتا ہے۔۔۔۔ وہ اپنی سسرال میں بھی بے چین رہتی ہے' اگر اس کے میکے والے تکلیف میں ہوں۔ اماں! کوشش کر کے جو بچ گیا ہے اسے سنبھال لیں' ورنہ سب کچھ برباد ہو جائے گا۔"

فاطمہ روتے ہوئے اٹھ گئی۔ حمیدہ اندھیرا ہونے تک وہیں گم صم سی بیٹھی رہ گئیں۔

٭ ٭ ٭

گھر بھی اچھا تھا اور گھر والے بھی خاصے سلجھے ہوئے تھے۔ لڑکے کی دونوں بہنیں بہت ہنس مکھ اور بے تکلف سی تھیں۔ عریشہ کے ساتھ فورا" ہی گھل مل گئیں۔

"یا اللہ! یہاں مریم کی بات بن جائے۔" عریشہ نے دل ہی دل میں دعا کی۔

"برخوردار گھر پر نہیں ہیں۔" چائے کے لوازمات سجائے جانے لگے تو نبیلہ نے پوچھا۔

"وہ گھر پر ہی ہے۔ جاؤ فضہ! بلا کر لاؤ۔" ماں نے کہا تو لڑکی فورا" اٹھ گئی۔ دوسری بہن سب کو چائے پیش کرنے لگی۔

جس وقت اس نے عریشہ کو کپ تھمایا عین اسی وقت لڑکے نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا۔ عریشہ کے ہاتھ سے کپ چھوٹ گیا۔ چائے نے اسے کہاں کہاں جلایا۔ اسے خبر نہ تھی۔ سب لوگ بوکھلا کر اس کی طرف لپکے۔

اور عریشہ ٹکٹکی باندھے فہد کو اور وہ عریشہ کو دیکھ رہا تھا۔

"فہد! تم۔"

"عریشہ۔۔۔"

سب ٹھٹک کر دونوں کو دیکھنے لگے۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ جس مریم کو گھر والے۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔" عریشہ کے ہاتھ سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ جہاں چائے گری تھی۔

"تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" فہد کے والد نے سنبھل کر پوچھا۔

"جی انکل یہ میرے کالج فیلو رہے ہیں۔ ہم نے بی اے اکٹھے کیا تھا۔" عریشہ بیٹھ گئی۔

"اچھا۔۔۔۔ اچھا۔" انہوں نے گھبرا کر بیگم کو دیکھا۔ زیادہ پرانا قصہ نہ تھا' جب فہد اپنے کالج کی لڑکی کے پیچھے پاگل ہو رہا تھا۔ بلکہ اب تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔ آج بھی بڑی منتوں کے بعد مہمانوں کے سامنے آنے پر آمادہ ہوا تھا۔

"ابو! جس مریم کو آپ میرے لیے پسند کر کے آئے ہیں۔" فہد باپ کی طرف مڑا۔ "وہی لڑکی ہے جس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا۔"

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

نعمان نے اسٹور سے سارا سودا بھجوایا تھا۔

"وہ آج اسٹور پر بیٹھا ہے؟" حمیدہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"جی! بہت دنوں بعد اسٹور پر خود بیٹھے ہیں۔ ورنہ اتنے دنوں سے میں اکیلا ہی دیکھ رہا تھا۔" سامان لانے والے لڑکے نے جواب دیا۔ حمیدہ خوشی خوشی سامان سنبھالنے لگیں وہ نہیں جانتی تھیں کہ فاطمہ نے نعمان کو فون کیا تھا۔ وہ بڑا بھائی تھا' مگر فاطمہ نے اسے خوب لتاڑا تھا۔

"آپ دونوں یہ کیوں بھول گئے کہ جو عورت اس گھر میں بیٹھی ہے۔ جیسی بھی ہے' آپ کی ماں ہے۔ مانا کہ انہوں نے بہت غلطیاں کیں۔ مگر اولاد ہونے کے ناتے آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ انہیں ان کی غلطیوں کی سزا بھی دیں۔۔۔۔ آپ کو اگر عائشہ نہیں ملی تو اس میں آپ کا نصیب۔۔۔۔ لیکن یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ وہ بھوکی پیاسی گھر میں بیٹھی رہیں۔ رب کو منہ دکھانا ہے یا نہیں۔" فاطمہ بس ذرا دیر کو سانس لینے رکی۔

"دوسری بات محسن اور پھوپھو نے فیصلہ کیا ہے کہ اسٹور آپ کے پاس رہے گا۔ بس مارکیٹ کے حساب سے جو کرایہ بنتا ہے' وہ عریشہ کے اکاؤنٹ میں ڈلوا دیا کریں۔ مکان کا کرایہ تو وہ پہلے ہی وصول کر رہی ہے۔"

نعمان کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ ورنہ عریشہ حق ملکیت کا دعوا بھی کر سکتی تھی۔ اور کچھ فاطمہ کی باتوں کا اثر تھا۔ اس نے سارا راشن بمعہ سبزی گوشت وغیرہ بھجوا دیا تھا۔

حمیدہ نے ہری مرچیں اور خوب ٹماٹر ڈال کر گوشت بھونا۔ تازہ تازہ پھلکے بنائے۔۔۔۔ مگر جب کھانے بیٹھیں تو ایک نوالہ نہ لیا گیا۔ ان کے کانوں میں برکت حسین کی آواز گونجنے لگی۔

"سارے ٹبر کو روٹی کھلا دے گی۔ میرے لیے روٹی ڈالتے ہاتھ ٹوٹتے ہیں۔"

حمیدہ نے بے بسی سے نوالے کو دیکھا۔

"ڈکار لے۔۔۔۔ سارے کباب اکیلے اکیلے ڈکار لے۔"

حمیدہ نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔

یا اللہ! یا مجھے اٹھا لے یا اس عورت کو۔"

"ہائے ہائے۔۔۔۔ صرف اپنی بات کرو۔ مجھے تو ابھی زندگی میں بہت کچھ دیکھنا ہے۔"

"ہاں! تیری تو یہی خواہش ہے کہ میں کسی دن سوتے سے ہی نہ اٹھوں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"میں تو اوپری دل سے کہتی تھی برکت حسین! تم نے اتنی جلدی کر دی۔"

"اماں!" نعمان کی آواز پر انہوں نے پہلے پلو سے چہرہ صاف کیا پھر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں! تیرا ابا یاد آ گیا تھا۔"

"کھانا بن گیا ہو تو دے دو۔" وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

حمیدہ نے دو پھلکے ڈالے اور ٹرے میں رکھ کر لے گئیں۔ نعمان ہاتھ سر کی پشت تلے رکھے چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اٹھ گیا۔

"یہ ثوبان آج کل کدھر ہوتا ہے؟" بہت عرصے

ے بعد بھائی نے بھائی کے بارے میں پوچھا تھا۔
"نوکری مل گئی ہے۔ وہیں جاتا ہے۔"
"اچھا..." اس نے حسب عادت کھانے سے پہلے کف الٹائے۔
"نعمان! اب مجھ سے کام نہیں ہوتا... ویسے بھی سارا دن پاگلوں کی طرح خود سے باتیں کرتی رہتی ہوں ... تو اب شادی کرلے... اس گھر میں بھی تھوڑی رونق ہو جائے۔"
"اماں! آئندہ مت کہنا۔" نعمان نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیوں؟"
"مجھے شادی نہیں کرنی..." وہ نوالہ منہ میں ڈالنے لگا۔
"عائشہ سے بھی نہیں؟" نعمان کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا۔
"کون عائشہ؟"
"استانی عائشہ... تیری عائشہ۔" وہ مسکرائیں۔
"اس کا نکاح ہو گیا تھا۔"
"نہیں ہوا تھا۔ اس کی ماں نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اب بھی تیرا نصیب ہے۔ میں جاؤں گی اس کی ماں سے معافی مانگوں گی اور اس وقت تک دہلیز نہیں چھوڑوں گی، جب تک وہ عائشہ کا ہاتھ ہمیں نہیں دے دیتی۔"
"اماں..." وہ اب بھی بے یقین تھا۔
"کھانا کھالے، چھٹی والے دن چلیں گے۔" وہ واپس پلٹ گئیں۔
نعمان بہت دنوں کے بعد کھل کر مسکرایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"جس پل میں جذبوں کو سمجھنے کے قابل ہوئی۔ دل پر تمہارا نام لکھا۔ آج تک تمہیں سوچا، تمہیں چاہا۔ ہر لمحہ تمہاری بن کے گزارا، مجھے نہیں پتا، تم مجھ پر شک کیوں کرنے لگے ہو۔ لیکن میں صرف تمہیں چاہتی ہوں، میرا یقین کرو، تمہاری بدگمانی مجھے مار ڈالے گی۔"
عریشہ کی سسکتی آواز ہر وقت اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔
"مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوئی۔ کاش! میں نے اس وقت عریشہ کا انتخاب کیا ہوتا تو آج سب کچھ میرے ہاتھ میں ہوتا۔ کیسے پاگلوں کی طرح میرے اردگرد گھوما کرتی تھی۔ میرے ایک اشارے پر سب کچھ وار دینے کو تیار رہتی تھی۔ کیسی بھول ہو گئی۔ نہ باہر جاسکا نہ منیحہ ہاتھ آئی... اور گھر کی دولت بھی گنوادی۔"
اس نے سگریٹ سلگائی اور کش پر کش لگانے لگا۔
یہ سگریٹ نوشی بھی اس نے کچھ عرصہ قبل ہی شروع کی تھی۔ جب رہ رہ کر عریشہ اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ کبھی اسے لگتا وہ اس کے لیے کافی بنا کے لائی ہے۔ کبھی اس سے سرخ گلابوں کی فرمائش کرتی یاد آتی... تو کبھی چاند کو تکتی اس کے بے حد قریب۔
"وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔" ثوبان اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ ادھورا چاند کتنا اکیلا اور اداس لگ رہا تھا۔
"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ پھر سے مجھ پر نثار ہونے لگے۔"
"جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا۔ کیا وہ اب بھی تمہارے ساتھ محبت کرے گی؟" چاندنی نے تلخی سے سوال کیا۔
"ہاں... مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں... اس کی محبت میری ضرورت ہے۔"
"وہ تم سے نفرت کرتی ہے۔"
"محبت، نفرت میں بدل سکتی ہے تو نفرت بھی محبت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔"
اس نے سگریٹ کا طویل کش لے کر دھواں ہوا میں چھوڑا۔

☆ ☆ ☆

"ہم اپنی اولاد کے ساتھ کتنی زیادتی کر جاتے ہیں بھائی صاحب۔" نبیلہ نے رسان سے کہا۔ اس دن وہ

... جلد ہی اٹھ ... آئے تھے اور ان کے ... والدین ... مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ مریم کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔
"کسی کو بغیر جانے، بغیر دیکھے، محض اس لیے ریجیکٹ کر دیتے ہیں کہ اسے ہم نے نہیں، ہمارے بچوں نے پسند کیا ہے... اور کتنی عجیب بات ہے، بچے نے خود بھی اسی لڑکی کو پسند کیا جس کے لیے آپ کا بیٹا منتیں کرتا پھر رہا تھا۔"
"آپ نے ٹھیک کہا۔ ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔ ہم والدین کبھی کبھار واقعی اپنی انا کے پیچھے بچوں کی خوشیاں داؤ پر لگا دیتے ہیں... ہم نے فہد کو کن مشکلوں سے شادی پر راضی کیا، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔"
فہد کے والد نے شرمندگی سے کہا۔
"اور اسی غلطی کو سدھارنے ہم آپ کے پاس دوبارہ آئے ہیں۔" فہد کی والدہ نے ماحول کے تناؤ کو اپنی مسکراہٹ سے کم کرنے کی سعی کی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ تم جب بھی میرے سامنے آؤ گے، ایک بار تمہارا گریبان پکڑ کر سوال ضرور کروں گی کہ تم نے میرے ساتھ اتنا برا دھوکا کیوں کیا؟"
مریم فہد کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔
"میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا تھا مریم۔"
"مجھے گھر سے نکال کر سڑک پر کھڑا کر دیا... اور خود نہیں آئے... بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلے گئے اور کہتے ہو، دھوکا نہیں دیا۔" وہ چیخ اٹھی۔
"مریم! میری بات سنو..."
"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی اور مجھے تم جیسے بزدل انسان کے ساتھ شادی بھی نہیں کرنی۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔" اس کی بلند آواز پر عریشہ بھاگتی ہوئی آئی۔
"مریم! میں مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی... مجھے

مین وقت پر احساس ہوا کہ ہم غلط کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے لگا تم میرا انتظار کر کے گھر واپس چلی جاؤ گی اور ہم کوئی رستہ نکال لیں گے۔"

"ایک لڑکی کا گھر سے نکلنا اتنا آسان ہوتا ہے؟ اپنی عزت نفس کو داؤ پر لگا کر گھر والوں کی عزت پیروں تلے روند کر نکلتی ہے..... کیا یہ سب اتنا آسان تھا؟ میرا باپ مر گیا میری اس نادانی کے ہاتھوں..... اور تم کہتے ہو مجھ سے غلطی ہو گئی..... کون تھا مجھے اس مقام تک لانے والا... بولو..... تم تھے..... تم..... اور نقصان صرف میرا ہوا۔"

عریشہ نے آگے بڑھ کر اسے تھامنا چاہا۔

"جانتے ہو اس رات میں کیسے گھر پہنچی تھی۔ میں نے کیسے اپنی عزت بچائی تھی۔ مگر تمہیں یہ سب کیوں بتا رہی ہوں۔ تم ان لوگوں میں سے ہو، جنہیں محبت کرنا تو آتی ہے، مگر محبت نبھانا نہیں۔ مجھے نفرت ہے تم سے، تم رشتے کی بات کرتے ہو۔ میں تو تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"مریم....." فہد نے کچھ کہنا چاہا۔ عریشہ ان دونوں کے درمیان آ گئی۔

"فہد! پلیز تم اس وقت چلے جاؤ۔"

فہد نے بے بسی سے بے حال ہوتی مریم کو دیکھا اور لب بھینچتا وہاں سے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"اب کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کیوں انکار کر رہی ہو؟ وہ ہی مل رہا ہے جس کے لیے گھر سے بھاگ رہی تھیں، تو پھر اب یہ نخرے کیوں؟ شکر کرو، عزت سے گھر کی ہو رہی ہو۔ ورنہ تم جیسی لڑکیاں ساری زندگی لوگوں کے طعنے سنتی ہیں۔ یا زہر کھا کر مر جاتی ہیں اور ایک بات کان کھول کر سن لو، نعمان تمہیں وہاں لے جانے پر راضی نہیں اور میں تمہیں یہاں زیادہ دن نہیں بٹھائے رکھوں گی۔ اگر تم یہ امید لے کر بیٹھی ہو کہ اتنی بدنامی کے بعد تمہارے لیے کوئی ڈھنگ کا رشتہ آئے گا تو اسے دل سے نکال دو۔"

فاطمہ گرج برس کر چلی گئی تھی۔

اس کے الفاظ زہر میں بجھے تیر سہی۔ مگر حقیقت سے کتنے قریب تھے۔ یہ بات مریم بھی جانتی تھی۔ تب ہی لب سیئے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ سنتی رہی۔

"مریم!" عریشہ اس کے پاس آ کر بیٹھی۔

"عریشہ! کوئی بھی میرے احساسات نہیں سمجھتا۔"

"سب سمجھتے ہیں مریم!" عریشہ نے بازو پھیلا کر خود سے قریب کر لیا۔

"لیکن کچھ باتیں تمہیں بھی سمجھنی ہوں گی۔"

"میں کیسے اس انسان سے شادی کر لوں، جس نے میرے ساتھ اتنا برا کیا؟" وہ بے بسی سے گویا ہوئی۔

"وہ اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہے۔"

"اس کی شرمندگی میری نیک نامی واپس لا سکتی ہے؟"

"شاید تمہیں اس گھر میں پورے عزت و احترام کے ساتھ جانا تھا۔ تب ہی اس لمحے فہد کمزور پڑ گیا۔ مریم! کبھی کبھار ہمیں خود بھی احساس نہیں ہوتا کہ تقدیر نے ہمارے نصیب میں ہماری خوشی لکھ دی ہوتی ہے، مگر ہم اپنی جلد بازی کے ہاتھوں اپنا ہی برا کر لیتے ہیں..... جانتی ہو، بانو آپا کے دیور نے تم سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔"

مریم کو جھٹکا لگا۔

"اس نے کہا، جو لڑکی ایک بار مجھے انکار کر سکتی ہے، مجھے دوبارہ اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں جوڑنا۔ بانو آپا صرف اپنی نند سے جان چھڑانے کے لیے اس ویٹے کی شادی پر زور دے رہی تھیں۔ اگر اس رات تم رک جاتیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی۔"

مریم شدید صدمے سے کچھ بول ہی نہ پائی۔

ثوبان نے انہیں لان میں بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی اس طرف پشت تھی۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے سرخ گلابوں کے گلدستے کو دیکھا اور اپنی ہمت مجتمع کرتا آگے بڑھا۔ اس نے سوچ لیا تھا پہلے عریشہ اس کے آگے پیچھے گھومتی تھی۔ اب یہی کام اسے کرنا تھا۔ اسے ہر صورت سوئی ہوئی محبت کو جگانا تھا۔

"پلیز مریم! فہد کو معاف کر دو۔"

"اچھا..... تم ثوبان کو معاف کر سکتی ہو؟"

ثوبان کے قدم رک گئے۔

چند لمحوں کی خاموشی بہت طویل ہو گئی تھی۔

"نہیں۔"

"کیوں، اگر میں فہد کو معاف کرتی ہوں تو تمہیں بھی ثوبان کو معاف کرنا ہو گا۔"

"نہیں مریم! تم غلط جج کر رہی ہو....." کچھ لمحوں کے بعد عریشہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"فہد سے ایک لمحے میں درست فیصلہ نہ کرنے کی بھول ہوئی تھی۔ وہ بعد میں بھی پچھتاتا، دیوانہ وار تمہیں ڈھونڈتا رہا ہے جبکہ ثوبان..... اس نے سوچ سمجھ کر جانتے بوجھتے، ہر قسم کے نفع نقصان کو سامنے رکھ کر میری محبت سے دست برداری اختیار کی تھی۔ بھول کی معافی ہوتی ہے مریم! خود غرضی اور غلط نیت کی نہیں یوں بھی میں اس محبت کو دفن کر کے فاتحہ بھی پڑھ چکی..... لیکن مجھے ہر سال محبت کی اس قبر پر پھول چڑھانا گوارا نہیں..... ثوبان سے میری محبت میری بھول تھی اور میں اس کے لیے خود کو معاف کر چکی۔ میں ابرار سے شادی کر رہی ہوں۔"

ثوبان کے ہاتھ سے پھول چھوٹ کر بے آواز گھاس پر گرے۔

"کیونکہ وہ ایک مخلص، سچا اور نیک نیت انسان ہے۔ اس کے اندر کوئی کھوٹ نہیں۔ میں اسے کھونے کی غلطی نہیں کروں گی۔ کیونکہ اسے تو کوئی بھی اچھی لڑکی مل جائے گی..... لیکن مجھے اس جیسا اچھا اور سچا انسان دوبارہ نہیں ملے گا۔"

ثوبان خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

"اٹھو مریم! آج ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اب کبھی اپنی غلطیوں کو نہیں دہرائیں گے اور کسی دوسرے کو الزام بھی نہیں دیں گے، کیونکہ "ساری بھول ہماری تھی" اور ہمیں اپنی اپنی بھول کو سدھارنا ہے۔" عریشہ نے کھڑے ہو کر ہاتھ پھیلایا۔

مریم نے اسے دیکھا..... اور ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں ایک ساتھ چلتی اندر کی طرف چلی گئیں۔

عقب میں سرخ گلاب سبز گھاس پر بکھرے رہ گئے۔

یہی پھولوں کا نصیب ہے۔
کبھی خوشیوں کی سیج پر سجتے ہیں۔
کبھی قبروں کو ڈھانپ دیتے ہیں۔
تو کبھی سبز گھاس پر بکھرے رہ جاتے ہیں، کیونکہ انہیں ناقدرے ہاتھوں نے چھوا ہوتا ہے۔

☼

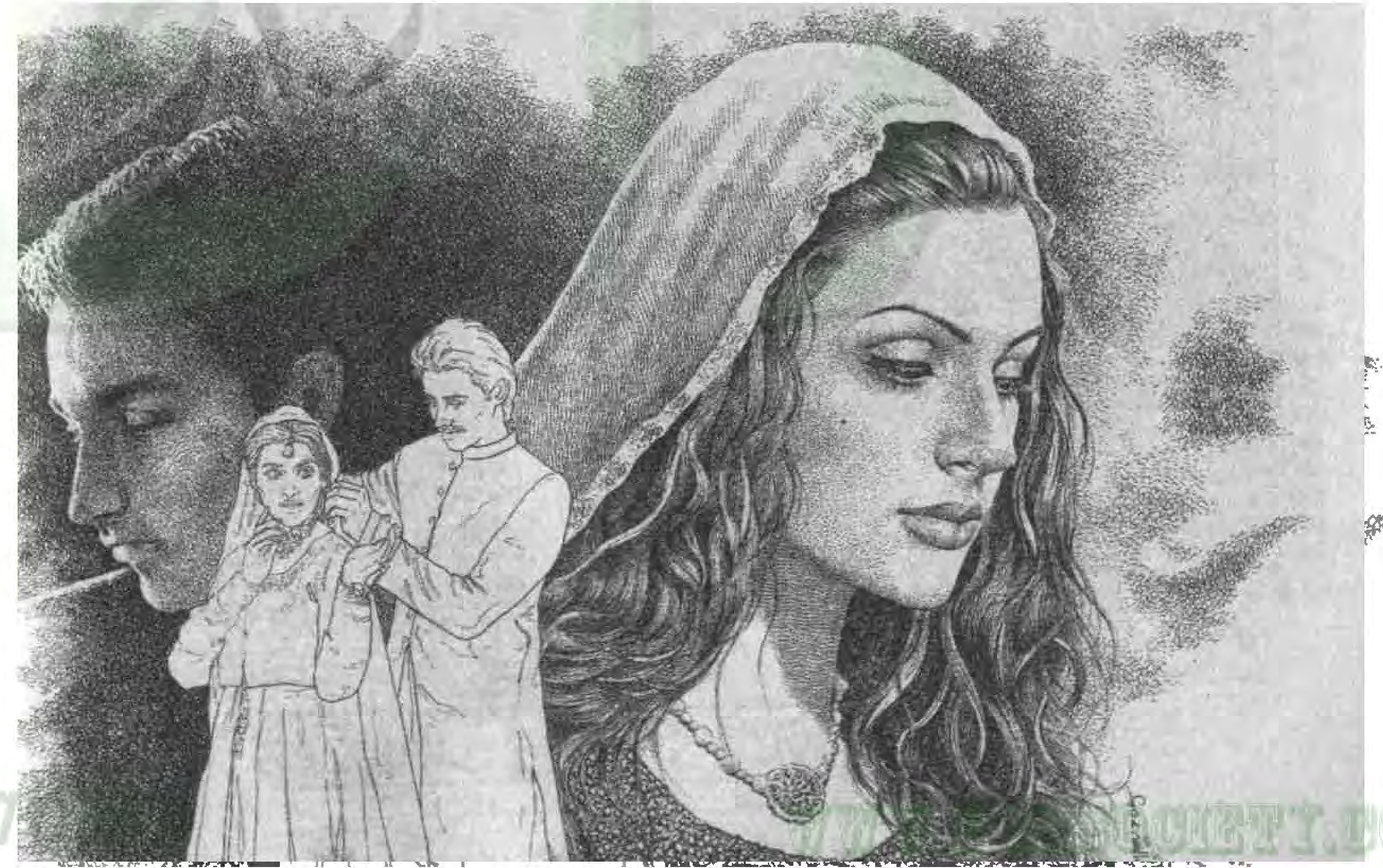


فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک معزز شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وٹوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا۔ لیزا ذہانت و خوب صورتی میں درمیانے درجے کی تھی۔ وہ محمود خالد کے پاس رہی۔ وٹوریا نے ارب پتی بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وٹوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نینی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسد سے کروا دیتے ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔



زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین، سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار، سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم، زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں امو جان رو، رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں، وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے، ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوبا چلا جاتا ہے لیزا کو ہر ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم، محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد تمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو دوبا میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوبا آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے، اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

ام مریم ہاشم کی بیوی کو طلاق دلوا کر اس سے شادی کرتی ہے مگر بڑی ہوشیاری سے یہ بات چھپاتی ہے۔

سکندر نے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدی۔ لیزا، خالد محمود کو اور سکندر امو جان کو اپنی شادی کے فیصلے سے آگاہ کرتا ہے وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ امو جان سکندر سے ملنے پر اصرار کرتی ہیں۔ وہ وعدہ کر لیتا ہے۔ لیزا کی ایگزیبشن ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دوبا میں پورا دن سکندر کے ساتھ گزارتی ہے۔ سکندر اس کو شاپنگ کرواتا ہے۔ دوبا سے وہ کراچی کے لیے روانہ ہوں گے۔ شہریار خان آمنہ بیگم سے لیزا کے لیے زیورات خریدنے کو کہتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

گیارہویں قسط

انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ کو بہت سخت مزاج انسان پایا تھا۔ وہ حاکمانہ طبیعت کے حامل تھے۔ بیوی، بچوں پر رعب رکھنے والے شہریار خان اپنے بابا کے اکلوتے بیٹے تھے مگر ان کی کبھی مجال نہ ہوئی تھی کہ باپ سے بے تکلف بات چیت کر سکیں۔ بچپن تک اپنی ہر خواہش اور فرمائش پہنچانے کے لیے وہ تینوں ماں کا سہارا لیتے تھے۔

ان کی امی جی جوان کے بابا کے آگے جھکی جھکی، کسی کنیز کی طرح رہا کرتی تھیں۔ انہیں تو ایسا لگتا تھا، امی جی بھی بابا سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ بہت محتاط ہو کر، ان کا موڈ دیکھ کر، ایک ایک لفظ ناپ تول کر وہ ان سے بات کرتی تھیں۔ پتا نہیں بابا کسی سے خوش ہو کر، ہنس کر، بے تکلفی سے بات کرتے بھی تھے کہ نہیں۔ کم از کم بیوی بچوں کے ساتھ تو انہوں نے کبھی خوشگوار انداز میں مسکرا کر باتیں نہیں کی تھیں۔ ہمیشہ حکم ہی صادر کیے تھے۔ ہمیشہ اپنے فرمان منواتے ہی تھے۔ خاندانی جاہ و جلال، روپیہ پیسہ، عالیشان گھر، زباں گھر میں سب کچھ تھا مگر وہاں ان کی امی جی اور ان بھائی بہنوں کو چوں کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

ان کے کیمبرج سے پڑھ کر آئے بابا کا رویہ بیوی کے ساتھ ادنیٰ غلاموں والا ہوتا تھا۔ ان کے گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ وہاں ان کی دادی بھی تھیں، چچا اور چچی بھی تھے اور ان دونوں کا چند ماہ کا بیٹا بھی تھا۔

چچی اس گھر میں بیاہ کر نئی آئی تھیں۔ وہ خاصی شوخ و چنچل تھیں، وہ بے تحاشا خوب صورت تھیں۔ شہریار خان کی پانچ سال کی بہن صفیہ کو وہ کبھی کسی فلمی اداکارہ جیسی لگتیں اور کبھی کسی فلمی اداکارہ سے بھی زیادہ حسین۔ اندرون سندھ ان کی زمینیں بھی تھیں اور فیکٹریاں بھی، جن کے تمام معاملات چچا سنبھالا کرتے تھے۔ سو انہیں ہر ہفتے شہر سے باہر جانا ہوتا تھا کبھی ایک دن کے لیے، کبھی دو، تین دنوں کے لیے۔ جبکہ کراچی میں تمام کاروباری معاملات ان کے بابا دیکھا کرتے تھے۔

دادی بہت ضعیف اور بیمار تھیں۔ جب سے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے بغیر کسی ملازمہ کی مدد اور وہیل چیئر کے باہر نہیں نکل سکتی تھیں سو ان کا زیادہ وقت کمرے ہی میں گزرا کرتا تھا۔ ان کے بابا اور چچا آتے جاتے ماں کی خیر و عافیت دریافت کیا کرتے تھے۔

شہریار خان اس گھر کے سب سے بڑے بچے تھے۔ تب وہ آٹھ سال کے تھے۔ ان کی بہنیں صفیہ اور دریہ پانچ اور چار سال کی تھیں اور چچا کا بیٹا آٹھ، نو ماہ کا تھا۔ انہوں نے اپنے بابا کو کام کی بات کے علاوہ کبھی چچی سے کوئی زیادہ بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ چچا سے بھی وہ عمر میں خاصے بڑے تھے تو ان پر بھی بڑے بھائیوں والا رعب رکھا کرتے تھے۔ دادا ابا کے انتقال اور دادی کی معذوری کے بعد اب ان کے بابا ہی عملی طور پر اس گھر کے سربراہ تھے۔

ایک رات انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کا ایک، ڈیڑھ بج رہا تھا۔ وہ پانی پینے کے لیے کمرے سے باہر نکلے تب ہی انہوں نے بابا کو اپنے کمرے سے نکلتے اور دبے پاؤں چل کر چچا کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ فوراً" ستون کے پیچھے ہو گئے تھے۔ بابا کا انداز تھا ہی ایسا، چوروں جیسا۔ وہ ہر طرف چوکنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

چچا کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر بھی بابا نے مڑ کر چاروں طرف نگاہیں دوڑائی تھیں۔ کہیں پر بھی کوئی نہیں ہے، یہ اطمینان کر لینے کے بعد وہ اندر چلے گئے تھے۔ چچا تو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے پھر بابا اتنی رات کو ان کے کمرے میں کیوں گئے تھے؟

ان کے دل کو بے چینی اور بے سکونی ہو رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں بغیر کچھ آواز پیدا کیے چل رہے تھے۔ وہ رات کے اندھیرے اور سناٹے سے ڈرے بغیر گھر کے رہائشی حصے سے باہر بیک یارڈ میں نکل آئے تھے۔ جہاں چچا کے کمرے کی بیک تھی۔ انہوں نے وہاں پنجوں کے بل خود کو اونچا کر کے کھڑکی سے اندر جھانکا۔

کمرے میں موجود لوگوں کو شاید اتنی رات گئے بیک یارڈ میں کسی کی موجودگی کی توقع نہیں ہو گی سو کھڑکی پر

پردے کرانے بھول گئے ہوں گے یا پھر شاید نفس نے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی ہوگی۔

اندر کا منظر دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ چچا، چچی کا بیٹا کاٹ میں بے خبر سو رہا تھا اور اس کے بابا اور چچی بیڈ پر ایک دوسرے کی بانہوں میں بالکل مدہوش پڑے تھے۔ انتہائی شرمناک حالت میں۔ مدہوشی میں جو باتیں وہ دونوں ایک دوسرے سے کر رہے تھے انہیں سن کر ان کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

"میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں وقار! جہاں زیب تو آپ کے پاسنگ بھی نہیں۔"

"مگر اس کی قسمت دیکھو، اسے تم جیسی حسین لڑکی مل گئی اور مجھے وہ جاہل، گنوار عورت۔ جہاں زیب بہت لکی ہے۔"

"مگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں وقار! میں آپ کی ہوں۔"

"اور جو راتیں اس کے ساتھ گزارتی ہو وہ؟"

"وہ تو مجبوری ہے وقار۔ دل سے تو مجھے صرف آپ کے نزدیک رہنا اچھا لگتا ہے۔"

"اب کی بار میں نے ایسا کاموں میں الجھا کر بھیجا ہے اس الو کو۔ پانچ دن سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ یہ پانچ راتیں ہماری ہوں گی۔ میری اور تمہاری۔" مخمور لہجے میں بولتے بابا، چچی کے اور بھی نزدیک ہو گئے تھے۔

آٹھ سال کے بچے کو گناہ، زنا اور بدکاری کے الفاظ نہیں پتا تھے، رشتوں کا تقدس بھی ابھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر پھر بھی انہیں یہ سب بہت غلط، بہت برا لگا تھا۔ انہیں اپنے بابا بہت برے لگے تھے۔

وہ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ کبھی ان کا دل چاہتا، وہ جا کر امی جی کو اٹھا دیں۔ انہیں سب کچھ بتا دیں کبھی دل چاہتا، بابا اور چچی کو جان سے مار دیں۔ انہیں یہ تو سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہفتے کے جتنے دن چچا دوسرے شہر میں ہوتے تھے ان تمام دنوں کی راتیں بابا، چچی کے کمرے میں ان کے ساتھ گزارتے تھے۔ جیسے تیسے انہوں نے صبح ہونے کا انتظار کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ بھاگ کر امی جی کے کمرے میں آئے تھے۔ مگر وہ امی کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا وہ ساری رات روتی رہی تھیں۔

وہ اپنی جگہ بالکل سن ہو کر کھڑے رہ گئے تھے۔ وہ ماں کو لاعلم سمجھ کر انہیں بابا اور چچی کے تعلق کے بارے میں بتانے آئے تھے مگر وہاں تو ان کی ماں کی روتی ہوئی ویران بنجر آنکھیں اور اجاڑ وجود یہ داستان سنا رہا تھا کہ وہ سب کچھ جانتی ہیں۔

ان کی امی جی سب جانتی تھیں اور چپ تھیں۔ امی جی چپ کیوں تھیں، وہ دادی سے کہتیں، وہ نانا، نانی سے بابا کی شکایت کرتیں۔ وہ ماں کی خاموشی پر بہت الجھے تھے۔

رات بابا کو چچی کی بانہوں میں دیکھ کر ان کا دل چاہا تھا۔ وہ ان کے پیٹ میں چاقو اتار دیں۔ بابا سے ایسی شدید نفرت محسوس ہوتی تھی۔ مگر صبح جب بابا سے سامنا ہوا تو کچھ کرنا تو درکنار وہ تو نفرت بھری نگاہوں سے بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ تک نہ سکے تھے۔ بابا کی دہشت اور ہیبت اتنی تھی۔ وہ روزانہ کی طرح ان کے آگے سر جھکا کر ہی بیٹھے رہے تھے۔ بابا سے تو کیا وہ خوف کے مارے کسی اور سے بھی کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ اگر بابا کو پتا چل گیا کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہے تو بابا تو ان کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔

وہ اس روز اپنے کمرے میں بالکل اکیلے سب سے چھپ کر بہت روئے تھے۔ اپنی کمزوری اور بزدلی پر، اپنی ماں کی بے بسی اور خاموشی پر اور اپنے باپ کے ظلم پر۔ وہ چپ رہے تھے۔

پھر وہ چپ ہوتے چلے گئے۔

جیسے جیسے ان میں سمجھ داری آنے لگی، انہیں یہ بھی پتا چلنے لگا کہ ان کی امی جی، بابا اور چچی کے اس ناجائز رشتے کے بارے میں جانتی ہیں۔

وہ جس رات بابا کو چچی کے کمرے میں جاتا دیکھتے اس کی صبح ماں کی رو رو کر سوجی ہوئی آنکھیں دیکھا کرتے۔ امی جی بابا سے خوف زدہ تھیں۔ بابا انہیں گھر سے نکال دیں گے، انہیں نانا، نانی کے گھر بھیج دیں گے انہیں طلاق دے دیں گے۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھیں، ختم ہو رہی تھیں۔ خوف کے سبب ان میں باپ کے آگے سر اٹھانے کی ہمت نہ تھی مگر دل میں ان کے لیے نفرت ہی نفرت اور غصہ ہی غصہ تھا۔

بابا کے چچی کے ساتھ ناجائز تعلقات ختم نہ ہوئے تھے۔ ہاں! غم میں گھلتی، ظلم، جبر اور زیادتی کو خاموشی سے چپ چاپ سہتی سہتی ان کی امی جی ایک روز ضرور ختم ہو گئی تھیں۔

باپ کی اس منافقانہ دہری شخصیت اور گھناؤنے عمل نے ان کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

بیوی کے ساتھ سخت رویہ، بچوں کے ساتھ حاکمانہ انداز۔ آمنہ ان کی ماں کی طرح صابر تھیں۔ ان کے سخت رویے اور مطلق العنانی کو سر جھکا کر قبول کر گئی تھیں اور بچے اسی طرح کمزور تھے جیسے کل اپنے بچپن میں وہ کمزور تھے۔

سدا اس دنیا میں کس نے رہنا ہوتا ہے۔ اپنے تمام گھناؤنے اعمال اور ظلم و زیادتی ساتھ لیے ان کے بابا، ان کی امی جی کے انتقال کے برسوں بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

اپنے اندر کا احساس کمتری اور شرمناک بچپن چھپانے کے لیے انہوں نے بیوی اور بچوں کے سامنے ہمیشہ اپنے بابا کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ آخر ان کے بدکار بابا تھے تو ایک بے تحاشا ذہین اور خوب صورت مرد۔ وہ اپنے بابا پر تھے اور سکندر ان دونوں پر۔ وہ سکندر کو اپنے جیسا اور اپنے بابا جیسا کامیاب انسان بننے کی نصیحتیں کیا کرتے تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود بھی تھیں۔ وہ بن سکتا تھا ان دونوں جیسا۔

اپنی تمام توجہ سکندر پر مرکوز کر کے وہ زین کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں، انہوں نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا۔ ان کے رویے نے زین کو سکندر سے مقابلہ بازی اور حسد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ انہوں نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ زین اور سکندر کے بیچ بھائیوں جیسی بے تکلفی اور دوستی نہیں بلکہ سرد مہری اور بہت فاصلہ ہے، انہوں نے اس بات کو کبھی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ بیوی، بچوں کے احساسات کو وہ سوچا ہی کب کرتے تھے۔

بارہ سال قبل 31 دسمبر کی اس شام کو جب نیو ایر پارٹی میں جاتے جاتے وہ گھر واپس آئے تھے تب اپنے گھر کا وہ منظر دیکھ کر وہ غصے سے پاگل سے ہو گئے تھے۔

ان کا بیٹا اپنی ہونے والی بھاوج کے ساتھ؟

انہیں اس پل سکندر کی شکل میں اپنا باپ نظر آیا تھا، ام مریم کی رونے کی آوازوں میں اپنی ماں کے گھٹ گھٹ کر رونے کی آواز سنائی دی تھی۔ کل وہ کمزور تھے۔ باپ سے ڈرتے تھے۔ ان کے آگے کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکے تھے۔ ماں کی حمایت میں اٹھ نہ سکے تھے، باپ کو اس گھناؤنے عمل اور ظلم سے روک نہ سکے تھے۔ مگر آج وہ کمزور نہیں۔ آج وہ طاقت ور ہیں۔ آج وہ حاکم ہیں۔ باپ کے خلاف ان کے اندر جتنا بھی ابال اور غصہ تھا وہ سب باہر نکل آیا تھا۔

انہیں اپنی ماں کے آنسوؤں اور دکھوں کا حساب لینا تھا اس بدکار شخص سے۔ وہ ام مریم کی آہوں اور سسکیوں میں مسلسل اپنی ماں کی آہیں سن رہے تھے۔

ایک جنون، ایک پاگل پن سا ان پر سوار تھا۔ ضد اور جنون ان سے ان کے ہوش اور سوچ سمجھ چھین کر لے گیا تھا۔ وہ سکندر کو نہیں بلکہ اپنے بدکردار باپ کو اپنی زندگی سے باہر نکال رہے ہیں۔ رشتوں کی دھجیاں اڑانے والا ان کا بدکردار بیٹا صرف شکل و صورت اور ذہانت ہی میں اپنے دادا پر نہیں گیا تھا، وہ عادتیں اور خصلتیں بھی دادا کی سی لے کر پیدا ہوا تھا۔ بدکردار، نفس کا غلام، اپنے ہی گھر کی عزت پر نظر رکھنے والا۔

سکندر کے ساتھ انہوں نے وقار خان کو، اپنے بابا کو بھی اس گھر سے دھکے مار مار کر نکال دیا تھا۔ انہیں اپنے فیصلے پر نہ افسوس ہوا تھا نہ پچھتاوا۔ برسوں سے ان کے

سینے میں تلی آگ آج بھی تھی۔ آج وہ چپ نہ رہے تھے۔ آج انہوں نے غلط کو غلط کہا تھا۔ مجرم کو مجرم کہا تھا۔ زانی کو زانی کہا تھا۔

زین خاموش تھا۔ ام مریم ان کے گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی اور آمنہ مسلسل رو رہی تھیں۔ وہ بار بار ان سے التجائیں کر رہی تھیں کہ وہ سکندر کو گھر واپس لے آئیں۔ وہ آمنہ پر بہت زور سے چلائے تھے۔ ان کے گھر میں موت کا سا سناٹا اور ویرانی تھی۔ سکندر پھر گھر آیا تھا۔

"میں بے گناہ ہوں بابا! اس لڑکی کا مجھ پر لگایا ہر الزام جھوٹا ہے۔"

کل وہ بوکھلا کر، گھبرا کر، پریشان ہو کر، رو کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ آج مضبوط لہجے میں۔ مگر وہ اس کی بات نہ کل سننے پر راضی تھے نہ آج۔ انہیں محبت تو دور اس پر رحم تک نہیں آیا تھا اس پل۔ وہ ابھی صرف بیس سال کا ہے، بہت چھوٹا ہے۔ وہ کہاں جائے گا، کیا کرے گا، کیسے زندہ رہے گا، انہیں ان میں سے کسی بھی بات کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ جو پیسہ وہ آرام سے، بے دریغ خرچ کرتا ہے، وہ کمایا کس طرح جاتا ہے؟ وہ سخت لہجے میں اسے اپنے گھر اور زندگی سے نکل جانے کا حکم دے رہے تھے۔

انہیں پتا تھا، وہاں زین بھی کھڑا ہے۔ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ زین چاہتا ہے، وہ سکندر کو پھر گھر سے نکال دیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ زین کی خاموشی میں بہت سے احتجاج وہ سن رہے تھے۔

"آپ نے ہمیشہ اس میں اور مجھ میں فرق رکھا اور اب بھی رکھ رہے ہیں؟ یہ گناہ اگر میں نے کیا ہوتا تو کبھی معاف نہ کیا جاتا۔ مگر آپ کے قابل اور لائق بیٹے نے کیا ہے تو اسے معافی مل جائے گی۔"

انہوں نے اس پل بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کے سخت اور حاکمانہ رویوں کا اثر ان کے بچوں پر کس قدر منفی انداز میں پڑا ہے۔ زین کو ہر وقت سکندر کی مثالیں دے دے کر اور پھر اسے نظر انداز کر کے انہوں نے ان دونوں بھائیوں کے بیچ کس قدر نفرت پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے سوچا تھا تو یہ کہ زین کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اسے بتا دیں کہ اپنے باپ کی خصلت پر گئے ہوئے سکندر شہریار کو وہ مرتے دم تک معاف نہیں کریں گے۔

روتی ہوئی آمنہ وہاں آئیں، سکندر کی حمایت میں بولیں تو انہوں نے غصے سے انہیں جھڑک دیا تھا۔ انہیں آمنہ کی باتوں پر سخت غصہ آرہا تھا مگر وہ برداشت سے کام لیتے رہتے اگر آمنہ ان کے بابا کا نام بیچ میں نہ لاتیں۔

"کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کیوں دے رہے ہیں؟ اپنے باپ کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیں شہریار۔"

آمنہ کے الفاظ انہیں آپے سے باہر کر گئے تھے۔ آمنہ کو ان کے بابا کے بارے میں کیسے پتا چل گیا؟ اس راز کا تو ان کے، ان کی امی جی اور چچی کے سوا کوئی گواہ تک نہ تھا۔ پھر آمنہ کو کیسے؟ وہ طیش میں آکر تمیز اور تہذیب سب کچھ بھول گئے تھے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار آمنہ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا اور انہیں گالی بھی دی تھی۔ سکندر نے انہیں آمنہ کے منہ پر دوسرا تھپڑ نہیں مارنے دیا تھا۔ وہ تھپڑ اس نے اپنے گال پر کھایا تھا۔

وہ ایک دم ہی اپنی صفائی میں مزید کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے جانے لگا تھا۔ نکلنے سے قبل اس نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔ ان کی اور سکندر کی نگاہیں ملی تھیں۔ سکندر کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ وہ مظلوم ہے، وہ بے گناہ ہے۔ اس پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔ مگر وہ اس وقت اپنے آپ میں کب تھے؟ آمنہ کے منہ سے باپ کا طعنہ، باپ کی گالی انہیں بالکل آپے سے باہر کیے ہوئی تھی۔

ان کے گھر میں جیسے کسی کی موت ہو گئی تھی۔ آمنہ ہر وقت روتی رہتی تھیں۔

"کون مر گیا ہے اس گھر میں؟ کس کا ماتم مناتی رہتی ہو ہر وقت؟"

چند دن برداشت کرنے کے بعد انہوں نے آمنہ کو

بہت سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ آمنہ نے ان کے خوف سے ان کے سامنے رونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان سے چھپ چھپ کر تنہائی میں رونے لگی تھیں۔ آمنہ کی خاموش خالی اور ویران آنکھیں ہر لمحے ان سے التجا کرتی تھیں کہ سکندر کو واپس بلالیں۔ اسے ڈھونڈ کر واپس گھر لے آئیں۔ ان پر آمنہ کی ان التجا کرتی، رحم کی بھیک مانگتی نگاہوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

پھر اس روز جب سکندر کو ان کے گھر سے گئے آٹھ یا دس دن ہی ہوئے تھے۔ اس کا فون آیا۔ ایک انجان نمبر سے۔ وہ بری طرح رو رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف کے عالم میں بول رہا تھا۔ جیسے زخمی ہو' اسے چوٹ لگی ہوئی ہو' اسے بولنے میں دشواری کا سامنا ہو۔

"پاپا! کل رات...... پاپا! کل رات میرے ساتھ۔"

وہ روتے ہوئے پتا نہیں انہیں کیا بتانا چاہتا تھا۔ مگر وہ تو اس کی آواز سنتے ہی غصے سے پاگل ہونے لگے تھے۔ تھا وہ بد کردار اپنے دادا کی طرح عیاش اور رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والا۔ اسی قابل کہ دنیا کی ٹھوکروں میں پڑا رہے۔ وہ روتے ہوئے ان کی منت کر رہا تھا۔

"پاپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پلیز پاپا! مجھے آکر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا پاپا۔ پلیز مجھے بچالیں۔"

وہ زار و قطار روتے ہوئے تکلیف سے کراہ بھی رہا تھا۔ کیا اسے چوٹ لگی تھی؟ کیا وہ زخمی تھا؟ وہ کہاں تھا؟

ان کے اندر ایک باپ، بہت بے چین اور مضطرب ہوا تھا۔ مگر نہیں۔ آج اس باپ کو کمزور نہیں پڑنا۔ اگر یہ باپ کمزور پڑا تو وقار خان جیت جائے گا' ان کی ماں ہار جائے گی۔ وقار خان ساری زندگی گناہ کرکے بھی عزت دار بنا رہا تھا اور ان کی ماں مظلوم ہو کر بھی خاموش دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ آج وقار خان کو ہارنا تھا۔ ان کی امی جی کو جیتنا تھا۔ یہ تو یوم حساب تھا۔ یہ تو سزا اور جزا کا دن تھا۔

"میرے گھر میں تم جیسے بد کردار اور بد فطرت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم میرے لیے مر چکے ہو۔ میں تمہیں رو چکا ہوں۔"

اور وقار خان ہار گیا تھا' امی جی جیت گئی تھیں۔ سزا جیت گئی تھی۔ انصاف جیت گیا تھا۔ گناہ اور گناہ گار ہار گئے تھے۔ مظلوم جیت گئے تھے۔

مگر ایک باپ ہار گیا تھا۔

ان کے اندر وہ باپ رو رہا تھا۔ جس نے آج کئی دنوں بعد اپنے بیٹے کی آواز سنی تھی اس حال میں کہ ان کا بیٹا زخمی تھا' شاید وہ بیمار تھا' شاید اسے چوٹ لگی تھی۔ نجانے وہ کس مشکل میں تھا۔ اسے کہاں چوٹ لگی تھی۔ وہ کس طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ان کا آسائشوں میں پلا وہ بیٹا باہر دنیا کی سختیاں نجانے کس طرح سہہ رہا تھا' نجانے دنیا نے 'لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا جو وہ یوں رو پڑا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا تھا۔ سکندر کی اس فون کال کا ذکر انہوں نے آمنہ سے کرنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے اس فون کال کو بالکل بھلا چکے تھے۔ مگر اس سب کے باوجود انہوں نے بالٹی مور سے کی جانے والی اس کال کا وہ فون نمبر اپنے پاس محفوظ رکھا تھا جس سے سکندر نے انہیں کال کی تھی۔ نجانے کیوں؟

دن پر دن گزر رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر سکندر کے لیے بے چین ہوا کرتے تھے مگر خود سے بھی یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ آمنہ کی مجال نہ تھی کہ سکندر کا نام لے سکیں' اسے یاد کرکے ایک آنسو بھی بہا سکیں۔ کہاں سے دل لائے تھے وہ یہ سب کرنے کے لیے؟ مگر جب وہ سب کر رہے تھے تو لگتا تھا وہ حق پر ہیں' وہ اصول کی بات کر رہے ہیں۔

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل رہے تھے۔ جو خواب انہوں نے سکندر کے لیے دیکھے تھے انہیں زین پورا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہارورڈ سے لاء کر رہا تھا۔

اور سکندر؟ وہ کہاں تھا؟ وہ ان کے لیے مر چکا تھا۔ آمنہ بیمار رہنے لگی تھیں' انہیں پروا نہیں تھی۔ ان کے گھر میں موت کا سناٹا رہنے لگا تھا۔ انہیں پروا نہ تھی۔ ان کی ریٹائرمنٹ ہو گئی تھی۔ وہ آمنہ کو ساتھ لے کر پاکستان واپس آگئے تھے۔ ان کے بابا کی وفات کے بعد چچا نے فیکٹریوں اور ملوں کے معاملات کو سنبھالا تھا مگر

چند سال ہوئے ان کا بھی انتقال ہو چکا تھا تو اب ان ہی کو ان سب کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

وہ گزشتہ چند سالوں سے امریکہ میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سال میں دو سے تین چکر لگا رہے تھے تاکہ خاندانی بزنس کی ساکھ متاثر نہ ہو۔

خاندان' عزت' نام' مرتبہ' بہت اہم تھیں یہ تمام چیزیں ان کے لیے۔ بظاہر کسی کو بھی لگتا نہیں تھا کہ وہ کبھی سکندر کو سوچتے بھی ہوں گے۔ مگر وہ اسے سوچتے تھے۔ خود سے بھی چھپا کر۔ وہ دن میں جتنے بھی مضبوط نظر آتے تھے مگر رات میں وہ سو نہیں پاتے تھے۔

سکندر کہاں تھا؟ پانچ سال بیت چکے تھے اسے ان سب کی زندگیوں سے نکلے۔ آخر وہ اب کہاں تھا؟ ایک روز جب دل کی بے کلی بہت ہی بڑھی تب انہوں نے پانچ سالوں سے اپنے پاس محفوظ وہ فون نمبر نکالا تھا۔ انہوں نے اس نمبر پر کال کی تھی۔ وہ بالٹی مور کے ایک ہسپتال کا نمبر تھا۔

وہ ایک ہسپتال کا نمبر تھا؟ وہ کانپ گئے تھے۔

"پاپا کل رات...... پاپا کل رات میرے ساتھ......"

ان کے کانوں میں اس کی تکلیف سے کراہتی اور زار و قطار روتی ہوئی آواز گونجی تھی۔ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ کل رات؟ کوئی حادثہ؟ کوئی کار ایکسیڈنٹ؟ کیا؟ آخر کیا؟ وہ سر سے پاؤں تک پسینہ میں نہا گئے تھے۔ وہ رو پڑے تھے۔ وہ پانچ سال بعد رو پڑے تھے۔

"پاپا! مجھے گھر آنا ہے۔ پلیز پاپا! مجھے آکر لے جائیں۔"

اس کی روتی' فریاد کرتی آواز' اس کی آہیں ان کا دل دہلا رہی تھیں۔ کسی غیر کو بھی اس طرح التجا کیے جانے پر رحم آجاتا مگر سکندر بد نصیب تھا۔ اس کے سگے باپ کو اس پر رحم نہیں آیا تھا۔ اس روز انہیں نہ اپنی ماں یاد آئی تھی نہ باپ۔ اس روز انہیں صرف اور صرف سکندر یاد آیا تھا۔ باپ کو ہرانے کی دیوانگی اور جنون میں انہوں نے اپنا بیٹا ہار دیا تھا۔ اپنا سکندر ہار دیا تھا۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ پانچ سالوں کے بعد اب باپ کو ہرا دینے کا کوئی احساس ان پر حاوی نہ ہوتا تھا۔ مری ہوئی ماں کے آنسو بھی یاد نہ آتے تھے۔ اگر کچھ حاوی ہوتا تھا تو پچھتاوے' فکر' اندیشے' غم' دکھ' آنسو' آہیں اگر کچھ یاد آتا تھا تو اپنا بیٹا۔ پانچ سال پہلے بھی یہ پتا چل سکتا تھا کہ سکندر کسی ہسپتال سے فون کر رہا تھا مگر تب تو باپ کو ہرانے کا جنون ان کے سر پر سوار تھا۔ تب اسے ڈھونڈنا کتنا آسان تھا۔ مگر اب سالوں کے بعد؟ اب اتنی بڑی دنیا میں وہ اسے کہاں ڈھونڈیں؟

دیوانگی کے عالم میں انہوں نے سکندر کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا۔ آمنہ سے کسی کانفرنس کا عذر تراش کر وہ امریکہ آگئے تھے۔ زین تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان دنوں دوستوں کے ساتھ یورپ گھومنے گیا ہوا تھا۔ امریکہ آتے ہی وہ سیدھے بالٹی مور کے اسی ہسپتال پہنچے تھے جہاں سے وہ سکندر کی تلاش شروع کرنا چاہتے تھے۔

وہ ورلڈ بینک میں اتنی اونچی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ آج بھی ان کے بہت تعلقات اور بہت اثر و رسوخ تھا۔ سو ہسپتال کے عملے کو انہیں ان کی مطلوبہ معلومات کا ریکارڈ ڈھونڈ کر دینے میں اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے دن' تاریخ اور وقت بتایا تھا۔ کیا سکندر شہریار نام کا کوئی پیشنٹ (مریض) یہاں داخل تھا؟ وہ کس مرض میں مبتلا تھا؟ اس کا کس نوعیت کا علاج کیا جا رہا تھا یہاں پر؟

کمپیوٹر پر کھٹ کھٹ اس لڑکی کے ہاتھ چل رہے تھے۔ وہ پانچ سال پرانا ریکارڈ نکال چکی تھی۔ جنوری کے مہینے کی انہیں تاریخوں کا جو وہ بتا رہے تھے۔

وہ کہہ رہی تھی کہ ہاں سکندر شہریار نام کا ایک پیشنٹ یہاں داخل کیا گیا تھا۔ وہ یہاں ایک ہفتے تک زیر علاج رہا تھا۔

"کیا اس کا کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ؟" انہوں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

پیشہ ورانہ نوعیت کے غیر جذباتی سے انداز میں کمپیوٹر کی طرف دیکھتی وہ لڑکی بتا رہی تھی کہ سکندر شہریار Gang rape کا نشانہ بنا تھا۔ وہ بہت بری طرح زخمی تھا جب یہاں داخل کیا گیا تھا۔ اس کی کمر'

گردن اور بازوؤں پر شدید چوٹیں آئی تھیں' اس کی پسلیاں متاثر ہوئی تھیں' ایک آنکھ بھی متاثر ہوئی تھی بینائی بچ گئی تھی۔ اس کا خون بہت بہہ گیا تھا۔ وہ اگر دیوار کا سہارا نہ لیتے تو نیچے گر پڑتے۔

"بابا پلیز۔ مجھے آکر لے جائیں۔ میں مر جاؤں گا۔ مجھے بچالیں۔" اس انجان لڑکی کے سامنے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

انہیں خود پتا نہیں تھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ وہ لڑکی انہیں ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ چند سیکنڈ بالکل خاموش رہنے کے بعد انہوں نے شکستہ لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

"وہ کس تاریخ کو یہاں سے ڈسچارج ہوا تھا؟" لڑکی نے انہیں تاریخ بتادی تھی۔

"وہ یہاں سے کہاں گیا تھا؟" لڑکی نے معذرت کرنے والے انداز میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"اسے یہاں لے کر کون آیا تھا؟" لڑکی کے پاس ان کے اس سوال کا بھی جواب نہیں تھا اور ان کے ان سوالوں کے جواب صرف ہسپتال کے عملے کے پاس ہی نہیں بلکہ کسی کے بھی پاس نہیں تھے۔

انہوں نے پاگلوں کی طرح جنونی انداز میں' دیوانگی کے ساتھ سکندر کی تلاش شروع کی تھی۔ وہ بوسٹن آ گئے تھے۔ بوسٹن میں' کیمبرج میں' ہارورڈ میں انہوں نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی جہاں سکندر کو نہ ڈھونڈا ہو۔ انہوں نے سکندر کے دوستوں' کلاس فیلوز اساتذہ اور کیمپس میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں اور فون کالز کر کر کے سکندر کے بارے میں پوچھا تھا۔

اس کے کلاس فیلوز' اس کے دوست تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز کر چکے تھے اب کوئی کہیں رہتا تھا کوئی کہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو تو ڈھونڈنا بھی ایک مرحلہ رہا تھا۔ لیکن انہوں نے انہیں کسی نہ کسی طرح ڈھونڈا تھا۔ مگر جواب ہر ایک کے پاس سے یہی مل رہا تھا کہ اس نے سکندر کو پانچ سالوں سے نہیں دیکھا۔ سب یہی بتا رہے تھے انہوں نے سکندر کو پانچ سالوں سے نہیں دیکھا۔

وہ کرسمس کی ان چھٹیوں کے بعد کبھی واپس نہیں آیا تھا۔ نہ بوسٹن' نہ کیمبرج اور نہ ہی کیمپس۔ ہارورڈ گریجویٹ ڈائریکٹری میں نہ تو سکندر کے اپنے بیچ میں نہ ہی اس کے بعد کے کسی بیچ میں اس کا کوئی نام و نشان ملا تھا۔

وہ جتنا ڈھونڈ سکتے تھے انہوں نے ڈھونڈا تھا۔ مگر سکندر کا پتا کہیں نہ چلا تھا۔ وہ امریکہ تھا' کئی ریاستوں پر مشتمل ایک بہت بڑا ملک۔ وہ بغیر کسی اتے پتے کے اتنے بڑے ملک میں اسے کیسے تلاش کرتے اب؟ وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو نوچ نوچ کر بری طرح روئے تھے۔ ناکام اور مایوس وہ پاکستان لوٹ آئے تھے۔ واپس آنے کے بعد ان میں آمنہ سے نگاہیں ملانے کا حوصلہ نہ تھا۔ کیا کہیں وہ آمنہ سے کہ اپنے بیٹے کو اس کی ایک غلطی کی کتنی کڑی سزا دی انہوں نے۔ معاف بھی تو کی جا سکتی تھی سکندر کی وہ ایک غلطی۔

انہیں ہر پل' ہر گھڑی سکندر کا خیال آتا۔ وہ اپنے تمام اثر و رسوخ استعمال کر کے ابھی بھی اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر جیسے جیسے اس کی تلاش میں ناکامی ہو رہی تھی ویسے ویسے یہ خوفناک خیال دل میں ابھر رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سکندر زندہ ہی نہیں؟ یہ خوفناک خیال دل میں آتا تو وہ بلک بلک کر رو پڑتے۔

"نہیں خدایا! میرے گناہ کی اتنی کڑی سزا مجھے مت دینا۔ وہ مجھے زندگی بھر اب کبھی نہ ملے مگر مجھے صرف اتنا پتا چل جائے کہ وہ زندہ ہے۔"

انہوں نے سکندر کو تلاش کرنے کے لیے انٹرنیٹ کے استعمال میں مہارت حاصل کی تھی۔ یہ آج سے تقریباً" ساڑھے چار سال قبل کی بات تھی سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس' دوسری ویب سائٹس وہ ہر جگہ اسے تلاش کر رہے تھے مگر وہاں بھی وہ اسے ڈھونڈ نہیں پا رہے تھے۔

آمنہ کی صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی تھی۔ پیہم کوششوں کے بعد انٹرنیٹ ہی کے ذریعے انہیں میمفس کے اس لاء اسکول کا پتا چلا تھا جہاں کے enrolled اسٹوڈنٹس میں سکندر شہریار ولد شہریار

خان کا نام بھی شامل تھا۔ یہ بھی ان کی خوش نصیبی ہی تھی ورنہ اتنے بڑے ملک کے بہت سارے لاء اسکولز میں اسے ڈھونڈنا مشکل ہی تھا۔ انہیں سکندر پر فخر بھی ہوا تھا اور خود اپنے آپ کو مار ڈالنے کو بھی جی چاہا تھا۔ اپنے ذہین اور قابل بیٹے کو انہوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

خدائی کا دعوا نہیں کیا تھا مگر خود کو سمجھ خدا ہی بیٹھے تھے۔ خود سے وابستہ افراد کی زندگیوں کے بارے میں فیصلے سناتے' جزا و سزا نافذ کرتے انہوں نے کس طرح سکندر اور اس کی ماں پر ظلم کیا تھا۔ وہ فوراً" امریکہ جانے کی تیاری کرنے لگے تھے۔ انہیں سکندر کے پاس میمفس جانا تھا۔

ان کے اس بیٹے نے بہت دکھ اٹھائے تھے۔ وہ اسے گلے لگا کر پیار کرنا چاہتے تھے۔ ٹھیک ہے ہو گئی تھی اس سے کم عمری میں ایک بھول' ایک غلطی۔ وہ اس کی ہر غلطی' ہر بھول معاف کر چکے ہیں۔ اپنی اس ایک غلطی کی بہت سخت سزا کاٹ چکا ہے ان کا بیٹا۔

کاتب تقدیر اس لمحہ ان کی سچائی سے لاعلمی پر تلخی سے مسکرایا ہوگا۔

"تو چلو آؤ شہریار خاں! اب تم سچائی بھی جان ہی لو۔ وہ سچائی جو تمہیں زندہ در گور کر دے گی۔ وہ سچائی جو تمہارے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لے گی۔ تم اعلا ظرف بن کر آٹھ سالوں بعد اسے معاف کرنے چلے ہو؟"

تقدیر نے ان پر ہنستے ہوئے وہ سچ لا کر ان کے سامنے کھڑا کیا تھا جس نے ان کے حواس گم کر دیے تھے۔ یہ بدترین سچائی تقدیر نے انہیں اس صورت بتائی کہ ام مریم کو ایک روز لا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔

تقریباً" ساڑھے چار سال قبل اس روز کیا ہوا تھا؟



وہ امریکہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میمفس اپنے سکندر کے پاس۔ اسے معاف کر دینے کے لیے۔ اسے گلے لگانے کے لیے۔ جب اس روز انہیں اپنے ایک اطالوی دوست سے ملنے کے لیے کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں آنا پڑا۔

یونیورسٹی کے دنوں کا دوست تھا۔ سالوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا کراچی میں قیام مختصر تھا۔ اسے اسی رات اپنی بیٹی کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف نکل جانا تھا کہ وہ باپ بیٹی یہاں کوہ پیمائی کے لیے آئے تھے۔ ہوٹل میں وہ اپنے دوست اور اس کی بیٹی کے ساتھ چلتے ہوئے ان کے suite کی طرف جا رہے تھے جب انہوں نے لفٹ سے نکلتی ایک بے پناہ خوب صورت لڑکی اور اس کے ساتھ ہاشم اسد کو دیکھا۔

ہاشم اسد کے ساتھ ان کی براہ راست کوئی دوستی اور راہ و رسم نہ تھی۔ مگر کراچی کے کاروباری حلقوں میں وہ ایک جانی پہچانی شخصیت تھا۔ ایک ہائی پروفائل شخص جس سے ملنا اور تعلق رکھنا لوگ باعث فخر سمجھا کرتے تھے۔ چند ایک بار وہ کاروباری نوعیت کے ڈنرز' پارٹیز اور کانفرنسوں میں اس سے مل چکے تھے گفتگو کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے' ہاشم اسد شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔

وہ ہاشم کو اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایک اور کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر اس قدر نہ چونکتے اگر وہ اس لڑکی کو پہچانتے نہ ہوتے۔ ساڑھے سات سال طویل عرصہ تھا مگر اتنا طویل بھی نہیں کہ وہ ام مریم کو پہچان نہ پاتے۔ جبکہ اس میں کچھ خاص تبدیلی بھی نہ آئی تھی۔ وہ ویسی ہی سلم' اسمارٹ' حسین اور نازک سی تھی جیسی ساڑھے سات سال قبل تھی۔

ام مریم اور ہاشم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے' کسی رومانٹک کپل کی طرح ایک دوسرے میں گم اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ ام مریم کو ہاشم کے ساتھ دیکھ کر چونکے تھے اس لیے کہ وہ ایک پارٹی میں ہاشم کی بیوی سے بھی مل چکے تھے۔ وہ ام مریم کا لباس دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔

وہ جس ام مریم کو جانتے تھے' وہ بے شک جینز اور

لانگ اسکرٹس پہنا کرتی تھی مگر سیم کی نمائش اس کے کسی بھی انداز سے ظاہر نہ ہوتی تھی جبکہ اس وقت اس نے ریڈ کلر کی شیفون کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سلیولیس اور بیک لیس بلاؤز کے ساتھ۔ اس کے بازو' اس کا گلا' اس کی پوری کمر سب کچھ ساڑھی کے باریک پلو سے چھلک رہا تھا ام مریم اور ہاشم Suite کے دروازے کے سامنے رک چکے تھے۔ ہاشم دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ ابھی ورطہ حیرت ہی میں تھے کہ ان کے اطالوی دوست کی بیٹی ام مریم کو دیکھ کر بے ساختہ حیرت سے بولی۔

"اوہ! سیم یہاں؟" ام مریم اور ہاشم اپنے سوٹ کے اندر جا چکے تھے۔

"سیم؟" انہوں نے حیرت سے اپنے دوست کی بیٹی کو دیکھا۔

"ہاں یہ سیم ہے انکل۔ سامنتا میری کلاس فیلو۔ میلان میں میرے ساتھ اسکول میں ہوتی تھی۔ ہم ہوسٹل میں روم میٹ بھی تھے۔ آپ جانتے ہیں کیا اسے؟" وہ تینوں سوئٹ میں داخل ہو گئے تھے۔

"ہاں! امریکہ میں اس سے ملا تھا چند سال پہلے۔ یہ وہاں پڑھنے آئی ہوئی تھی۔ مگر اس کا نام ام مریم ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی' یہ تمہاری کلاس فیلو نہیں ہوگی۔" وہ اب بھی بے یقین تھے۔

"ہم نے ہائی اسکول تک ایک ساتھ میلان میں پڑھا ہے انکل! میں اسے پہچاننے میں غلطی کر ہی نہیں سکتی۔ بلکہ جب یہ امریکہ سے اپنی اسٹڈیز پوری کیے بغیر اٹلی واپس آگئی تھی تب بھی میں اس سے تین چار مرتبہ ملی ہوں۔ اس کے پاپا پاکستانی ہیں ناں۔ اس لیے ڈوکومینٹس وغیرہ میں اس کا نام ام مریم ہی ہے مگر ہم دوست اسے سیم ہی کہتے تھے۔"

ان کے دوست کی بیٹی کچھ سوچ کر اور یاد کر کے ہنسی تھی۔ وہ اب اپنے باپ کو اپنی اس پرانی دوست کے بارے میں بتانے لگی تھی جسے وہ سیم کہہ رہی تھی اور جسے وہ ام مریم کے نام سے جانتے تھے۔ وہ باپ بیٹی اٹالین تھے اور ان کے ہاں بیٹی کا باپ سے ایسی باتیں کرنا قطعاً "معیوب نہ تھا۔

"پتا ہے ڈیڈ! سیم کا اپنے اسٹیپ فادر (سوتیلے باپ) کے ساتھ بڑا زوردار افیئر تھا۔ اس کے پیرنٹس کی ڈائی ورس (طلاق) ہو گئی تھی۔ سیم اپنی ممی اور اسٹیپ فادر کے ساتھ میلان میں رہتی تھی۔ وہ فرنچ تھے اور بہت مشہور فیشن ڈیزائنر تھے۔ پیسہ بھی ان کے پاس بے تحاشا تھا۔ سیم ان سے خوب قیمتی قیمتی تحفے لیتی تھی اور اسکول میں ہم دوستوں کو دکھا دکھا کر ہمارے دل جلایا کرتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے اس چالیس سال کے مرد کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

اتنی حسین اور کم عمر لڑکی کے آگے اس کے سوتیلے باپ کو پھر سیم کی ممی میں کیا چارم نظر آسکتا تھا۔ سیم کی وجہ سے اس کی ممی کی شادی شدہ زندگی خراب ہو گئی تھی۔ سولہ ساڑھے سولہ سال کی عمر میں سیم پریگننٹ تک ہو گئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ چاہتا تھا کہ سیم ابارشن نہ کروائے کہ آخر ان دونوں نے شادی تو کرنی ہی ہے۔ سیم نے اپنے سوتیلے باپ کو الو بناتے بناتے اس سے شادی کے وعدے تک کر رکھے تھے۔ وہ سیم کے ساتھ بہت سنجیدہ تھا اور سیم ہم دوستوں کے ساتھ اسکول میں بیٹھ کر اپنے سوتیلے باپ کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

وہ کہتی تھی کہ اسے اپنی ماں سے شدید نفرت ہے۔ اس کی ماں کی وجہ سے اس کے ماں باپ کی طلاق ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بدلہ لینے کے لیے' اسے نیچا دکھانے کے لیے اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ افیئر چلا رہی تھی اور پھر اس افیئر کے نتیجے میں اسے بے تحاشا قیمتی تحفے' آسائشیں اور بے حساب پیسہ ملتا ہے مگر اس سب کے باوجود اس کا اس تعلق کو لمبا کھینچنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

ہم سب دوستوں کی نالج میں تھی یہ بات کہ اپنے سوتیلے باپ کی لاکھ منت سماجت کے باوجود بھی سیم ابارشن کروا آئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ اس بات پر بہت ناراض ہوا تھا۔ وہ سیم سے فوراً "شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سیم کی ممی کو فوراً "طلاق دینا چاہتا تھا۔

جب سیم نے دیکھا کہ اس کا سوتیلا باپ زیادہ ہی اس کے گلے پڑ رہا ہے تب ایک رات اس نے شور مچا کر سارے محلے کو اکٹھا کر کے اپنے سوتیلے باپ پر ریپ کا الزام لگا کر اس سے جان چھڑالی تھی۔ تب پھر سیم ہوسٹل آگئی تھی۔ میرے ساتھ وہاں وہ ہوتی تھی۔ ہم روم میٹ تھے۔

سیم کی ممی کو اس کی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی۔ اس کا سوتیلا باپ واقعی اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے عشق میں پاگل ہوتا اس کے پیچھے آتا اور سیم اسے دھتکار دیتی۔ بڑی تیز اور خطرناک لڑکی تھی سیم۔ اسے مردوں کو اپنے پیچھے لگانا اور اپنا دیوانہ بنانا آتا تھا۔

جب تک یہ اٹلی میں تھی' میرا اس سے کبھی کبھار رابطہ ہو جایا کرتا تھا پھر شاید یہ پاکستان آگئی تھی۔ آج بہت عرصے بعد نظر آئی ہے۔ اور لگتا ہے آج تک مردوں کو اپنے پیچھے دیوانہ بنائے پھر رہی ہے۔ ابھی جو ساتھ میں تھا شاید اس کا کوئی نیا شکار ہے۔"

ان کے دوست کی بیٹی ہنس کر بولی تھی۔ ان کا دوست جواب میں کیا بولا تھا' وہ کچھ بھی سن نہیں پائے تھے۔ ان کے کانوں میں تو اپنے بیٹے کی چلا چلا کر سچائی بتاتی آواز گونج رہی تھی۔

"میں بے گناہ ہوں پاپا' یہ لڑکی جھوٹی ہے۔"

"پاپا! میرا یقین کریں۔"

"وہ ایک بد کردار لڑکی ہے۔ زین ایک پیچ لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے جا رہا تھا پاپا۔"

وہ اپنی صفائی دے رہا تھا۔ مگر کون سنتا اس کی وہ سچائی؟ غصے میں اندھے ہو کر انہیں اپنے بیٹے کی کوئی آواز سنائی کب دی تھی؟ پر آج اس کی کہی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔

اس نے آخری وقت تک خود پر لگائے ہر الزام کو جھوٹا کہا تھا۔ عدالت ہی لگائی تھی تو جائے وقوعہ پر ثبوت' گواہ اور نشان دیکھتے۔ وہ ثبوت اور نشان کسی جبر کی کہانی سنا رہے تھے یا کسی بد ترین منصوبے کا راز فاش کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ام مریم اپنے ٹھکرائے جانے کا اس سے بدلہ لے رہی ہے۔ وہ اس کج ڈھکے چھپے لفظوں میں اس لڑکی کی برائی ان سے بیان کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اور اس شام جب وہ پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہونا چاہتے تھے وہ تب بھی ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کتنا پریشان لگ رہا تھا۔ لگتا تھا اسے کوئی بہت ضروری اور سنجیدہ بات انہیں بتانی ہے۔ اس لڑکی کی مکاری' اپنے بیٹے کی معصومیت سب واضح تھا۔

سب کچھ بارہ سال پہلے بھی واضح تھا۔ مگر جو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے ہو جائیں' کان رکھتے ہوئے بھی بہرے ہو جائیں' ان کو سچ نہ نظر آتا ہے نہ سنائی دیتا ہے۔

وہ اس روز دیواروں سے سر مار مار کر روئے تھے۔ دنیا کے کسی باپ نے اپنی اولاد پر ایسا ظلم نہ کیا ہو گا جو انہوں نے اپنے بیٹے پر کیا تھا۔ اس پر ایک ایسے گناہ کا الزام لگایا جو اس سے سرزد ہی نہ ہوا تھا اور پھر ان کے اس ظلم کے نتیجے میں ان کے بیٹے کو اسی سفاکی کا نشانہ بنا دیا گیا جس کا انہوں نے اس پر الزام لگایا تھا۔ Gang rape انہیں بالٹی مور کے ہسپتال کی ملازم اس لڑکی کے الفاظ پھر یاد آئے تھے۔

وہ اب سکندر کا سامنا کیسے کریں۔ اس سے اس کی زندگی' اس کی عزت' آبرو' وقار سب کچھ چھین لینے کے بعد اب وہ اس کے سامنے کس طرح جائیں؟ وہ اسے معاف کرنے اور گلے لگانے جا رہے تھے تب جانا بہت آسان لگ رہا تھا۔ مگر اب؟ اس سے اس کا سب کچھ چھین لینے کے بعد وہ کس منہ سے اس کے سامنے جائیں' اس سے معافی مانگیں اور کیا وہ انہیں معاف کر دے گا؟ وہ انہیں مرتے دم تک معاف نہیں کرے گا۔

وہ جانتے تھے۔ وہ ان ہی کا بیٹا ہے۔ وہ اب رو رو کر بھی فریاد کریں' گڑگڑائیں وہ تب بھی اب کبھی پلٹ کر ان کی دنیا میں واپس نہیں آئے گا۔ غیرت' عزت اور وقار پر جان دینے والے صرف وہی تو نہیں ان کا غیرت مند بیٹا بھی تو ان ہی کا خون ہے۔

انہوں نے اس سے کہا تم میرے لیے مر چکے ہو تو اس نے خود کو ان لوگوں کے لیے واقعی مار ہی ڈالا۔ اس پر جو بھی گزری' جن بھی آزمائشوں کو اس نے سہا مگر پلٹ کر پھر ان کے در پر نہ آیا۔ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں' وہ اب واپس کبھی بھی نہیں آئے گا۔ جب مشکلوں کے دور میں نہیں آیا تو اب جب کہ لاء پڑھ رہا ہے۔ عنقریب تعلیم مکمل کر لے گا' ایک اچھی جگہ ملازمت بھی کر رہا ہے۔ اب کیوں ان کے پاس واپس آئے گا؟

وہ جانتے تھے سکندر ضد' انا اور آن بان میں ان ہی کے اوپر ہے۔ وہ اب مرتے دم تک ان کے گھر کی دہلیز تک پار نہیں کرے گا۔ ام مریم کی سچائی سامنے آنے کے بعد ان کی ساری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ سکندر کا سامنا کرنے کی جرأت وہ اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ وہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔

ان دنوں ان کا حقیقتاً" کئی بار خود کو جان سے مار ڈالنے کو جی چاہا تھا۔ بیٹے پر ایسا ظلم توڑ چکے تھے جس کا اب مداوا بھی ممکن نہ تھا۔ کہاں سے لا کر دیں گے وہ اسے اس کی زندگی کے کھوئے آٹھ سال۔

آٹھ سالوں میں اس کی زندگی میں سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا۔ کیا وہ اسے اس کی شخصیت کا وقار لوٹا سکتے ہیں؟ کیا وہ دوبارہ بیس سال کا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دوبارہ ہارورڈ میں جا سکتا ہے؟ کیا وہ وہاں سے لاء پاس کر سکتا ہے؟ کیا وہ کرسمس کی چھٹیاں واپس آسکتی ہیں؟ کیا ان چھٹیوں کے بعد وہ دوبارہ اپنے کیمپس جا سکتا ہے؟ کیا وہ گھناؤنا داغ اپنے بیٹے کے وجود پر سے مٹا سکتے ہیں؟ ان کے ظلم معمولی نہیں کہ معاف کر دیے جائیں۔

اور آمنہ؟ اس ماں کو وہ کیا کہیں' جو بیٹے کی جدائی کا درد چپ چاپ سہتے سہتے بالکل بستر سے ہی لگ گئی ہے؟

ام مریم اور ہاشم سے ان کے سامنا کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا جب آمنہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ خاصی بیمار تھیں۔ وہ ان کے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے تھے۔ شہر کے بہترین ڈاکٹر کے پاس ان کا علاج ہو رہا تھا۔ بہترین ہسپتال میں ان کے تمام ٹیسٹ کروائے گئے تھے اور پھر ان ہی دنوں ان ٹیسٹ کی رپورٹوں نے یہ بتایا کہ آمنہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہیں۔

ان کے مظالم کی فہرست طویل تھی' ان کے گناہوں کی داستان بڑی سفاک تھی۔ شاید معافی اور توبہ کے در ان کے لیے بند ہونے کو تھے۔

"یا اللہ! آمنہ کو صحت دے دے' اسے زندگی دے دے۔ میں اسے سکندر سے ملا سکوں۔"

انہوں نے آمنہ کے علاج میں خود کو' اپنے آرام سکون' سب کو بھلا دیا تھا۔ کامیاب آپریشن کے بعد بھی آمنہ کی حالت سنبھل نہ رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر نہ جانتا ہو مگر وہ جانتے تھے اس ماں کو کیا چاہیے تھا۔ اس کی دوا کسی ڈاکٹر کے پاس نہ تھی۔ ان سے کسی نے بھی نہیں کہا تھا کہ وہ سکندر کو بلائیں۔ انہوں نے از خود اسے فون کیا تھا۔ اب نہ سکندر سے معافی مانگنے کا منہ تھا نہ اس کی ماں سے۔ مگر اپنے گناہوں میں سے ایک گناہ تو کم کر سکتے ہیں۔ کم از کم وہ اس بیمار ماں کو اس کے بچھڑے بیٹے سے ملوا تو سکتے ہیں۔

فون پر اس کی آواز سنتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ زیادہ کچھ بولتے تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے۔ اسی لیے انہوں نے مختصر سی بات کر کے فون فوراً" بند کر دیا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد وہ کئی گھنٹے روتے رہے تھے اور پھر سکندر ماں سے ملنے پاکستان آگیا تھا۔

وہ اس کا سامنا کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ مگر وہ اسے چھپ کر دیکھنے سے خود کو روک نہ پائے تھے۔ رات میں جب نرس دوبار آمنہ کے کمرے میں گئی تب بھی انہوں نے کمرے کے کھلے دروازے سے خود کو چھپا کر اندر جھانکا تھا۔

اپنے بیٹے کو دیکھا تھا۔ وہ کتنا بدل چکا تھا۔ وہ ان سے اتنے فاصلے پر چلا گیا تھا کہ وہ اسے پکارتے تو وہ ان کی پکار نہ سنتا۔

وہ جانتے تھے۔ وہ ان کا غیرت مند بیٹا ہے۔ اب وہ لاکھ چاہیں' ہزار معافیاں مانگ لیں وہ تب بھی خود کو ان

کی زندگی میں بھی شامل نہ کرے گا۔ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے کہیں بہت شاندار ملازمت دلوانے کی کوشش کریں گے تو وہ ایسی ملازمت کو ٹھوکر مار کر چلا جائے گا۔

انہیں خوف لاحق ہوا تھا کہ اگر وہ سکندر سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے' اس سے ملیں گے' اس کے پاس جائیں گے تو یہ شخص ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ خود کو پھر دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دے گا۔ ان کے خاموشی اختیار کیے رہنے سے اتنا تو ہے ناں کہ اب سکندر اور آمنہ کا رابطہ رہتا ہے۔ انہیں آمنہ کے ذریعے یہ اطمینان حاصل رہتا ہے کہ سکندر خیریت سے ہے' اچھی جگہ پر ملازمت کر رہا ہے' باعزت زندگی گزار رہا ہے۔ اگر اب کی بار انہوں نے اسے کھو دیا تو پتا نہیں پھر کبھی ڈھونڈ بھی پائیں گے یا نہیں۔

وہ بالکل چپ ہو گئے تھے۔ اب اندر ہی اندر گھلنے اور ختم ہونے کی باری ان کی تھی۔ مگر ان کی سزا یہی تھی' ان کی سزا یہی ہونی چاہیے تھی کہ سکندر سے معافی مانگنا تو دور وہ جیتے جی کبھی اس کے سامنے بھی نہ جا سکیں۔ زمین پر خدائی کا دعوا کرنے والے ان جیسے فرعون صفت لوگوں پر توبہ اور معافی کے در یونہی بند ہو جانے چاہئیں

کبھی خود کسی کو اعلا ظرف ہو کر معافی دی تھی جو اب اپنے لیے وسعت قلبی اور ہمدردی چاہتے۔ ان کے بیٹے نے زندگی بھر انہیں معاف نہیں کرنا تھا۔ اس نے زندگی بھر ان سے نفرت کرنی تھی اور یہی شہریار خان کی سزا تھی۔

آمنہ' سکندر کے ساتھ رابطہ میں رہنے پر جوان کی جانب سے غصہ اور مخالفت کی امید کر رہی تھیں' اس خاموشی پر حیران رہ گئیں۔ وہ آمنہ کی حیرانی پر اکیلے میں بہت روئے تھے۔ ان کی بیوی انہیں ویسا ہی تو سمجھ رہی ہے جیسے وہ ہیں جیسے وہ خود کو ساری زندگی ثابت کرتے آئے ہیں۔ سکندر نے لاء کی تعلیم پوری کر لی' اسے دوہا میں بہترین ملازمت اپنے بل بوتے پر مل گئی۔

آمنہ کے ذریعے انہیں سکندر کی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں پتا چل رہا تھا۔ ان کا وہ بیٹا جس میں دنیا تسخیر کر لینے کی صلاحیتیں تھیں۔ اپنی ان صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے کیریر اور پروفیشن میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ کس کی وجہ سے؟ اپنے ابنارمل باپ کی وجہ سے۔ ہاں وہ ایک ابنارمل شخص تھے۔ کبھی کسی نے انہیں یہ لفظ نہیں کہا مگر وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک ابنارمل شخص ہیں اور ان کی ابنارمیلیٹی کا نشانہ ان کی بیوی' زین اور سب سے بڑھ کر سکندر رہا ہے۔

سکندر شادی کر رہا ہے اور آمنہ اسے اس کی ہونے والی بیوی کے ساتھ ملنے کے لیے پاکستان بلا چکی ہیں۔

یہ خبر برسوں بعد انہیں ملنے والی سب سے بڑی خوش خبری تھی۔ بیٹے سے معافی مانگنے کا تو اب بھی حوصلہ نہیں تھا ان میں' مگر ان کی خواہش تھی اس سے اس کی زندگی کی ہر خوشی چھین لینے کے بعد اب اس سب سے بڑی خوشی کے حصول میں وہ اس کے ساتھ کھڑے ہوں۔ ان کے دل میں چھپا ارمان جسے وہ ابھی تک زبان پر لا نہ سکے تھے یہ تھا کہ سکندر کی شادی وہ خود کریں اور بہت دھوم دھام سے اور عالیشان طریقے سے کریں۔

آج فارم ہاؤس کی دعوت انہوں نے اس جانب پہلا قدم اٹھانے کے لیے رکھی تھی۔ وہ جانتے تھے سکندر ان کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا تو انہوں نے فارم ہاؤس کا انتخاب کر لیا تھا۔

وہ چاہتے تھے سکندر کی شادی پورے روایتی مشرقی جوش و خروش کے ساتھ ہو۔ وہ خود سکندر کے لیے لیزا کا ہاتھ مانگنے اس کے باپ کے پاس جائیں۔ وہ بیٹے کی شادی پر اپنے گھر پر چراغاں کریں۔ خود کارڈز تقسیم کریں جس میں ولیمہ کی دعوت ان کی اور آمنہ کی طرف سے دی گئی ہو۔ اس ولیمہ کی دعوت کے میزبان وہ اور آمنہ ہوں اور اس میں وہ اپنے ہر ملنے والے ہر دوست اور تمام عزیزوں کو مدعو کریں۔

فجر کی اذانیں شروع ہو گئی تھیں۔ آج پھر وہ تمام رات جاگتے رہے تھے۔ آج پھر وہ ساری رات سکندر کے ساتھ رہے تھے۔ کاش ان میں اتنی جرأت آسکے کہ وہ اپنے بیٹے سے معافی مانگ سکیں۔ وہ اس سے اعتراف جرم تو کر لیں۔ اپنے سینے پر سے اس بوجھ کی شدت کچھ تو کم کر لیں۔ وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر سے اٹھے تھے۔



وہ سمندر کے کنارے تنہا بیٹھا تھا۔ وہ ساری رات سمندر کے کنارے بیٹھا رہا تھا۔ لیزا کو اس کے بابا کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ اپنے ہوٹل نہیں گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ وہ اسے سی سائڈ لے جائے۔ وہاں پہنچ کر اس نے ڈرائیور کو بھی واپس بھیج دیا تھا کہ اس کا یہاں سے اتنی جلدی واپس کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کا دل بہت اداس اور کرب میں مبتلا تھا۔ شہریار خان اور زین سے بارہ سالوں بعد ملنا ایسا معمولی واقعہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں اے سی آن کر کے پرسکون نیند سو جاتا۔ آج ماں کی خاطر اسے کس کس سے ملنا پڑ گیا تھا۔ کس کس کو دیکھنا پڑ گیا تھا۔

وہ لوگ جن کو وہ جیتے جی دوبارہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جن کے لیے وہ مر چکا تھا ان کے لیے وہ مرا ہوا ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ جلد از جلد پاکستان سے واپس چلا جائے۔ اپنی دنیا میں' اپنی زندگی میں۔ بہت دیر تک وہ ساحل پر ننگے پاؤں چلا تھا۔ بہت دیر تک وہ ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر سمندر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا تھا۔ بس یہ چند دن جلدی سے گزر جائیں اور وہ اور لیزا یہاں سے واپس چلے جائیں۔ واپس جاتے ہی وہ دونوں شادی کر لیں۔

وہ ماضی کو کہیں بہت دور' بہت پیچھے چھوڑ کر لیزا کے ساتھ جلد از جلد نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ اس کا جیب میں پڑا موبائل نجانے کب سے بجے جا رہا تھا۔ اس کا دھیان ہی نہ تھا اس پر۔

ایک اونچی لہر آکر گھٹنوں سے اوپر تک اسے بھگو گئی تب وہ چونک کر اپنے خیالوں سے نکلا۔ تب اسے موبائل پر آئی کال کا احساس ہوا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ لیزا اسے کال کر رہی تھی۔ وہ لڑکی واقعی اس سے سچی محبت کرتی تھی۔ ابھی اس نے اسے سچے دل سے یاد کیا ہی تھا اور اس کی کال آگئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو۔"

"تم کہاں ہو سکندر؟" لیزا کی آواز میں پریشانی سی تھی۔

"میں..... کیوں کیا ہوا؟"

"میں ساری رات تمہیں فون کرتی رہی ہوں۔ تم کال ریسیو نہیں کر رہے تھے تو مجھے اتنی پریشانی ہوئی۔ میں نے پریشان ہو کر تمہارے ہوٹل فون کیا۔ تم سے بات کرنی چاہی تو پتا چلا' تم اپنے روم میں نہیں ہو۔"

اس نے اپنے سامنے بپھرے سمندر کو دیکھا' دور افق پر طلوع ہوتے سورج کو دیکھا۔ صبح ہو گئی؟ پوری رات گزر گئی؟ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"تم کیوں فون کر رہی تھیں؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"آج تم میرے ہر سوال کے جواب میں سوال کیوں کر رہے ہو سکندر؟ میں تمہارے لیے فکر مند تھی' اس لیے تمہیں فون کر رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا' تم اتنے سالوں بعد اپنی فیملی سے ملے ہو' یقیناً "ڈسٹرب ہو گے۔ دکھی ہو گے۔ میں تم سے بات کر کے تمہاری اداسی اور دکھ کم کرنا چاہتی تھی۔" وہ اس کے جواب نہ دینے پر قدرے خفگی سے بولی۔

"تم بہت محبت کرتی ہو مجھ سے لیزا؟" جانتا تھا پھر بھی اس وقت وہ یہ سننا چاہتا تھا کہ وہ چاہا جاتا ہے۔ بے حد اور بے حساب۔

"ہاں!" وہ اس کے سوال پر حیران ہوئے بغیر فوراً" بولی۔

"کتنی؟"

"تم سوچ بھی نہیں سکتے اتنی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"پھر بھی کتنی؟" اب اس کے لبوں پر مدھم سی

مسکراہٹ تھی۔ سمندر، ہوا، صبح، طلوع ہوتا سورج اسے سب اچھے لگ رہے تھے۔ کیونکہ لیزا محمود اس وقت اس کے ساتھ تھی۔

"اتنی کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

"پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"روما چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

"ابھی ساحل پر آسکتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ روانی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتے دیتے اس آخری سوال پر ہاں بولتے ہوئے چونکی

"تم سی سائڈ پر ہو؟"

"ہاں! کیا تم ابھی آرہی ہو میرے پاس؟ ابھی صبح کے چھ بھی نہیں بجے ہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا جو پونے چھ بجا رہی تھی۔

"میں آرہی ہوں سینیور سکندر۔"

اور وہ واقعی اپنے پاپا کے ڈرائیور کے ساتھ آدھے گھنٹے بعد اس کے پاس آگئی تھی۔

وہ دونوں دیوار پر چڑھ کر ساتھ بیٹھ گئے تھے۔

"کیوں بلایا تم نے مجھے اس وقت یہاں پر؟" وہ ہوا سے منہ پر آتے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کر رہی تھی۔

"بس میرا دل چاہ رہا تھا تمہیں اس وقت دیکھنے کو۔ بہت تنہا محسوس کر رہا تھا خود کو۔" وہ آہستگی سے بولا تھا۔

"تم تنہا نہیں ہو سکندر۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" لیزا نے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"بیلا! جلدی سے آجاؤ میری زندگی میں۔ میں بہت تنہا ہوں۔" وہ اداسی بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔



وہ نماز پڑھ کر کافی دیر سے واپس آئے تھے۔ آمنہ لان میں بیٹھی تھیں۔ سر پر نماز کے انداز میں دوپٹہ لیے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ اپنے روزانہ کے معمولات کے وظائف پڑھ رہی تھیں۔ نڈھال سے قدموں سے چلتے ہوئے وہ ان کے پاس آگئے تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھے تھے، نظریں گھاس پر جما رکھی تھیں۔

"آپ رات بھر سوئے نہیں؟ ساری رات اسٹڈی میں گزار دی؟"

"ہاں! بس وہ نیند نہیں آرہی تھی۔" انہوں نے نگاہیں اٹھا کر آمنہ کو دیکھا۔

"آمنہ! میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" کہاں سے لفظ لائیں، کہاں سے؟ کیسے بات شروع کریں؟ وہ مضطرب ہو کر آمنہ کو دیکھ رہے تھے۔

"جی کہیے؟" وہ انہیں قدرے تعجب سے اور کچھ فکر مند نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے ایک سخت مزاج اور سنگ دل شخص سمجھتی ہو۔ میں نے خود کو ہمیشہ ثابت بھی ایسا ہی کیا ہے۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولے۔

وہ سکندر کی دھوم دھام سے شادی خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتے تھے اور یہ بات وہ آمنہ سے کہنا چاہتے تھے۔ کہ صرف وہی تھیں جو شاید سکندر کو اس بات کے لیے آمادہ کر سکتی تھیں سو تمام تر ہمتیں جمع کر کے بات تو انہیں کرنی تھی آمنہ سے۔

"آپ یہ کس طرح کی بات کر رہے ہیں شہریار؟ میں خدانخواستہ آپ کے لیے برا کیوں سوچوں گی؟" وہ اسی فرماں برداری اور عاجزی سے بولیں جس سے ساری زندگی ان سے بات کرتی آئی تھیں۔ وہ بیوی کے تابعدار اور عاجزی بھرے انداز پر زخمی سی ہنسی ہنسے۔

"میں ان بدترین لوگوں میں شامل ہوں جن کی عزت ان کے خوف کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کے دلوں میں کبھی اپنی محبت پیدا نہ کر سکا۔ وہ عمر بھر خوف میں مبتلا رہ کر میری تعظیم و تکریم کرتے رہے۔"

آمنہ دم بخود بالکل ساکت انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"آمنہ! کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ سچ بولنا۔

"بالکل سچ؟" ان کی شریک حیات نے بے اختیار گھبرا کر اپنی نگاہیں جھکائی تھیں۔

یہ کس طرح کا سوال ہے شہریار؟ آپ میرے شوہر ہیں' میرے بچوں کے باپ ہیں۔" انہیں جواب کا منتظر دیکھ کر نگاہیں کتراتے کتراتے ہی وہ آہستگی سے بولیں۔

بے اختیار ایک زخمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی تھی۔ حاصل زیست ہے کیا شہریار خان؟ کوئی ایک بھی رشتہ ایسا نہیں جس کے دل میں اپنی محبت پیدا کروا سکے ہو؟

"نہیں کرتیں تم مجھ سے محبت آمنہ! اور ٹھیک کرتی ہو۔ کیوں کرو گی تم مجھ جیسے ظالم شخص سے محبت؛ میں نے تم پر کتنا بڑا ظلم توڑا تھا۔ تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا تھا۔ تمہیں اس کی شکل دیکھنے' اس کی آواز سننے تک سے ترسا دیا تھا۔"

ان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی' آواز بھرا گئی تھی۔ بیوی کے آگے بھی اپنا دل نہ کھولیں تو آخر کہاں کھولیں گے؟ آمنہ نے جھکا ہوا سر اٹھا کر انہیں تعجب سے دیکھا تھا۔ ان کی بھی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جیسے خود پر ٹوٹا ہر ستم پھر سے یاد آگیا تھا۔

"ایک بار تو ان آنسوؤں کو میرے کندھے پر سر رکھ کر بہا لو آمنہ...! میرے خوف سے چھپ چھپ کر روتی رہی ہو' آج میرے سامنے رو لو۔ مجھ سے لڑو۔ مجھے جو جی میں آتا ہے کہو۔ مجھے میرے باپ کی گالی دو۔ شاید میرے دل میں جلتی ندامت کی آگ کچھ دیر کو کم ہو سکے۔"

بولتے بولتے وہ خود رو پڑے تھے اور انہیں روتا دیکھ کر آمنہ بھی خود کو روک نہ پائی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔

"جب تم بابا کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو تو پھر یہ بھی سمجھ لو' مجھے اتنی رعایت دے دو کہ میرے ایسا ہونے کا سبب وہ تھے۔"

"میں جانتی ہوں شہریار۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"صفیہ آپا نے۔" آمنہ کا جواب انہیں پورا کا پورا ہلا گیا تھا۔

تو باپ کے گناہ کے صرف وہ نہیں' ان کی بہنیں بھی گواہ تھیں؟ وہ تینوں بھائی بہن یہ بات جانتے تھے مگر کبھی زبان پر ایک دوسرے کے سامنے بھی نہ لائے تھے؟

"ہماری شادی کے شروع دن سے آپ کا بے تحاشا سخت رویہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں آپ کو خوش کرنے کے لاکھ جتن کر لیتی مگر آپ پھر بھی خفا ہی لگتے تھے۔ سکندر پیدا ہو گیا' زین پیدا ہو گیا مگر آپ کے رویے کی سختی میں کمی نہ آئی۔ تب ایک روز ہمت ہار کر میں صفیہ آپا کے سامنے رو پڑی تھی۔ مجھے لگتا تھا' آپ مجھے پسند ہی نہیں کرتے۔ شاید آپ کی مجھ سے زبردستی شادی کروائی گئی ہے۔ تب صفیہ آپا نے آپ بھائی بہنوں کے بچپن کی تمام باتیں مجھے بتائی تھیں۔ آپ کے ماضی کو جاننے کے بعد' آپ کی سخت مزاجی کی وجہ سمجھنے کے بعد آپ کے ساتھ زندگی گزارنا کچھ آسان ہوا تھا شہریار! ورنہ میں تو شادی کے ابتدائی سالوں ہی میں ہار مان جاتی۔"

آمنہ آہستگی سے بول رہی تھیں۔ 33 سال' 33 سال اس عورت نے ان جیسے ظالم انسان کے ساتھ گزار دیے تھے۔

"بہت صبر اور بہت برداشت دی ہے اللہ نے تمہیں آمنہ! تم نے مجھ جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزار دی۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا تو پتھروں پر چلنے کے مترادف تھا۔"

شہریار خان نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھامے تھے۔ آمنہ جواباً چپ رہی تھیں۔ چند سیکنڈ وہ دونوں ہی خاموش رہے تھے۔

"اس گھر پر چھایا موت کا سا سناٹا اور دکھوں کے سائے سب میرے لائے ہوئے ہیں آمنہ! میں اپنے عمر بھر کے گناہوں کے کفارے' ان کے ازالے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی بھر تم نے

میرے ہر ناجائز حکم کو سر جھکا کر مانا ہے۔ آج تم سے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک درخواست کر رہا ہوں۔ اسے اپنے گناہ گار شوہر کی التجا سمجھ کر مان لو۔ میں سکندر کی شادی خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا ہوں' ہمارے اسی گھر سے۔ میں چاہتا ہوں لیزا کے والد سے اس کا ہاتھ مانگنے سکندر کے والدین جائیں۔ سکندر کی شادی میں اور تم' ہم دونوں مل کر کریں۔ خوب دھوم دھام سے۔ بہت شاندار انداز میں۔"

انہوں نے حقیقتاً" اپنے دونوں ہاتھ آمنہ کے سامنے جوڑ دیے تھے۔ آج اس ماں کے پاؤں پکڑ کر بھی بیٹھنا پڑ جاتا' وہ بیٹھ جاتے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ پلیز ایسے مت کریں۔" ان کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولتے ہوئے آمنہ زار و قطار رو پڑی تھیں۔

"آمنہ! سکندر کی زندگی برباد کر دی میں نے۔ وہ وقت واپس نہیں لا سکتا۔ مگر آج جب وہ نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہے تو میں چاہتا ہوں' اس کی زندگی کی اس خوشی کو اس کے لیے بھرپور اور یادگار بنا دوں۔ بولو آمنہ! تم اس کام میں میرا ساتھ دو گی؟ میری مدد کرو گی؟" انہوں نے روتے ہوئے بیوی سے پوچھا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں شہریار! میں آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ ان کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھیں۔

انہوں نے آمنہ کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے اپنی اس ہم سفر کے ساتھ نرمی' چاہت اور محبت کا اس انداز میں اظہار کیا تھا۔



وہ دونوں ساحل پر بہت دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ ساحل سے نزدیک ایک عام سے ہوٹل میں بیٹھ کر ان دونوں نے حلوہ پوری کا ناشتہ کیا تھا۔

"میں نے ہمیشہ نینی کے ہاتھ کی بنی حلوہ پوری کھائی ہے۔ مگر گھر کی بنی حلوہ پوری میں اور اس میں بہت فرق ہے یہ زیادہ مزے کی ہے۔" لیزا حلوہ پوری کا مزا لیتے ہوئے بولی تھی۔ اس نے چائے بھی دودھ پتی منگوائی تھی۔ آج بالکل دیسی ہو جانے کو جی کر رہا تھا۔

اس ڈھابے نما ہوٹل پر بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہوئے لیزا نے یہ طے کیا تھا کہ وہ آج شادی کی شاپنگ کریں گے۔ اس کا موڈ ساحل پر بیٹھے بیٹھے لیزا سے باتیں کرنے کے دوران ہی خوشگوار ہو چکا تھا۔ وہ ماضی کی تمام تلخ یادوں سے نکل کر اپنے اس حال میں لوٹ آیا تھا جہاں لیزا محمود اس کے ساتھ تھی۔ اس پر اپنی والہانہ چاہت لٹاتی ہوئی۔ وہ جو اس سے کہہ رہی تھی وہ کر رہا تھا۔ پروگرام وہ بنا رہی تھی۔ عمل وہ کر رہا تھا۔

"بہت Dominating بیوی ثابت ہو گی تم۔" وہ تھوڑا سا انکار کرنے کے بعد لیزا کی شاپنگ کی فرمائش مانتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ضرورت بھی مجھ ہی جیسی کی ہے سینور سکندر! جو تمہارے اس ہر وقت لٹکے ہوئے منہ اور زندگی سے بیزار انداز کو ہنستا مسکراتا بنا سکتی ہو۔" وہ ہنس کر بولی تھی۔

وہ خود برسوں بعد پاکستان آیا تھا اس لیے اچھے عروسی ملبوسات اور شادی بیاہ کے کپڑے وغیرہ کہاں مل سکتے ہیں' یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ان دونوں نے وہیں ڈھابے پر بیٹھے بیٹھے موبائل پر انٹرنیٹ کے ذریعے سرچ کیا تھا۔

"تم مجھے ڈیپ ریڈ کلر کا برائیڈل ڈریس دلواؤ۔ میں تمہاری مرضی کے مطابق بالکل پاکستانی دلہن بننا چاہتی ہوں۔"

وہ دونوں لیزا کے پاپا کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ لیزا اپنے پاپا کو فون کر کے بتا چکی تھی کہ وہ سکندر کے ساتھ ہے۔ تفصیلی ناشتہ کرتے کرتے انہیں ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

ڈرائیور کو لیزا نے بتایا کہ کہاں جانا ہے تو اس نے ان دونوں ہی کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ابھی تو کوئی بازار' کوئی دکانیں' کوئی مارکیٹس' کوئی شاپنگ مالز نہیں کھلے ہوں گے۔ بارہ سے ایک بجے کے درمیان یہاں

شاپنگ سینٹرز کھلتے ہیں۔ وہ دونوں جن ملکوں سے آئے تھے وہاں صبح کا آغاز صبح ہی ہو جایا کرتا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ جس ملک میں دن کا آغاز آدھا دن گزار دینے کے بعد ہوتا ہے وہ ترقی کس طرح کر پائے گا؟

☼ ☼ ☼

ہاشم کسی میٹنگ کے لیے اسلام آباد جا رہا تھا' اس لیے آج اسے آفس نہیں جانا تھا۔ اس کی واپسی کل صبح ہونی تھی۔ وہ آج کچھ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ وہ شاور لے کر نیچے آیا تو مریم کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ اخبار پڑھ رہی تھی۔

"تم آفس نہیں گئیں؟"

"ہاں! موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر سے جاؤں گی۔"

ہاشم اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ مریم نے نیلے رنگ کی جینز کے ساتھ پنک کلر کی لانگ شرٹ پہن رکھی تھی۔ بالکل سادہ لباس' بال کیچو میں لپٹے نہ میک اپ نہ جیولری۔ پھر بھی اس سادہ انداز میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ ہاشم اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" مریم نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں۔ بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

اس نے نخوت سے اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس وقت اس کا موڈ خراب تھا اور فی الحال اسے اپنی تعریفیں بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

"کیا ہوا سویٹ ہارٹ! موڈ کیوں خراب ہے؟ کل رات جب سے ہم تمہارے پاپا کے ہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ تمہارا موڈ خراب ہے۔"

کل رات محمود خالد کے ہاں سے واپس آتے ہی مریم سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اس کا موڈ تھا وہ دونوں تھوڑی دیر جاگتے' باتیں کرتے مگر مریم نے نیند آنے کا کہہ کر سونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

"کیا لیزا کے ساتھ نہ آنے پر اپ سیٹ ہو؟" وہ نرم نگاہوں اور محبت سے اپنی کم عمر اور حسین بیوی کو دیکھ رہا تھا۔

"میں اس کے نہ آنے سے کیوں اپ سیٹ ہوں گی' ساری زندگی اس نے کبھی پاپا کی نہیں سنی۔ میری کوئی بات وہ کیسے مان لے گی۔ پتا نہیں کس کو اٹھا کر لے آئی ہے شادی کرنے کے لیے۔ پاپا اس کی شادی کے فیصلے سے بالکل بھی خوش نہیں ہیں۔" مریم برا مان کر فوراً بولی تھی۔

"مگر مجھے تو وہ بہت خوش لگ رہے تھے۔ اتنی خوشی خوشی وہ لیزا کو شادی کی شاپنگ کرانے کی بات کر رہے تھے۔" مریم نے اس کو خفگی سے دیکھا تھا۔

"صرف تمہارے سامنے اپنی عزت رکھنے کے لیے ہاشم! اب داماد کے سامنے کیا وہ یہ بتاتے کہ وہ اپنی خود سر بیٹی کے شادی کے فیصلے سے ناخوش ہیں؟"

"شادی اپنی مرضی سے کرنا خود سری تو نہیں ہے مریم! تم نے بھی تو مجھ سے اپنی مرضی سے شادی کی تھی؟" وہ قدرے صاف گوئی سے بولا۔

"مگر پاپا کو ناراض کر کے نہیں۔ ان کی اجازت سے' ان کی مرضی سے۔ اور یہ لیزا۔ تمہیں پتا ہے صرف اپنی ضد کی وجہ سے وہ پورے پانچ سالوں سے پاپا سے ملی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ہماری شادی تک پر نہیں آئی تھی۔ پاپا اس کی ضد اور خود سری سے اتنا ڈرتے ہیں کہ اب ڈر کے مارے ہر معاملے میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔" سچی بات یہ تھی کہ اسے مریم کی بہن ہنس مکھ اور پیاری لگی تھی۔ جیسا مریم اسے بتایا کرتی تھی وہ ویسی خود سر اور بد تمیز لگی تو نہیں تھی۔

"لیکن مجھے تو ایسا لگ رہا تھا' انکل لیزا سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا۔ لیزا تم سے زیادہ ان کی لاڈلی ہے۔" مریم کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔

"یہ لاڈ اور محبت نہیں ہاشم! پاپا محض لیزا کی خود سری اور ضد سے خوف زدہ ہیں۔ پاپا کی سب سے زیادہ لاڈلی' سب سے زیادہ چہیتی ہمیشہ میں رہی ہوں۔ پاپا دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔"

مریم ایک دم ہی بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ بہت زیادہ غصے میں آگئی تھی۔ ہاشم جانتا تھا' مریم اپنے باپ سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ وہ یہ سننے کو ہرگز تیار نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کے پاپا اس سے زیادہ کسی اور سے پیار کرتے ہیں۔

"اور تم دنیا میں سب سے زیادہ کس سے پیار کرتی ہو؟" اس نے مسکرا کر شرارت بھرے انداز میں پوچھا۔ وہ نزدیک بیٹھی لگ اتنی پیاری رہی تھی کہ اس وقت کسی اور کی باتیں کرتے رہنے کو دل نہیں چاہا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا۔ اس وقت وہ اور مریم اپنی باتیں کریں بہت ہو گئیں مریم کے پاپا اور بہن کی باتیں۔

"پاپا سے۔" وہ اس کی شرارت سمجھ چکی تھی پھر بھی سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں! ان سے تو کرتی ہو۔ مگر ان کے علاوہ اور کون ہے۔ جس سے تمہیں بہت محبت ہے۔ جس کے بغیر تم رہ نہیں سکتیں؟"

"ہاشم اسد نام کا ایک بندہ ہے۔" اس بار وہ کہتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔

"سیریسلی یہی نام ہے اس شخص کا؟" وہ ہنس کر بولا۔

"جی ہاں یہی نام ہے۔ میں نے پاپا کے بعد صرف تم سے محبت کی ہے ہاشم۔" مریم نے اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا تھا۔ وہ اس کے اس اظہار اور والہانہ انداز پر فدا ہی تو ہو گیا تھا۔

"مجھے بہت فخر کا احساس ہوتا ہے مریم! کہ تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد میں ہوں۔ اٹالین ماں کی تربیت اور ساری زندگی یورپ میں گزارنے کے باوجود تم اندر سے کتنی مشرقی رہیں۔ تمہاری زندگی میں پہلی بار کوئی آیا تو میں۔ بہت سوں نے تمہیں چاہا ہو گا' تمہیں پسند کیا ہو گا مگر جسے تم نے چاہا' جسے تم نے اپنے نزدیک آنے دیا' وہ میں ہوں۔ شادی سے پہلے میں تم سے لاکھ بار اصرار کرتا تھا تب تم میرے ساتھ وقت گزارنے پر راضی ہوتی تھیں اور میرے ساتھ ہوتے ہوئے بعض مرتبہ تم کیسی چپ سی ہو جاتی تھیں۔ تیسے میری ضد پر میرے ساتھ آ تو گئی ہو مگر اس طرح آنے کو غلط بھی سمجھتی ہو۔"

ہاشم جھک کر بہت پیار' بہت چاہت سے مریم کو دیکھ رہا تھا۔

مریم جو واقعی اپنے نام کی طرح مریم تھی۔ بہت ماڈرن ہونے کے باوجود اندر سے بہت روایتی جو اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ اسے زندگی میں صرف ایک ہی بار کسی کا ہو جانا ہے مکمل طور پر۔ وہ جیسے زندگی کے گزرے سالوں میں ملنے والے سب لوگوں کو ٹھکراتی صرف اسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔ جس کی دیوانی ایک دنیا تھی' جسے نہ جانے کون کون چاہتا تھا وہ اسے چاہتی تھی۔ اسے صرف ہاشم اسد نے چھوا تھا۔ صرف اور صرف ہاشم اسد نے۔ وہ مریم کے لیے بڑا پوزیسو تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں راستے میں تھے جب اس کے پاس آمنہ کی کال آئی۔

"السلام علیکم اموجان۔" لیزا اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ مسکراہٹ چہرے پر لیے ماں سے بات کر رہا تھا۔ دوسری طرف آمنہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"کہاں ہو بیٹا اس وقت؟ میرا تم سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"اموجان! میں اور لیزا شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ شاپنگ کے بعد میں آپ سے ....." وہ فوراً ہی شاپنگ کے بعد آج دن یا شام کا کوئی وقت اور جگہ ماں سے ملنے کے لیے طے کر رہا تھا مگر آمنہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

"کس جگہ جا رہے ہو شاپنگ کے لیے؟ میں بھی وہیں آ رہی ہوں۔" وہ ان کی موجودگی چاہتا بھی ہے یا نہیں' یہ پوچھے بنا انہوں نے فوراً اس سے کہا۔

"اموجان! آپ ....." وہ نجانے کیا کہنا چاہتا تھا مگر آمنہ اس کی بات سنے بغیر فوراً بولیں۔

"شادی کی شاپنگ کے لیے جا رہے ہو ناں تم دونوں؟"

”جی۔“

”بس پھر میں بھی وہیں آرہی ہوں۔ تم مجھے جگہ بتاؤ۔“

آمنہ کے اٹل اور فیصلہ کن انداز کے سامنے وہ چپ ہوگیا تھا۔ اس نے انہیں جگہ بتادی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ لیزا اور آمنہ تینوں شاپنگ کے لیے ساتھ تھے۔ لیزا اور آمنہ مل کر کپڑے پسند کررہی تھیں۔ اس کا کام فقط پے منٹ کرنا تھا۔ شادی کے دن کا جوڑا لیزا نے آمنہ سے کہا تھا کہ وہ پسند کریں۔ اسے لیزا پر فخر کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی ماں کو خوشی دینے کے لیے اپنی زندگی کے سب سے اہم دن پر پہنے جانے والا اہم ترین جوڑا انہیں پسند کرنے کو کہہ رہی تھی جسے وہ خود اپنی مرضی اور پسند سے خریدنے کے لیے بے حد پرجوش تھی۔

”تم پر تو ہر رنگ سجتا ہے لیزا۔ تم بتاؤ بیٹا! شادی کے دن کس رنگ کا جوڑا پہننا چاہتی ہو؟“ خوشی سے سرشار آمنہ نے لیزا سے پوچھا۔

”ڈیپ ریڈ۔ (گہرا سرخ)“ لیزا نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

پھر آمنہ ہی نے شادی کے دن کے گہرے سرخ رنگ کا خوب بھاری کام والا غرارہ لیزا کے لیے پسند کیا تھا۔ آمنہ نے ایک اور بھاری کام سے مزین سی گرین شرارہ ان کے ولیمہ کے دن کے لیے پسند کرلیا تھا۔ وہ ماں کو روک نہیں سکا تھا۔ اس کا بڑی سادگی سے شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ کوئی دھوم دھام اور رنگ برنگی تقریبات اسے نہیں چاہیے تھیں جو اس طرح کے جوڑوں کا ڈھیر لگایا جاتا۔

بہرحال وہ ماں کو کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی خودداری اور غیرت مندی کو اس کی ماں سمجھتی ہیں تب ہی انہوں نے لیزا کے لیے اپنے پیسوں سے کچھ بھی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جیسے جانتی تھیں، وہ اپنی ہونے والی بیوی کے لیے خریدی جانے والی اشیاء میں اپنے باپ کا ایک پیسہ شامل کیا جانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ وہ بس پسند کرتی جارہی تھیں عمل وہ پے کررہا تھا۔

”امو جان! آپ اپنے لیے بھی کچھ لیں۔“

وہ آہستگی سے ماں سے بولا۔ آمنہ نے بغیر کسی پس و پیش کے فوراً ہی اپنے لیے ایک خوب صورت ساڑھی پسند کی تھی۔

”میرے بیٹے نے مجھے دلوائی ہے۔ اسے میں تمہاری شادی پر پہنوں گی سکندر۔“

وہ مسکرا کر، خوش ہو کر اس سے بولی تھیں۔ کیا آمنہ ان دونوں کی شادی پر دوبارہ اٹلی آنے کا پروگرام بنا رہی تھیں؟

وہ آج لیزا کے ساتھ بات کر کے شادی کی جگہ اور دن طے کرلینا چاہتا تھا۔ اسے ماں کی بات پر قدرے حیرت سی ہوئی تھی۔ ڈھیر سارے شاپنگ بیگز اٹھائے وہ لوگ شاپنگ مال سے باہر نکلے تو سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

”لنچ ساتھ کرلیتے ہیں کہیں۔ کیا خیال ہے تم دونوں کا؟“ آمنہ ان دونوں سے مخاطب تھیں۔

پہلی بار ماں کو کہیں کھانا کھلانے لے جارہا تھا، اس نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ وہ انہیں کسی بہت اچھے ریسٹورنٹ لے جائے۔

”آپ آرڈر کریں امو جان۔“

اس خوب صورت ریسٹورنٹ میں وہ تینوں ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ محسوس کررہا تھا۔ آج کل کی طرح اس کی ماں کی آنکھیں بات بات پر بھیگ نہیں رہی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ جیسے آج اچانک ہی انہیں کوئی ان ہونی اور بہت بڑی خوشی مل گئی ہو۔

وہ خاصی پرجوش سی رہی تھیں شاپنگ کے دوران بھی۔ کہیں بھی ایک پل کے لیے بھی وہ جذباتی ہو کر روئی نہیں تھیں۔ وہ بہت خوشی خوشی مینو میں سے دیکھ کر ویٹر کو اپنی پسند کی ڈشز آرڈر کررہی تھیں۔

”تمہیں ککنگ آتی ہے لیزا؟“ وہ ماں اور لیزا کی گفتگو کے بیچ خاموش تھا۔ ان کا لنچ سرو کیا جاچکا تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا جبکہ آمنہ لیزا سے باتیں کر رہی تھیں۔

”جی امو جان! آتی ہے۔“

”سکندر کو اٹالین اور پاکستانی کھانے بہت پسند ہیں۔“ بارہ سال پہلے اس نے آخری بار ماں کے ہاتھ کا بنا کھانا کھایا تھا۔ انہیں اس کی پسند ناپسند سب یاد تھی۔ جس طرح اسے یہ یاد تھا کہ ماں کے ہاتھ کی پکی دال بھی کس قدر مزے کی ہوا کرتی تھی۔

”اٹالین تو میں بہت اچھا بنالیتی ہوں۔ پاکستانی سیکھ لوں گی۔“

لیزا کے سعادت مندانہ جواب پر آمنہ کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ہنس پڑا تھا۔ آمنہ نے بے اختیار بیٹے کے ہنستے ہوئے چہرے کو بہت پیار سے دیکھا۔ جیسے دل ہی دل میں دعا کررہی ہوں کہ ان کے بیٹے کے لبوں پر اب یہ ہنسی سدا رہے۔

”تم دونوں نے شادی کے بارے میں کیا ڈیسائڈ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے دن، جگہ وغیرہ۔ تمہارے والد اس بارے میں کیا کہتے ہیں لیزا؟“ آمنہ لیزا سے مخاطب تھیں۔

”ابھی کچھ بھی ڈیسائڈ نہیں کیا امو جان۔ پاپا کو سکندر بہت پسند آیا ہے۔ ہم دونوں جو بھی ڈیسائڈ کریں گے، پاپا اس پر راضی ہوں گے۔“

اسے پتا نہیں کیوں اپنی ماں کی گفتگو کا انداز کچھ مختلف لگا۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہی تھیں، جیسے وہ کچھ پلان کر چکنے کے بعد اس وقت ان دونوں کے ساتھ موجود تھیں اور یہ تمام گفتگو کررہی تھیں اور قصداً لیزا سے کررہی تھیں، اس سے نہیں۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں، یہ وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔

”میں تمہارے والد سے ملنا چاہتی ہوں لیزا۔“ یک دم ہی آمنہ نے لیزا سے کہا۔

وہ تو جو چونکا تھا سو چونکا تھا مگر لیزا بھی انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”ویسے تو تمہارے والد سکندر سے مل چکے ہیں اور اسے پسند بھی کرچکے ہیں۔ انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ مگر میری خواہش ہے میں تمہارے گھر سکندر کا باقاعدہ رشتہ لے کر آؤں۔ وہ جو ہمارا روایتی مشرقی انداز ہے، اس کے مطابق میں ان سے تمہارا رشتہ مانگوں۔ یہ میری بہت بڑی خواہش ہے۔ اگر تم دونوں مجھے اس کی اجازت دو تو یہ میرے لیے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی۔“

وہ لیزا سے مخاطب تھیں اس سے نہیں۔

اسے اپنی ماں کی ذہانت پر رشک آیا۔ پہلے فارم ہاؤس کی دعوت اور اب رشتہ لانے کی بات۔ دونوں بار وہ جانتی تھیں کہ اگر اس سے یہ بات کہی گئی تو وہ صاف انکار کردے گا۔ سو انہوں نے بات کرنے کے لیے لیزا کا انتخاب کیا تھا اور بات ایسے موقعوں پر کی تھی جب وہ تینوں ساتھ تھے۔

لیزا، سکندر کی ناپسندیدگی اور انکار سمجھنے کے باوجود بھی ظاہر تھا، اس کی ماں کو صاف منع کس طرح کر سکتی تھی اور وہ خود اپنی ہونے والی بیوی کے سامنے اپنی ماں کی بات رد کر کے انہیں شرمندہ کس طرح کروا سکتا تھا؟

اس کی امو جان نے دونوں بار بہت تاک کر اور درست موقع پر دونوں باتیں کی تھیں۔ وہ فارم ہاؤس کی دعوت رد نہیں کرپایا تھا اور اب اس وقت بھی بالکل چپ تھا۔ لیزا کشمکش و پنج میں مبتلا ایک نظر اسے اور ایک نظر آمنہ کو دیکھ رہی تھی۔ آمنہ اس کے جواب کی منتظر تھیں، ان کے چہرے پہ حسرتیں اور امیدیں تھیں، ایک التجا سی تھی ان دونوں سے۔

”بتاؤ بیٹا! میں آجاؤں تمہارے گھر؟ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“ انہوں نے رسانیت سے اپنا سوال پھر دہرایا تھا۔

”آپ آجائیں امو جان! جب آپ کا دل چاہے۔“

لیزا کے لیے ہاں اور نہ دونوں کرنا مشکل تھے اور دونوں مشکلوں میں سے اس نے ہاں کرنے والی مشکل کا انتخاب کیا تھا۔

وہ اس کی ماں کو انکار کر کے شرمندہ نہیں کرسکتی تھی۔ آمنہ کو ہاں کہنے کے بعد لیزا نے معذرت طلب

نگاہوں سے اسے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو "میں کیا کرتی۔ تمہاری ماں کو کس طرح انکار کرتی؟"

دل میں وہ ماں کی اس خواہش پر جتنی بھی کوفت اور ناپسندیدگی محسوس کر رہا تھا پر منہ پر تو وہ بھی لیزا کے سامنے ماں کو اس بات کے لیے منع نہیں کر پایا تھا۔

آمنہ یک دم ہی خوشی سے یوں مسکرائی تھیں' یوں سرشار سی ہوئی تھیں گویا کوئی بہت بڑی اور ناممکن نظر آنے والی خوشی پالی ہو۔ انہوں نے بے اختیار لیزا کے ہاتھ کے اوپر گرم جوشی سے اپنے ہاتھ رکھے تھے۔

"بہت شکریہ لیزا! تمہارے گھر سکندر کا رشتہ لا کر میں اپنی بہت بڑی خوشی پوری کروں گی۔ میں کل تمہارے گھر آؤں گی۔"

"اموجان! آپ لنچ یا ڈنر ہمارے ساتھ کیجیے گا۔" لیزا نے مسکرا کر کہا۔ بغیر کسی تکلف کے آمنہ فوراً" بولیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ میں کل لنچ پر تمہارے گھر آؤں گی۔ بس میں اور سکندر ہوں گے۔" آمنہ بے تحاشا خوش تھیں۔ جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

لیزا کن اکھیوں سے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی اور معذرت تھی۔

"آئم سوری سکندر! تم ناراض ہو گئے ہو ناں؟" لنچ کرنے کے بعد آمنہ اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ گھر واپس چلی گئی تھیں جبکہ وہ دونوں لیزا کے پاپا کی گاڑی میں واپس جا رہے تھے۔ لیزا معذرت طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جواباً" چپ رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔ تم اس بات کو کبھی پسند نہیں کر سکتے۔ مگر میں تمہاری اموجان کو کیسے انکار کرتی؟" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ ہار مان لینے والی' تھکی تھکی سی مسکراہٹ۔

"مجھے پتا ہے لیزا! تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی تمہارے پاپا کو انکار کرنے سے ہچکچاتا۔ اموجان کو بھی یہ بات پتا تھی تب ہی وہ آج ہم دونوں سے ملی تھیں۔ وہ گھر سے سب کچھ طے کر کے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آج دراصل مجھ سے بات ہی یہ کرنی تھی اور وہ بھی میرے سامنے۔"

اس کے چہرے پر اداسی بھری مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"تمہیں غصہ آرہا ہے سکندر؟ تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ ہے ناں؟" لیزا فکر اور محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"غصہ نہیں آرہا لیزا' موڈ بھی ٹھیک ہے۔ بس یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔ لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ امی جان کی ایک اور خوشی اگر میری وجہ سے پوری ہو رہی ہے تو ٹھیک ہے۔ چلو ایسا ہی سہی۔"

لیزا سر اثبات میں ہلاتی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی تھی۔



وہ بے چینی سے آمنہ کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنی' وہ کمرے میں بیٹھے نہ رہ سکے۔

وہ فوراً" لاؤنج میں آگئے۔ ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیا جواب دیا ہو گا سکندر نے؟ کہیں انکار نہ کر دیا ہو جیسے کل کنگن لینے سے انکار کیا تھا۔ مگر وہ انکار اس نے ماں کو نہیں' انہیں کیا تھا۔ ماں سے تو وہ بہت پیار کرتا ہے۔ وہ اپنی بیمار ماں کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اتنا تو انہیں یقین تھا۔ خدا کرے آمنہ خوشی کی خبر لائی ہوں۔ آمنہ اندر داخل ہوئی تھیں اور ان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر ہی انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ کامیاب لوٹی ہیں۔ وہ بے اختیار ان کے نزدیک گئے تھے۔

"سکندر مان گیا؟"

"ہاں! دل سے مانا ہے یا نہیں۔ مگر زبان سے اس نے مجھے منع نہیں کیا ہے۔ میں کل لنچ پر جا رہی ہوں لیزا کے گھر۔"

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا تھا۔

"تھینک یو آمنہ! بس اب اللہ جلدی سے یہ خوشی دکھادے کہ ہم دونوں مل کر سکندر کی شادی کریں۔"
زندگی میں پہلی بار وہ میاں بیوی کی طرح' دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے دل کی باتیں شیئر کر رہے تھے۔ پہلی بار کوئی خواب تھا جو وہ دونوں مل کر ایک ہی جتنی امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ پہلی بار کوئی دعا تھی جو وہ دونوں ایک ہی شدت سے مانگ رہے تھے۔

"آمین۔"

"بس اب تم کل لیزا کے والد سے شادی کی تاریخ لے کر آنا۔ میں چاہتا ہوں مہندی' شادی' ولیمہ سکندر کی شادی کی ہر تقریب یادگار ہو۔ لوگ سالہا سال اس شادی کو یاد رکھیں۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا شہریار!"

وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس خوشی کو شیئر کر رہے تھے انہیں لاؤنج کے دروازے پر کھڑے زین کے نہ تو آنے کا پتا چلا تھا نہ وہاں رکنے کا اور نہ ہی وہاں سے چلے جانے کا۔

☆ ☆ ☆

وہ اسٹڈی میں تھے۔ وہ شادی کے ڈیزائنر کارڈز کے کچھ ڈیزائن گھر منگوانا چاہتے تھے۔ اسی کے لیے وہ چند ایک فون کالز کر رہے تھے جب زین اسٹڈی میں ان کے پاس آیا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا' وہ ان سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہے ورنہ انہیں فون پر بات کرتا دیکھ کر وہ لوٹ جاتا۔

"آپ کل صبح تک بھجوا دیں۔ مجھے سمپلز۔" انہوں نے فون پر گفتگو مختصر کی تھی "ٹھیک ہے بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔"

"کیا ہوا زین؟" فون بند کرتے ہوئے انہوں نے زین سے پوچھا۔ زین کے چہرے پر ناراضی تھی۔

"یہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے پاپا؟"

"کیا ہو رہا ہے؟" انہوں نے تعجب سے زین کے غصے بھرے چہرے کو دیکھا۔

"سکندر کی شادی کی تیاریاں۔ آپ امو جان کی خاطر اس سے مل لیے ٹھیک کیا۔ مگر اس کی شادی کی اس طرح تیاریاں۔ دس از ٹو مچ۔ اگر یہاں اس گھر میں وہ آیا' اس کی شادی یہاں پر ہوئی تو اتنے دنوں کے لیے میں اپنے بیوی' بچے کو لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔" انہوں نے غصے سے بولتے زین کو دیکھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

"تمہیں جہاں جانا ہے چلے جاؤ زین! مگر سکندر کی شادی میں اور آمنہ مل کر ہی کریں گے۔ یہ گھر صرف تمہارا نہیں' سکندر کا بھی ہے۔ بلکہ اس گھر پر' مجھ پر' آمنہ پر' ہماری ہر چیز پر سکندر کا حق تم سے زیادہ ہے۔ ملا کیا میرے اس بیٹے کو مجھ سے؟ سوائے دکھوں اور تکلیفوں کے؟"

انہوں نے سخت لہجے میں جواب دینا شروع کیا تھا مگر جملے کے آخر تک آتے آتے ان کا لہجہ دکھوں اور پچھتاووں سے بھر گیا تھا۔

"اسے جو ملا' وہ اسی لائق تھا۔" زین نفرت سے بولا۔

"اچھا؟" زین کے نفرت بھرے انداز پر وہ تسلی سے مسکرائے تھے۔ زین نے اس بار جیسے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا۔ جیسے ان کا انداز سمجھ نہ پایا ہو۔

"بے خبری بہت بڑی نعمت ہے زین! جس بھائی سے آج بھی دل میں نفرت لیے بیٹھے ہو' اگر میں تمہیں سچائی بتا دوں تو زندگی بھر خود اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا پاؤ گے۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائے تھے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ زین ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہنوز سکندر کے لیے نفرت تھی۔ بھائی کی بھائی سے اس درجہ نفرت کی بنیاد کہاں رکھی گئی تھی؟ کس نے رکھوائی تھی یہ بنیاد؟ زین کی آنکھوں میں سکندر کے لیے نفرت دیکھتے ہوئے ان کا دل چاہا وہ چیخیں مار مار کر روئیں' خود کو اپنے وجود کو مٹا ڈالیں۔

"میں ساڑھے چار سالوں سے ایک احساس گناہ' شرم اور ندامت کو ساتھ لیے زندگی گزار رہا ہوں زین!

...ہیں اس ندامت اور گناہ کے احساس سے بچانا چاہتا ...ورنہ ساڑھے چار سال پہلے ہی تمہیں ساری ...ئی بتا دیتا اور شاید تمہیں نہ بتانا میری غلطی تھی۔ ...مجھے اس بد کردار لڑکی کی حقیقت تمہیں ضرور بتا دینی تھی جسے تم نے بارہ سال پہلے اپنی شریک ...ہیے ...ت بنانے کے لیے چنا تھا۔ پھر کل فارم ہاؤس پر تم ...ئی کے لیے چہرے پر نفرت لیے کھانے کی میز پر اس ...کے سامنے نہ بیٹھتے۔ تم اسے دیکھتے ہی اس کے سامنے ...معافی مانگنے کے لیے ہاتھ جوڑ دیتے۔ رو رو کر اپنے اس ...بھائی سے معافی مانگتے جس سے کل تم نے سلام دعا ...کرنی تک گوارا نہ کی تھی۔"

وہ زین کی طرف دیکھ رہے تھے جو حیرت زدہ سا ...نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے ان کی کوئی بھی بات سمجھ ...نہیں پایا تھا۔

"کیا جانتے ہو تم ام مریم کے بارے میں زین؟ ابھی ...میں تمہیں اس کی سچائی بتا دوں تو تم شرم سے خود اپنے ...آپ سے نظریں نہ ملا پاؤ گے کہ اس بد کردار لڑکی سے ...شادی کے خواہش مند تھے۔ اس کے رچائے ...ڈرامے کا یقین کر کے تم نے اپنے بڑے بھائی پر ہاتھ ...اٹھایا تھا' اس کو گالیاں دی تھیں؟ اس سے زندگی بھر ...کے لیے قطع تعلق کر لیا تھا اور آج تک اسی لڑکی کے ...بہکائے اس جھوٹ کو سچ مان کر اپنے بھائی کی شکل تک ...سے نفرت کرتے ہو۔"

بولتے ہوئے جذبات کی شدت میں آ کر ان کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ وہ زین کو غصے سے دیکھ رہے تھے۔ زین اب بالکل چپ تھا۔

"سکندر' ام مریم کے بارے میں بالکل سچ کہتا تھا زین! وہ لڑکی طوائفوں سے بھی بدتر تھی۔ جب وہ ...تمہیں لاس اینجلس میں ملی تھی تو نہ کنواری تھی نہ ...باکردار نہ حیادار دوشیزہ جو تم نے اسے سمجھا تھا' میں نے ...اور آمنہ نے اسے سمجھا تھا۔ وہ تمہیں کیا مجھ جیسے دنیا ...دیکھے' ذہین اور تجربہ کار آدمی تک کو بے وقوف بنا گئی ...یہ اتنی چالاک اور مکار تھی وہ۔"

جذبات کی شدت ان پر غالب تھی۔ بولتے ہوئے

انہیں سانس لینے' جذبات کو قابو کرنے کو پل بھر کو رکنا پڑا تھا۔ زین بالکل ساکت کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

"ام مریم کا بدکاری سے بھرا ماضی مجھے کسی اور نے نہیں' اس کی ایک پرانی سہیلی نے بتایا تھا۔ ام مریم اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر کے ساڑھے سولہ سال کی عمر میں پریگننٹ تک ہو چکی تھی' اپنا بچہ ضائع بھی کرا چکی تھی اور اس افیئر کے نتیجے میں اپنی ماں کو طلاق بھی دلوا چکی تھی۔ یہ اس کا وہ افیئر ہے جو میں جانتا ہوں۔ تم سے ملنے سے قبل اس کے اور کس کس سے تعلق رہے ہوں گے' وہ میں نہیں جانتا۔ مگر اب جس امیر بزنس مین سے شادی کر کے وہ کراچی ہی میں رہ رہی ہے' اس سے نکاح کرنے سے قبل اس کے ساتھ ہوٹلوں میں جا جا کر راتیں گزارا کرتی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں اس بات کا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ہاشم اسد کے ساتھ ہوٹل کے روم میں بانہوں میں بانہیں ڈال کر جاتے دیکھا ہے۔ اس کے عشق میں پاگل ہو کر ہاشم اسد نے اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا۔ اپنی بیوی اور تین بچوں کو چھوڑ دیا۔ میری باتوں کی تصدیق چاہتے ہو تو جا کر اس مظلوم عورت سے' ہاشم اسد کی پہلی بیوی سے اس ناگن کی سچائی جان لو۔ اپنی سگی ماں کا گھر ام مریم نے اجاڑا' تین بچوں کے باپ کا گھر اس نے خراب کروایا۔ ہمارے گھر کی خوشیاں اس نے اجاڑیں۔ یہ تین گھر تو وہ ہو گئے جن کا مجھے پتا ہے' مزید نجانے کتنے گھر اور کتنے لوگوں کو اس ڈائن نے تباہ و برباد کیا ہو گا۔ میں نہیں جانتا۔"

غصے کی شدت سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ان کی آواز بلند تھی۔ زین جیسے سب کچھ کہنا سننا بھول گیا تھا۔ وہ آنکھوں میں حیرت' بے یقینی اور سکتہ لیے ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا۔

"تم سے منگنی کروانے کے بعد اس کا سکندر پر دل آ گیا تھا۔ وہ تو تھی ہی نیچ۔ سکندر کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ مگر میرے غیرت مند اور باکردار بیٹے کو رشتوں کی حرمت کا پاس تھا۔ اس نے ام مریم کی پیش قدمی کو ٹھکرایا' اسے رد کیا تو ریجیکٹ کیے جانے کا انتقام لینے کے لیے اس نے سارا سین کری ایٹ کیا تھا۔ اس ہوشیاری کے ساتھ کہ اس پر سچ کا گمان ہو۔ یاد کرو زین! جب تم سکندر پر ہاتھ اٹھا رہے تھے تب وہ چلا چلا کر تم سے کیا کہہ رہا تھا؟ وہ تمہیں اور مجھے ام مریم کی سچائی بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہم جو اس کے سب سے زیادہ اپنے تھے ہمارے لیے سکندر سے زیادہ قابل اعتبار وہ بدکردار لڑکی ٹھہری تھی جسے ہم سے ملے فقط کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ جس کا ماضی بھی ہم نہیں جانتے تھے۔"

شہریار خان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ ان کی آواز رندھ گئی تھی۔

"ساڑھے چار سالوں سے گناہ کے بوجھ تلے دبا زندگی گزار رہا ہوں میں۔ زین! وہ میرا بے قصور اور معصوم بیٹا بغیر کسی خطا کے عمر بھر سزا کاٹتا رہا ہے۔ میں تو آج اس سے معافی مانگنے کے بھی قابل نہیں پاتا خود کو۔"

وہ آج صبح آمنہ کے سامنے روئے تھے اور اب زین کے سامنے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ بیٹے کی بربادی' اس کی پامالی پر ان کا جی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ زین کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ مردہ انداز میں پلٹا تھا۔

وہ عجیب شکستہ قدموں سے چلتا اسٹڈی سے جا رہا تھا۔ لگتا تھا کسی بھی پل گر پڑے گا۔ ابھی تو انہوں نے زین کو وہ سب سے بڑی بات نہیں بتائی جس کے واقف صرف وہ' سکندر اور اللہ ہے۔ زین کی نفرتوں اور ان کے پاگل پن نے گھر سے نکالے جانے کے بعد سکندر کو کس حال تک پہنچا دیا تھا۔ اس کا مردانہ وقار' اس کی عزت و آبرو کس طرح پامال کی گئی تھی۔ بتا دیں تو زین شاید خود کو جان سے ہی مار ڈالے۔

یہ انتہائی حد تک تکلیف دیتی اور رلاتی سچائی وہ نہ تو کبھی آمنہ کو بتانا چاہتے تھے نہ زین کو۔ اپنے سکندر کی عزت اور اس کا وقار انہیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیارا تھا۔ وہ اسٹڈی میں اکیلے بیٹھے سکندر کے اس دکھ پر اس کے وقار کی پامالی پر پھر سے رو پڑے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عتیقہ محمد بیگ



"پھوپھو.... ! یہ کیا.... آپ باورچی خانے میں ہیں...." ارم باورچی خانے میں آکر اسے گھورتے ہوئے لاڈ سے بولی۔

"بس.... برتن دھونے ہی رہ گئے تھے۔" اس نے ہونٹوں پر بمشکل مسکراہٹ سجا کر پلیٹ دھوتے دھوتے جواب دیا۔

ارم نے رخسانہ کا بازو تھام لیا اور اسے سنک سے دور کیا اور خود برتن دھونے لگی۔ وہ کل سے بخار میں تپ رہی تھی مگر اس کے باوجود ہر کام حسب معمول کرتی چلی جا رہی تھی۔

"نہیں.... نہیں ارم! میں کر لیتی ہوں۔ تمہاری پڑھائی میں حرج ہو گا۔" وہ پیار سے بولی.... حالانکہ اس کے سر میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔

"پھوپھو! میرے کون سے ایگزام سر پر ہیں۔" اس نے پلیٹ دھوتے دھوتے مسکرا کر جواب دیا۔

"بھابھی غصے ہوں گی۔" اس نے اپنے اندر کا خوف ظاہر کیا۔

"اماں کب آپ پر غصہ نہیں ہوتیں؟" وہ ہنستے ہنستے بولی۔

"شرم کرو.... تمہاری ماں ہیں۔" رخسانہ نے اسے ڈانٹا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"میں تو سچ کا ساتھ دوں گی۔" اس نے تیزی سے برتن دھونے شروع کر دیے۔ رخسانہ نے شفقت سے اس کے گال پر پیار کیا اور پھر چپکے سے اپنے بستر پر آکر آرام کرنے لگی.... مگر بستر پر آکر بھی اس کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں.... کہ جیسے ابھی دروازہ کھلے گا.... اور بانو بھابھی اسے ہزار باتیں سنا جائیں گی۔ اپنی ذہنی کیفیت پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔

یہ وہی گھر تھا.... یہاں ہر کوئی اسے پیار کرتا تھا۔ رحیم اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ مگر بانو نے شادی کے بعد رخسانہ کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی۔

بانو مزاج کی تیز تھی۔ رخسانہ مڈل میں تھی۔ مگر بانو نے اس کی پڑھائی چھڑا دی اور گھر پر یوں قبضہ جمایا کہ پھر رخسانہ کھانے پینے کی چیزیں بھی اس سے پوچھ کر ہی لیتی تھی۔ وہ گھر کے کاموں کے لیے بانو کی خاص ملازمہ بن گئی۔

رخسانہ کو اللہ نے چاند سی بھتیجی دی جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے کندھے تک آپہنچی۔ رخسانہ اور ارم کو کوئی بھی دیکھتا تو انہیں بہنیں ہی سمجھتا اس پر بانو جل کر راکھ ہو جاتی۔ ماں بیٹی کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بانو جتنے زخم دیتی۔ ارم فوراً" ان پر اپنے خلوص کا مرہم لگا دیتی۔

گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ابھی اپنے کمرے میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹی ہی تھی کہ بانو اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

"اللہ نے تمہاری قسمت بہت اچھی لکھی ہے.... جو ہر وقت بستر پر پڑی رہتی ہو۔" بانو نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ بانو کے اچانک حملے پر بوکھلا سی گئی۔

نہیں بھابھی.... میں لوا دی.... " اس سے پہلے وہ مکمل کرتی' بانو پاؤں پٹخ کر کمرے سے باہر نکلتے برتن دھونے کا کہہ گئی۔ وہ منہ لٹکائے دیکھتی رہ گئی مگر اس کی پیاری بھتیجی نے پھر اسے آرام کرنے نہ دیا۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی وہ خود بھی نہ جان پائی۔

پھر اس کی آنکھ بانو کی آواز پر کھلی۔ بانو غصے میں زور زور سے بول رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بستر چھوڑا' دوپٹا سنبھالا اور چپل پہن کر فوراً" کچن کی طرف دوڑی۔

"لو جی! نام لیا.... شیطان حاضر۔" بانو نے رخسانہ کو دیکھ کر طنزیہ جملہ پھینکا۔ ارم گھبرا گئی۔

"اماں! سچ میں نے اپنی مرضی سے دال چاول بنائے ہیں۔ پھوپھو کو کچھ نہیں پتا۔" ارم نے جھٹ صفائی پیش کی۔

"اف! میں اتنی دیر تک سوتی رہی۔" اس نے



آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔
"بھابھی! آپ مجھے ڈانٹ لیجئے۔ ارم بے قصور ہے ۔وہ.... میری آنکھ لگ گئی تھی۔" اس نے خود کو مجرم بنا کر معافی مانگی۔

بانو نے خفا ہو کر کہا۔ "اب اتنی معصوم مت بنو .... اور میری بیٹی کو میرے خلاف کرنے کی ضرورت نہیں .... اس کے سامنے خود کو مظلوم اور مجھے ظالم بنا کر اس کے دل میں میرے لیے نفرت پیدا کر رہی ہو .... میری بیٹی تمہاری ملازمہ نہیں .... جو اپنا کام تم اس پر تھوپ دو۔"

اس نے غصے سے ارم کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کمرے میں گھسیٹ کر لے گئی۔ ارم، رخسانہ کی حمایت میں بولتی رہ گئی، مگر بانو نے کچھ نہ سنا۔ رخسانہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے باورچی خانے کی طرف قدم بڑھا دیے۔



"عذاب ہے عذاب .... پتا نہیں، کیسے اس لڑکی سے جان چھوٹے گی .... احمد، ارم کا تب سوچے گا .... جب اس کی بہن بیاہ کر گھر سے جائے گی۔" بانو فکر مندی سے بولی۔ روحی، ارم کے لیے ایک امیر گھرانے کا رشتہ لے کر آئی تھی۔ روحی اس کی پڑوسن تھی اور بانو کی ہم مزاج تھی۔ اسی وجہ سے ان دونوں میں گہری دوستی تھی۔

"اس میں کیا مشکل ہے.... کسی بھی بڈھے سے بیاہ دو.... جہیز دینے سے بھی جان چھوٹے گی.... اور ہاں! زیادہ دیر مت کرنا، ورنہ تمہاری بیٹی ارم کا مستقبل تاریکی میں جا ڈوبے گا .... احتشام صاحب کا خاندان خاصا خوش حال ہے .... ارم کی شادی اس گھر میں ہو گئی تو ارم راج کرے گی، راج۔" روحی نے ان لوگوں کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ بانو نے حیرت سے پوچھا۔

"اتنے امیر لوگ ہیں .... پھر ہم غریبوں کی بیٹی لینے پر کیسے آمادہ ہو گئے؟"

"او ہو بانو! میں نے ارم کی تصویر انہیں دکھائی تھی۔ انہیں ارم بہت پسند آئی ہے۔ تو بس احمد بھائی سے بات چیت کرو پھر میں انہیں تمہارے گھر لے کر آؤں گی۔" روحی نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"احمد انکار کر دیں گے ..... پچھلی دفعہ بھی میرے عزیزوں میں سے ارم کے لیے رشتہ آیا تھا، مگر احمد سخت خفا ہو گئے کہ رخسانہ سے پہلے وہ ارم کا سوچ بھی نہیں سکتے۔" بانو نے منہ بسور کر بتایا۔

"اگر ایسا ہوتا رہا تو تمہاری بیٹی بھی رخسانہ کی عمر تک جا پہنچے گی۔" روحی نے اسے ڈرایا۔

"یہ رخسانہ تو میرے لیے عذاب بن کر رہ گئی ہے کوئی بڈھا بھی نہیں مل رہا کہ میں اس سے شادی کر کے اپنی جان چھڑاؤں .... چھتیس سال کی ہو رہی ہے، مگر پھر بھی احمد اس کی شادی کا خواب سجائے بیٹھے ہیں۔" بانو نے غصہ سے سر جھٹکا۔

روحی کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی۔ پھر بانو کے تھوڑا قریب ہو کر ہلکی آواز میں بولی۔

"وہ ہاجرہ ہے ناں.... جو ہمارے محلے کی تیسری گلی میں رہتی تھی۔" روحی نے بات ادھوری چھوڑ کر بانو کی طرف دیکھا۔

"ہاں، ہاں! او ہی ناں، جو اب کہیں اچھے علاقے میں جا بسی ہے۔ سنا تھا اس کا پرائز بانڈ نکلا تھا۔"

"ہاں .... بالکل .... وہی ہاجرہ .... اس کا کوئی بانڈ وغیرہ نہیں نکلا تھا۔" روحی نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر اس کے پاس پیسہ کہاں سے آیا تھا؟" بانو نے منہ میں انگلی دبا کر حیرت ظاہر کی۔

"یاد ہے .... اس کے شوہر کی پہلی بیوی سے ایک بیٹی تھی۔ اس نے بس اس سے فائدہ اٹھا لیا۔" روحی نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کیسا فائدہ....؟" بانو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"اس نے وہ لڑکی فروخت کر دی تھی۔" روحی نے بہت آہستگی سے بتایا۔ بانو حیرت اور خوف سے اسے دیکھے گئی۔

"ہاں...." روحی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"رخسانہ تمہارے لیے عذاب ہے.... اس کی وجہ

سے تم اپنی بیٹی کی خوشیاں نہیں دیکھ سکتیں... تو تم بھی ہاجرہ کی طرح۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں... نہیں۔" بانو بدک گئی۔ روحی شرمندہ سی ہو گئی اور نظریں چرا کر بولی۔

"بس! میں نے تو تمہارا سوچا۔۔۔ ارم کا اور احمد بھائی کا۔ تم خود سوچو! احمد بھائی درزی کے کام میں کتنا کما پاتے ہیں... گھر کا خرچ ہی بمشکل پورا ہوتا ہے۔ تمہارا کوئی بیٹا بھی نہیں، جو باپ کا بوجھ بانٹ لے۔ وقت گزرنے کے ساتھ بڑھاپے میں احمد بھائی سے کام نہیں ہو گا۔ میری کوئی ایسی نند ہوتی جو میری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ ہوتی... تو میں تو ہاجرہ کی طرح ہی کرتی۔" پھر روحی تو چلی گئی، مگر اسے دولت کا خواب دے کر بے چین کر گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ رات کو بستر پر ابھی لیٹی تھی کہ احمد نے سلائی مشین سنبھال لی۔

"کیا ہوا؟ آپ اس وقت کپڑے سی رہے ہیں۔" اس نے فکرمندی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ رات کے بارہ بجا رہی تھی۔

احمد نے تھیلے سے کپڑا نکالا اور فکرمندی سے بولا۔

"بجلی اور گیس کا بل دینا ہے۔ مگر جیب میں ایک پیسہ نہیں ہے... میں نے سوچا کہ یہ دو سوٹ تیار کر لوں۔ کل گاہک کو دوں گا تو وہ پیسے دے دے گا۔" احمد نے یہ کہہ کر مشین چلا دی۔

"رخسانہ کے لیے دوائی لانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ خفگی سے بولی۔

"رخسانہ بھی تو اس گھر کا فرد ہے۔ جب تم بیمار پڑتی ہو تو تمہارے لیے دوائی نہیں لاتا کیا؟" احمد کو غصہ آ گیا

"مگر آپ کے سر میں درد تھا۔" وہ منمنائی۔

"ہاں! ہے تو... ؟ کیا کر سکتا ہوں... اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں کہ کوئی اچھی جاب کر کے تمہیں ساری خوشیاں دوں... میں تو خود پل پل اس گھر کے متعلق سوچتا رہتا ہوں... ہمارے پاس تھوڑا بہت پیسہ بھی جمع نہیں... رخسانہ اور ارم کے بیاہ بھی کرنے ہیں۔ یہ سارا خرچ کہاں سے آئے گا۔" وہ فکروں میں ڈوب گیا۔ بانو کے ذہن میں روحی کی باتیں گونجنے لگیں۔

"اپنی خوشیوں کو دیکھو۔ تمہارا کوئی بیٹا بھی نہیں جو مستقبل میں اپنے باپ کے کندھے کا بوجھ سنبھال سکے۔"

اور پھر ساری رات وہ کروٹیں بدلتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"پھوپھو! آپ کی شادی پر میں ساڑھی پہنوں گی۔" ارم نے دوپٹے کو ساڑھی کی طرح اپنے اردگرد لپیٹ کر چلتے ہوئے کہا تھا۔

"سنبھل کر! گر جاؤ گی۔" رخسانہ نے چاول چنتے چنتے اس پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

"پھوپھو! کبھی آپ بھی ساڑھی باندھیں ناں... آپ پر تو ساڑھی بہت جچے گی۔ آپ تو مجھ سے بھی زیادہ اسمارٹ اور خوب صورت لگتی ہیں۔ میری سہیلیاں اکثر دھوکے میں آ جاتی ہیں۔ پوچھتی ہیں یہ تمہاری چھوٹی بہن ہے؟" اس نے قہقہہ لگایا۔

"جھوٹی کہیں کی!" رخسانہ نے لاڈ سے اسے گھورا پھر چاول کی پرات اٹھائی اور کمرے سے باہر نکلنے لگی۔

ارم نے لپک کر رخسانہ کا بازو پکڑنا چاہا مگر اس کی ٹانگوں کا توازن برقرار نہ رہ سکا۔ وہ رخسانہ کے اوپر جا گری۔ ساتھ ہی ساتھ چاول کی پرات بھی صحن میں جا گری۔ سارے چاول صحن میں بکھر گئے۔ بانو صحن میں اپنے بالوں پر تیل لگا رہی تھی۔ پرات کی آواز پر بوکھلا سی گئی۔ چاولوں پر نظر پڑی تو وہ چیخ اٹھی۔

"اری رخسانہ! کم بخت! اتنے مہنگے چاول گرا دیے۔"

ارم گھبرا گئی اور رخسانہ کی تو ٹانگیں باقاعدہ کانپنے لگیں کہ اب تو بھابھی اس کی جان عذاب میں کر دیں گی۔

بانو تو رات ہی سے رخسانہ پر غصہ تھی۔ اس نے رخسانہ کو طمانچہ جڑ دیا۔ رخسانہ سہم سی گئی۔ بانو نے پھر ہاتھ اٹھایا تو ارم سامنے آ گئی۔

"اماں! میری وجہ سے پھوپھو سے پرات چھوٹی... وہ میں ہی پھوپھو کی شادی میں ساڑھی پہننے کا سوچ رہی تھی۔"

"پھوپھو کی شادی؟" بانو نے طنزیہ انداز میں دہرایا اور پھر غصے سے وہاں چلی گئی۔ مگر منہ میں بڑبڑاتی رہی۔

☆ ☆ ☆

بانو نے دوپہر میں ہی بچہ بھیج کر روحی کو گھر بلوا لیا۔ روحی آئی تو وہ سیدھا اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور کمرے کی کنڈی چڑھا دی۔

"کیا بات ہے؟" روحی گھبرا گئی۔

"وہ میں ہاجرہ کی طرح۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور روحی کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا تو اس کام میں میرا ساتھ دے گی؟"

"ہاں! کیوں نہیں۔" روحی کی آنکھیں اس کمیشن کے تصور سے چمک اٹھیں جو اس کام میں اسے ملنا تھا۔

"ہاجرہ سے کل ہی ملنے چلتے ہیں۔" روحی نے پھر آہستگی سے کہا۔

"وہ ہمارا ساتھ دے گی؟" بانو کو تشویش ہوئی۔

"ہاں... کیوں نہیں۔ اسے بھی تھوڑا حصہ دے دیں گے... پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔" روحی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں!... مگر احمد کو پتا چل گیا تو؟" بانو کو یک دم احمد کا خیال آیا۔

"اوہو... نہیں پتا چلے گا... وہ لوگ اسے اغوا کریں گے... اور احمد بھائی تو اتنے سیدھے ہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ اس اغوا میں تیرا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔" روحی نے اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

"وہ لوگ گھر سے اغوا کر کے لے جائیں گے کیا؟" بانو نے پوچھا۔

"ہاں!... تجھے سچ بتاؤں میں نے ہاجرہ کا بھی ساتھ دیا تھا... اور اس نے مجھے بھی پیسے دیے تھے جس سے میں نے اپنے بڑے بیٹے کو باہر بھیجا تھا۔" اس نے آج سچ واضح کر دیا۔

"سچ؟" بانو خوش ہو گئی۔

"ہاں... اور کیا؟ ہاجرہ کو دس لاکھ ملے تھے... دس لاکھ۔" روحی نے خوشی خوشی بتایا۔

"تو سچ کہہ رہی ہے؟ ہاجرہ کو دس لاکھ ملے تھے؟ دس لاکھ سے تو میں ارم کی شادی خوب دھوم دھام سے کروں گی۔"

"ہاجرہ نے مجھے ایک لاکھ دیا تھا۔"

"میں تجھے دو لاکھ دوں گی۔" بانو خوشی خوشی بولی۔

"سچ؟" روحی نے بانو کا ہاتھ خوشی سے دبا دیا۔

"ہاں... ہاں! کیوں نہیں۔"

"میں کل ہی تجھے جواب دیتی ہوں... تو کیا میرے ساتھ ہاجرہ کے گھر چلے گی؟" روحی نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ بانو کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"میں گھر سے باہر گئی تو کہیں احمد کو مجھ پر شک نہ ہو جائے... ایسا کر! تو ہی سارا بندوبست کر دے۔"

"اچھا! میں چلتی ہوں۔" روحی نے چادر سنبھالی اور بانو کے گھر سے خوشی خوشی نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ لے... پورے پانچ لاکھ ہیں۔" اگلی شام کو روحی نے اسے کمرے میں پیسے تھمائے۔

"پانچ لاکھ؟ مگر تو نے تو دس لاکھ کا کہا تھا۔" بانو نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں! مگر رخسانہ کی عمر زیادہ ہے، اس لیے وہ لوگ اس کے صرف پانچ لاکھ دے رہے ہیں... میں نے اتنے میں ہی سودا کر دیا... یہ سوچ کر کہ تجھے پیسے مل رہے ہیں اور سر سے بلا بھی ٹل رہی ہے۔" روحی اٹھلائی تو بانو نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔

"لیکن اب میں تجھے ایک لاکھ ہی دوں گی۔"

"چل ٹھیک ہے! جیسے تیری مرضی۔" روحی فوراً مان گئی۔ بانو مسکرانے لگی۔

"اچھا! وہ لوگ آج رات تیرے گھر آئیں گے..... رخسانہ کدھر سوتی ہے؟" روحی نے رازداری سے پوچھا۔

"صحن میں..... ہم سب کے ساتھ۔"

"اوہ! تو پھر وہ لوگ اسے پہچانیں گے کیسے؟" روحی جھنجلا گئی۔

"وہ لال چادر اوڑھ کر سوتی ہے..... تو انہیں لال چادر کی نشانی بتا دے۔" بانو نے اسے خوشی خوشی الوداع کیا۔



رات کے آخری پہر اس نے چپکے سے گھر کا داخلی دروازہ کھول دیا اور پھر اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی..... آدھے گھنٹے کے بعد اس نے اپنے دروازے میں سے دو افراد کو منہ پر کپڑا باندھے اندر آتے دیکھا۔

وہ خوش ہو گئی کہ اب رخسانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے دفع ہو جائے گی اور اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔

ان دو افراد نے ٹارچ سے لال چادر والی چارپائی کا رخ کیا اور چادر سمیت ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھا لیا۔

بانو نے دیکھا کہ لال چادر میں اس نے کافی ہاتھ پاؤں مارے، مگر دو جوان آدمیوں کی گرفت سے وہ کیسے آزاد ہو سکتی تھی۔

اور پھر وہ لال چادر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بانو کا چہرہ خوشی کے مارے سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ارم کے لیے حسین خواب جھلملانے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ ارم کی شادی پر اسے بہت قیمتی جہیز دے گی اور باقی پیسے کو بنک میں جمع کروا کر وہ احمد کو بھی سلائی مشین کا کام کرنے نہیں دے گی۔"

یہی سب سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔



صبح اس کی آنکھ رونے کی آواز سے کھلی۔ اس نے آنکھیں ملیں..... رخسانہ اس کا بازو ہلا رہی تھی۔ وہ بوکھلا گئی۔

"تو.....؟" رخسانہ بری طرح رو رہی تھی۔

"بھابھی! ارم گھر میں کہیں نظر نہیں آ رہی..... اور وہ دیکھو! دہلیز پر لال چادر پڑی ہے..... دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ پتا نہیں ارم کہاں چلی گئی۔"

احمد بھی رخسانہ کی آواز پر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"مگر یہ لال چادر تو تیری ہے۔" بانو نے غصے سے کہا۔

کل رات ارم کو سردی لگ رہی تھی..... تو اس نے مجھ سے میری لال چادر مانگ کر اوڑھ لی تھی۔ بھیا! ارم پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے مگر اس کی چپلیں تو چارپائی کے پاس پڑی ہیں۔" اس نے روتے روتے ارم کی چپلوں کی طرف اشارہ کیا۔

احمد نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ بانو چیخنے لگی اور روحی کو پکارنے لگی۔

"روحی..... روحی!" وہ دروازے کی طرف بھاگی۔

رخسانہ نے اسے سنبھالا۔

"بھابھی..... بھابھی! خود پر قابو رکھیں۔"

بانو پاگل سی ہو گئی۔ اس نے رخسانہ سے خود کو چھڑوایا اور پاگلوں کی طرح بولتی چلی گئی۔

"روحی! لال چادر میں رخسانہ نہیں تھی..... میری بیٹی ارم تھی۔ ان لوگوں کے پاس جا کر میری ارم کو لے آؤ..... میں نے رخسانہ کا سودا طے کیا تھا..... ارم کا نہیں۔"

احمد یہ سن کر پاگلوں کی طرح بانو کو مارنے لگا..... اور رخسانہ نے ہاتھ سے دیوار کا سہارا لے لیا..... مگر اس کے ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ وہ زمین پر گرتی چلی گئی۔ اس کی آنسو بھری آنکھیں دہلیز پر گری لال چادر پر تھیں۔ جسے وہ کتنے سالوں سے اوڑھ کر سوتی رہی تھی۔



آسیہ مقصود

چاند میرے دریچے میں

ناولٹ

"شرمین بی بی! ہن تے تھلے آجاؤ۔ جے وڈی بی بی نے دیکھ لیا تے تہاڈے نال میری وی گت پئی جانی اے۔"

ساجھی رونی صورت بنائے کہہ رہی تھی۔

"ساجھی کی بچی! ایک تو تم ڈرپوک بہت ہو۔ کوئی مدد تو کیا کرنی 'الٹا تم نے ہمیشہ میرا بیڑا ہی ڈبویا ہے۔ میں ہی پاگل ہوں جو تمہیں اپنے ساتھ شامل کر لیتی



ہوں۔" غصہ نے میرا میٹر گھما دیا تھا۔

"خاموشی سے کھڑی ہو جاؤ ورنہ دوں گی ایک الٹے ہاتھ کا۔" میرے دور سے لہرائے تھپڑ نے اس پر خاطر خواہ اثرات مرتب کیے اور وہ سہم کر کھڑی ہو گئی۔

اس سے نمٹنے کے بعد اب میں اپنے "مشن امپاسبل" کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ ابھی بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ اسے حسرت بھری نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے میں نے ایک دلگداز آہ بھری۔ جس کا اس ڈھیٹ پر تو چنداں اثر نہ ہوا' البتہ نیچے کھڑی ساجھی ایک بار پھر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنے لگی۔

"میں کیا بی بی جی! اج لیئی کافی اے۔"

تپتی دوپہر اور جھلسانی لُو نے میری بے سود کوششوں کو کافی حد تک مایوس کن موڑ دے دیا تھا۔ مگر میں ہمت ہار کر بیٹھ جاؤں' یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک قہر آلود نگاہ اوپر کی ایک ناتواں شاخ کے ساتھ جھولتے ہوئے آم پر ڈالی اور پھر سے کمربستہ ہو گئی۔

"انب دی لکڑ کچی ہوندی اے۔ مم..... میرا مطلب اے بے آکھدی اے۔" وہ میرے گھورنے پر گھبرا گئی تھی۔ "اب زیادہ بک بک مت کرو اور وہ سامنے....." میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اس طرف چل دی۔

"اوہو! ٹوکری تو نیچے رکھ دو..... ہاں! ٹھیک ہے۔ اب وہ کونے والا پتھر اٹھا کر لاؤ۔" میں نے درخت پر لٹکے لٹکے ہی حکم صادر کیا۔

"جلدی پھینکو بدتمیز! میرے ہاتھ تھک گئے ہیں۔"

وہ آدھی اینٹ ہاتھ میں پکڑے متذبذب کھڑی

تھی۔ مسلسل ڈانٹ ڈپٹ پر اس نے ڈرتے ڈرتے اسے میری طرف اچھال ہی دیا۔ جو سیدھی دشمن کی گولی کی طرح میرے ماتھے پر آکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں اس صحت مند آم کو حاصل کرنے کی خواہش دل میں بسائے کچی زمین پر اوندھی پڑی تھی۔

"ہائے! مار دیا ظالم نے۔"

پاؤں مڑنے سے موچ آگئی تھی۔ اب تو اٹھنا بھی محال تھا۔ مگر اس واویلے میں، میں یہ بھول گئی کہ اماں جانی کے کمرے کی کھڑکی اس پچھلے صحن میں کھلتی ہے اور انہیں بھولی ہوئی باتیں یاد دلانا بھی خوب آتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"پھوپھو! کیا ابھی بھی درد ہو رہا ہے؟" زوہیب میرے چہرے کے بگڑے ہوئے زاویوں سے پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔ میں اپنے بستر پر نیم دراز جنت بوا سے پاؤں کی سنکائی کروا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے اماں جانی کے ہاتھوں ہونے والی ٹھیک ٹھاک قسم کی دھلائی کی وجہ سے میرے منہ کا ذائقہ ابھی تک کڑوا تھا۔

"اس لڑکی کی عمر دیکھو اور کرتوت، کہیں سے بھی گریجویٹ لگتی ہے۔"

"اب کیا ماتھے پر لکھوا کر پھروں؟" میں نے صرف سوچا۔

"سارا سارا دن بلیوں کی طرح دیواریں پھلانگتی ہے یا گلہریوں کی طرح درختوں پر چڑھ جاتی ہے۔"

کل دوپہر سے اب تک نجانے کتنی بار ایسی بے شمار خوبیاں گنوا کر اپنے تئیں وہ مجھے شرمندہ کر چکی تھیں مگر بقول ان کے میرے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی۔

"تمہاری عمر کی لڑکیاں گھر داری سیکھتی ہیں، مگر تمہیں نہ تو کچن میں دلچسپی ہے نہ گھر کے کسی اور کام سے۔ پرائے گھر جا کر بھی کیا یونہی ڈنڈے بجاؤ گی۔"

اماں جانی کا غصہ ان چوبیس گھنٹوں میں متعدد بار نکلنے کے باوجود کم نہیں ہوا تھا۔ میں بھی صبر کا عالمگیر مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش رہی۔ زبان پر کھجلی تو بہت تھی مگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کا مطلب اپنی شامت کی ان گھڑیوں میں خاطر خواہ اضافہ کرنا تھا۔

عارفہ بھابھی بڑی بہو کے فرائض احسن طریقے سے نبھاتے ہوئے میری ہر کلاس پر موجود رہتی تھیں اور اماں جانی کے عقب میں کھڑی ہو کر زیر لب مسکرانے کی ذمہ داری بھی پوری کرتیں اور میں بے بس عوام کی طرح اندر ہی اندر کھولتی رہتی۔

"دن رات مجھے یہ فکر ستاتی ہے کہ کہاں بیاہوں گی اس ماہی منڈے کو۔"

وہ میرے کانوں پر جوئیں سرکانے کے مشن سے ہار مانتے ہوئے میدان چھوڑ کر کمرے سے باہر جا رہی تھیں۔ مگر جاتے جاتے اپنا مشہور زمانہ فقرہ کہہ کر میرے نرم و نازک دل کو ٹھیس پہنچانا بھی غالباً ضروری خیال کیا تھا۔ میں نے ایک سرد آہ بھر کر خالی دروازے کی طرف دیکھا اور تسلی کر لینے کے بعد اپنی توپوں کا رخ غائبانہ طور پر ساجھی کی طرف موڑ دیا۔

"سارا قصور ہی اس ساجھی کی بچی کا ہے۔ اندھی نے پوری اینٹ اٹھا کر میرے سر پر دے ماری۔ ایک بار یہ موچ ٹھیک ہو جائے، پھر دیکھ لوں گی اس کو بھی۔" میں نے پیشانی پر بنے گومڑ پر ہاتھ پھیرا۔

بوا جنت نے بے قرار ہو کے پہلو بدلا۔ یقیناً میرے انتقام کا تصور انہیں دہلا گیا ہوگا۔ وہ اپنی اکلوتی پوتی کے لیے بہت حساس تھیں۔ ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔

"چھوڑیں نا پھوپھو! آپ یہ چاکلیٹ کھائیں۔" سات سالہ زوہیب میرا ہمیشہ ہی بہت خیال رکھتا تھا۔

"شہوز ماموں لائے ہیں جرمنی سے۔" اس کے اگلے جملے نے میرے دل کو سچ مچ باغ باغ کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شرمین پلیز! میری طرف آجاؤ نا۔" فون پر ثانیہ جاوید منمنا رہی تھی۔ وہ اپنے تایا زاد شعیب کو پسند کرتی تھی، جبکہ اس کی ماما اس کی شادی اپنی بہن کے بیٹے جازم سے کرنا چاہتی تھیں۔ وہی روایتی افسانوں والی لو اسٹوری جس میں مجھے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو میں شکر ادا کرتی کہ وہ میری ہمسائی نہیں تھی، ورنہ یہ راگ دن رات سن سن کر میرے تو کان پک جاتے۔

"شرمین! پھر آ رہی ہو نا۔" ہمیشہ کی طرح میری منتیں کر رہی تھی۔ میں اس مسکینیت پر چڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت پر اکڑ بھی رہی تھی۔

"خدا کسی کو اتنا عقل مند بھی نہ بنائے کہ باقی سب اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائیں۔" میں نے فرضی کالر کھڑے کیے۔

"ثانی کی بچی! تمہیں کتنی بار بتاؤں میں نہیں آسکتی۔ میرے پاؤں میں موچ آئی ہوئی ہے۔ مگر تمہاری موٹی عقل میں یہ بات کب آئے گی۔"

"یہ تو پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ عارفہ بھابھی بتا رہی تھیں اب تم بالکل ٹھیک ہو۔"

"اف! خدا سمجھے عارفہ بھابھی کو۔" میں نے دل ہی دل میں انہیں کوسا۔

"اتنا ضروری ہے کیا، فون پر ہی بتادو۔"

"اس بار مسئلہ خاصا ٹیڑھا ہے۔ بس تم جلدی سے آجاؤ۔ میں نے زریں کو بھی بلا لیا ہے۔" وہ لہجے میں مسکینیت سمو کر پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

میں نے ناچار ہامی بھر کر فون رکھ دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ میری یہ دونوں سہیلیاں مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ اوپر سے چاہے جتنی بھی بے زاری ظاہر کروں، میں ان سے کچھ دیر کی دوری بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے تو میں نے گریجویشن کے بعد آگے نہ پڑھنے کا اعلان کیا تھا۔ اماں جانی نے یہ سوچ کر مان لیا کہ شاید گھر میں رہ کر مجھ میں گھریلو اور سگھڑ قسم کی لڑکی کے اوصاف حمیدہ بیدار ہو جائیں۔ ان کا دل خوش فہم اس موہوم سی امید پر راضی ہو گیا۔ زریں اور ثانیہ سے میں نے کھرے کھرے الفاظ میں کہہ دیا۔

"مزید دو سال تم احمقوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ اس لیے یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لے رہی۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم دونوں بھی کچھ ایسا ہی ارادہ رکھتے ہیں۔" وہ دونوں دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔

"اب تو میڈم آپ کو اپنے اس دانش مندانہ فیصلے پر افسوس ہوگا۔" زریں نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنے تئیں انکشاف ہی کیا تھا، مگر یہ پہلے ہی سے میرے علم میں تھا۔ اسے تو اپنی ہونے والی سسرال کی جانب سے تعلیم جاری رکھنے کا آرڈیننس جاری ہوا تھا... اور ثانیہ، وہ تو تھی ہی سدا کی دھکا اسٹارٹ۔ بی اے میں بھی فیل ہوتے ہوتے بچی تھی گنڈا تھرڈ ڈویژن کو بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر آئندہ کے لیے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا جبکہ میں نے اپنی اچھی خاصی فرسٹ ڈویژن کو دوستی پر قربان کر دیا تھا۔

"کیا سچ؟ بدتمیزو! پہلے نہیں بتا سکتی تھیں، میں نے خوامخواہ ہی بھائی کو فارم لانے سے منع کیا۔ اب تو تاریخ بھی نکل گئی ہے۔" افسوس کا مصنوعی مظاہرہ کرتے ہوئے میں دل ہی دل میں لڈیاں ڈال رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک گھنٹے بعد ہم تینوں سر جوڑے ثانیہ کے بیڈ روم میں سازشی کانفرنس میں مصروف تھیں۔

"تمہارا یہ خالہ زاد جازم کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ چیز ہے۔"

میں نے پیالے میں گنجائش سے زیادہ میکرونیز بھرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"ہائے! ایسا تو مت کہو، خالہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔"

"اتنی ہمدردی ہے تو شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔" میں نے رزق الٰہی سے انصاف کرتے ہوئے اس کی ہمدردی کے غبار پر چھینٹا مارے۔

"بس یار! شعیب کے سوا کوئی من کو بھاتا ہی نہیں۔" وہ تصور میں شعیب کی تصویر بناتے ہوئے شرمائی۔

"تایا کی فیملی اگر ہم سے مالی لحاظ سے کم ہے تو کیا

ہوا۔ خلوص اور محبت کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"تم چھوڑو اس بات کو۔ بتاؤ! جازم ابھی بھی تم سے شادی پر راضی ہے یا ___ ؟" زریں نے اس کا دھیان بٹایا۔ "اس دن شرمین نے اس کے آفس جا کر جو کلاس لی تھی اس کی 'اف' کیا بتاؤں میں تو سمجھی تھی کہ اب وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر رشتے سے انکار کر دے گا۔" ایک ماہ پہلے کے قصہ کی یاد نے ہمیں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

"ویسے دیکھنے میں تو خاصا معقول لگتا ہے۔" میں نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے جازم کا خاکہ ذہن میں دوہرایا۔

"اچھا واقعی؟" ثانیہ نے اپنی گول گول آنکھیں مٹکائیں۔ "اگر کہو تو بات آگے بڑھاؤں؟ کیونکہ وہ سچ مچ اس رشتے سے دست بردار ہو چکا ہے۔ وہ بھی میرا نام لیے بغیر۔ بڑا امپریس ہے تم سے۔"

"کیا سچ! انکار کر دیا اس نے؟" میں اور زریں بیک وقت بولی تھیں۔

"اس خوشی میں تو اب منہ میٹھا کرنا بنتا ہے۔" میں نے چاکلیٹ کیک اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"مسئلہ تو پھر بھی حل نہیں ہوا۔" وہ اداس الو کی سی شکل بنائے کہہ رہی تھی۔

"وہ دراصل ___" اس سے پہلے کہ اس کے نئے مسئلے کا سرا ہمارے ہاتھ آتا اس کی ماما دروازہ کھولے اندر داخل ہوئیں۔

"جلدی کرو ثانیہ! وہ لوگ ___" ہمیں دیکھتے ہی ان کے الفاظ کھمبوں سے بجلی کی طرح غائب ہو چکے تھے اور چہرے پر ناگواری اسی طرح رقم تھی جیسے کسی واپڈا ملازم کو دیکھ کر عوام کے چہروں پر ظاہر ہوتی ہے۔

"السلام علیکم آنٹی!" ہم نے باجماعت سلام کیا۔

"تم لوگ کب آئیں؟" جواب میں وہ میری گود میں دھرے کیک کو گھور رہی تھیں جس میں سے ابھی ہم نے صرف ایک ایک پیس تناول کیا تھا، مگر جس طرح وہ دیکھ رہی تھیں، لگتا تھا وہ ایک پیس بھی حلق سے واپس نکل آئے گا۔

"ثانیہ! ادھر آ کر میری بات سنو۔" ان کی ایکس رے کرتی نگاہیں واپس پلٹیں تو ہماری جان میں جان آئی۔

"آنٹی اتنی کنجوس تو ہرگز نہیں ہیں۔" میری طرح زریں بھی حیران تھی۔ یہ راز ثانیہ کی واپسی پر کھلا۔

"نسرین آنٹی نے میرے لیے مزید ایک عدد رشتہ فراہم کر دیا ہے اور شاید آج ہی وہ لوگ آ رہے تھے۔ یہ سارا اہتمام بھی دراصل ان ہی کے لیے تھا۔" وہ تمام قصہ ہمارے گوش گزار کر کے مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اچھا تو یہ ہے وہ مسئلہ جس کے لیے تم نے یہ ہنگامی اجلاس بلوایا ہے۔ ثانیہ! اتنے رشتے تو کسی مغلیہ شہزادی کے نہیں آئے ہوں گے، جتنے تم بھگتا چکی ہو۔"

میں سر پکڑے بیٹھی تھی جبکہ وہ مزے سے کیک کھا رہی تھی کیونکہ آنٹی نے آج کے لیے ان لوگوں کو منع کر دیا تھا۔



"یہ بریانی نجانے کس سرپھرے کی ایجاد ہے۔ بیس پچیس تو مسالے ہی ڈلتے ہیں اس میں۔ اب بندہ کس کو یاد رکھے اور کس کو بھول جائے۔"

میں گھی میں پیاز براؤن کرتے ہوئے خود بھی جل بھن رہی تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو تنور کی مانند گرم کچن تھا اور کچھ غصے سے کھولتا ہوا میرا دماغ، کیونکہ آج نازنین آپی آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں قدم رنجہ فرماتے ہی انہوں نے حکم شاہی فرمایا تھا۔

"بریانی کھاؤں گی اور وہ بھی شرمین کے ہاتھ کی بنی ہوئی۔"

آج کل مجھے گھر کے ہر کام میں کولہو کے بیل کی مانند جوتنے کے یہ جو غیر آئینی اقدامات ہو رہے تھے، دراصل ان دونوں کی سازباز کا ہی نتیجہ تھے۔

میں بھی جیسے سگھڑ بننے کو تیار بیٹھی

ہوں۔۔۔ ہونہہ دل چاہ رہا ہے آج ایسی بریانی بناؤں کہ نازنین آپی تو کیا ان کے میاں بھی مدتوں یاد رکھیں۔ مگر میرا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچنے کے آثار ذرا کم ہی تھے کیونکہ جنت بوا اور بڑی بھابھی منکر نکیر کی طرح میرے دائیں بائیں موجود تھیں۔

"اف! اتنی گرمی۔" میں نے چہرے پر آئے پسینے کو مزید واضح کرنے کے لیے نظر بچا کر ہاتھ گیلے کیے اور گالوں پر پھیر لیے۔ اس سے پہلے کہ مجھے چکرا کر گرنا پڑتا' عارفہ بھابھی نے میرے ہاتھ سے کفگیر لے لیا۔

"تم ایک طرف ہو کر سانس لو' میں دیکھ لیتی ہوں بریانی کو۔"

میں فوراً" ان کا حکم مانتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

سلاد بناتی ہوئی بوا نے ضرور ترچھی نظروں سے دیکھا۔ یہ تو خیر ان کی ہمیشہ کی عادت ہے۔ اب ان چھوٹی موٹی باتوں کی پروا کیا کرنی۔ جوس کی پوری بوتل منہ لگا کر فٹافٹ چڑھاتے ہوئے بھابھی کو تیزی سے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ انہوں نے بریانی دم پر لگانے کے بعد کوفتوں کے لیے مسالا بھوننا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ کسٹرڈ بنانے کے لیے دودھ بھی چڑھا دیا۔

"ویسے بھابھی اتنی بری بھی نہیں ہیں۔" میں نے دل ہی دل میں انہیں کچھ نمبر دے ڈالے اور خود لاؤنج میں آکر ٹی وی آن کر لیا۔

"شرمین! تم نے اگر کچھ اور نہیں کرنا تھا تو کم از کم پڑھائی ہی جاری رکھتیں۔"

نازنین آپی نے اپنی مغرور سی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے انگوٹھیوں والا ہاتھ میرے سامنے لہرایا۔ ان کی امارت کے اس مظاہرے کو نظر انداز کر کے میں نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے مکمل خاموشی اختیار کی۔ ابھی ابھی تو میں اماں جانی کے کمرے میں آکر بیٹھی تھی اور انہوں نے میرا ناپسندیدہ موضوع چھیڑ دیا تھا۔

"کہیں بات پکی ہونے کی تو فی الحال کوئی امید نہیں ہے۔ ایسے میں پڑھائی چھوڑ کر بیٹھ جانے کی بھلا کیا تک تھی اور نہیں تو کم از کم ذہن مصروف ہی رہتا ہے' پھر ایسا ذہن جو فارغ نہ بھی ہو تو شیطان کا گھر ہی لگتا ہے۔"

وہ بریانی کھانے کے باوجود اپنی نہیں ہوئی تھیں۔ شاید بھابھی کے ہاتھ کا ذائقہ پہچان گئی تھیں۔

"کتنی بار بتا چکی ہوں' مجھے مزید پڑھنے کا قطعاً" کوئی شوق نہیں ہے۔" آخر بولنا ہی پڑا۔

"شوق تو تمہیں کسی چیز کا نہیں ہے۔"

"خیر! اب ایسی بھی درویشی نہیں کہ کوئی شوق ہی نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کے دل میں مجھے بیاہ کر لے جانے کا ارمان نہیں جاگتا۔" میں نے دل ہی دل میں اپنے ارمانوں پر ماتم کیا۔ منہ سے کہہ کر بھلا اماں جانی کے غضب کو آواز دینی تھی۔ غنیمت تھی کہ وہ فی الحال خاموش تھیں۔

"اماں جانی! آپ حلیہ دیکھیں اس لڑکی کا۔ شکل و عقل میں تو پہلے ہی پوری ہے۔ ایک تھوڑا بہت رنگ صحیح تھا' وہ بھی ٹانگ برابر بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کھیل کر گنوا دیا ہے۔ بال دیکھو جیسے صحرا کی جھاڑیاں۔" وہ مسلسل میری شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔

"کیا کہا؟" میں اسپرنگ کی طرح اچھلی تھی۔ فوراً" آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ اس نے کھل کر میرے ریشمی بالوں اور سرخ و سفید رنگت کی تعریف کی تو دل کو کچھ ڈھارس ہوئی' مگر اب تو مزید وہاں بیٹھنے کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی' لہٰذا فوراً" اٹھ آئی۔

آپی بھی تازہ تازہ واقعے سے تپی ہوئی تھیں۔ پچھلے دنوں وہ جہاں زیب بھائی کے کسی دوست کا رشتہ لائی تھیں۔

بقول ان کے بہت سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ اتنے سلجھے ہوئے کہ انہیں میرے برف کا گولا کھانے پر بھی اعتراض تھا۔ اس میں میرا کیا قصور کہ ان کی اور گولے والے کی آمد ایک ساتھ ہو گئی۔ گاڑی کو اپنے گیٹ کے سامنے رکتے دیکھ کر میں تو فوراً" اندر بھاگ جانا چاہتی تھی' مگر وہ کمبخت گولے والا ہی پچھلا کھاتہ کھول کر بیٹھ

گیا' پھر رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی' جب زوہیب کا دوست گڈو بیٹ اور بال لے کر ڈرائنگ روم میں ہی چلا آیا۔

"شرمین آپی! آج آپ کو صرف باؤلنگ کی باری ہی ملے گی۔ کیونکہ میری مما نے منع کیا ہے۔ آپ کی بیٹنگ سے ہمارے گھر کے سارے شیشے جو ٹوٹ گئے ہیں۔"

کچھ لمحے پہلے میری ہونے والی ساس مجھے پہلو میں بٹھائے نازنین آپی سے میری سلیقہ شعاری کے قصے سن رہی تھیں' مگر ان پے در پے حملوں نے ان کا سارا شوق کافور کر دیا' پھر کیا تھا' وہ فوراً" اٹھ کر جلد ہی بھاگیں۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے ایسے لوگوں میں شادی کرنے کا جن کے چہرے دکانوں میں سجے اسٹیچو جیسے اور لہجے کلف زدہ ہوں' بناوٹی لوگ۔۔۔" میں نے بھی سارا حساب بے باق کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عارفہ بھابھی میکے گئی ہوئی تھیں' آج کل کسی حسین و نازک اندام دوشیزہ کو چراغ لے کر تلاش کر رہی تھیں' اپنے اکلوتے بھائی شہوز کے لیے' جو جرمنی سے تین ماہ کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے اور ان کے سر پر سہرا دیکھنے کے سارے ارمان ماں بہنوں کے دلوں میں یک دم ہی بیدار ہو گئے تھے۔ اس مقصد کے لیے سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔

رمضان کی آمد آمد تھی' اس لیے اماں جانی کو بھابھی کا یوں روز روز میکے جانا بہت کھلتا تھا اور مجھے ان کی قریب کی کمزور نظر۔

ایک شام میں ابا جانی اور اماں جانی کے ساتھ چائے نوش فرما رہی تھی۔ ابا جانی کپ ہاتھ میں پکڑے ہر چینل پر باری باری وہی خبریں سننے میں مصروف تھے۔ اماں جانی کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔ ساجھی میرے صوفے کے ساتھ نیچے قالین پر بیٹھی اپنے قاعدہ کا رٹا لگا رہی تھی۔ میں بار بار اس کا تلفظ درست کرتی اور جھی جھی خواہ مخواہ ہی بھاڑ پلا دیتی۔۔۔ اور کچھ کرنے کو تھا جو نہیں۔

"مبارک ہو بیگم! رمضان کا چاند نظر آگیا ہے۔ صبح ان شاء اللہ پہلا روزہ ہو گا۔" ابا جانی کی آواز خوشی سے سرشار تھی۔

"آپ کو بھی مبارک ہو۔" سب ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے۔ اس خبر نے سوئی سوئی سی شام کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا تھا۔

"ابا جانی! رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس اتنی جلدی ختم کیسے ہو گیا۔ ابھی تو صرف آٹھ بجے ہیں۔ کہیں یہ خبر غلط ہی نہ ہو۔"

میں نے ٹی وی اسکرین کو گھورتے ہوئے فکرمندی کا اظہار کیا۔ ابا جانی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا' پھر دوبارہ اپنے پسندیدہ پروگرام کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"صبح پہلا روزہ ہے اور یہاں نہ کوئی تیاری نہ اہتمام۔" اماں جانی کو اب اگلی فکر ستانے لگی تھی۔

"میرے تو بچے بھی گھر پر نہیں ہیں۔" وہ اپنے فرماں بردار بہوؤں' بیٹوں کا ذکر چھیڑ کر مجھے گھیرنے کے لیے راستہ ہموار کر رہی تھیں۔

میں نے فوراً" صوفے سے پاؤں نیچے اتار کر جوتے کی تلاش شروع کر دی مگر رفوچکر ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پورچ میں حمزہ بھائی کی گاڑی آکر رکی تھی اور اماں جانی کا سارا دھیان اسی طرف ہو گیا۔

"شاید حمزہ بھائی آفس سے واپسی پر بچوں اور بھابھی کو بھی ساتھ لیتے آئے ہوں۔" ہم دونوں ماں بیٹی اپنے اپنے نقطہ نظر سے اس گمان پر خوش ہو گئیں۔ میں نے بھاگ کر لاؤنج کا دروازہ کھولا تو حمزہ بھائی اینڈ فیملی کے ساتھ طلحہ بھائی اور ربیعہ (بھابھی) کو بھی دیکھ کر میری خوشی سے چیخ نکل گئی۔

"آپ لوگ دبئی سے کب آئے۔۔۔ پہلے اطلاع کیوں نہیں دی؟" سوالات کی بوچھاڑ میں وہ سدا کا نوبیاہتا جوڑا کھڑا شرما رہا تھا۔

"ربیعہ نے کہا' یہ عید پاکستان میں اپنوں کے ساتھ چل کر مناتے ہیں تو میں نے سوچا' کیوں نہ رمضان ہی

میں آپ سب کو سرپرائز دے دیا جائے۔" طلحہ بھائی کہہ رہے تھے۔

"مبارک ہو' مبارک ہو۔" ہر طرف رمضان کی آمد سے خوشیاں بکھر گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بھابھیوں نے بروقت آکر کچن سنبھال لیا تھا'اس لیے راوی میرے لیے چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ میں سحری کے بعد فجر کی نماز پڑھتے ہی سو جاتی' پھر جو آنکھ کھلتی تو ظہر کا وقت جارہا ہوتا۔ بھاگم بھاگ نماز سے فارغ ہوتی تو ثانیہ کی کال آجاتی۔ اب پورا ایک گھنٹہ اس کے مظلوم عشق کی داستان سنتے اور اپنی عقل سلیم سے اسے مشورے دیتے گزرتا تو اگلا گھنٹہ زریں کے سسرال نامہ کے ساتھ تمام ہوتا۔ اس کی رام کہانی سن کر جیسے ہی موبائل رکھتی' ربیعہ اپنے شوہر نامہ کے ساتھ آموجود ہوتی۔ انیس سو باسٹھ کی اس فلمی ہیروئن کی ہر بات شوہر سے شروع ہوکر شوہر پر ہی ختم ہوتی۔ شادی کو ایک سال ہوچکا تھا مگر ان کی باتوں سے یوں محسوس ہوتا' جیسے ابھی ہنی مون پیریڈ ہی چل رہا ہو۔ یوں تو طلحہ بھائی میرے سگے اور بہت ہی عزیز بھائی تھے مگر ربیعہ ان کی اس قدر مالا جپتی کہ میں بے زار ہوجاتی۔

وہ میری ہم عمر اور ماموں زاد بہن تھی۔ بھابھی بننے کا سانحہ ایک لمبے چوڑے افیئر کے بعد عمل میں آیا۔ جس میں میرا کردار تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ تاریخی کردار میں نے اس لیے ادا کیا تاکہ کسی دکھیا دل کی دعا شاید مجھے بھی لگ جائے' مگر سزا کے طور پر اب مجھے "طلحہ کہتے ہیں" کی شرمائی شرمائی گردان ہر وقت سننا پڑتی۔

آپ لوگ ہی بتائیں کہ اس قدر سخت روٹین کے بعد مجھے روزہ لگنا تو بنتا ہے نا؟ مگر اماں جانی۔۔۔ میں جیسے ہی تھکی ماندی افطاری کی ٹیبل پر آتی وہ مجھے آڑے ہاتھوں لے لیتیں۔

☆ ☆ ☆

"پلیز پلیز! مان جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں' یہ آخری بار ہے۔" ثانیہ التجا کرتے ہوئے میرے حضور جھکی جارہی تھی اور میں اس کے ڈرائنگ روم کے صوفے کو اپنا تخت شاہی تصور کرتے ہوئے اک شان بے نیازی سے تشریف فرما تھی۔

"اگر میں نہ مانوں تو؟" میں نے گردن اکڑائی۔

"نہیں! ایسا مت کہو۔ میں مرجاؤں گی' مگر شعیب کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ پلیز! مجھے اس مصیبت سے نکالو۔" وہ ہاتھ جوڑنے پر آگئی تھی۔

"آخر کتنی بار نکالوں تمہیں اس مصیبت سے۔ تھک گئی ہوں' مگر تمہارے امیدواروں کی لائن ہی ختم نہیں ہوتی۔ تم نے تو پورشیا آف وینس کا بھی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ بس' مزید نہیں ہوتا مجھ سے۔" میں نے ہاتھ اٹھائے مگر اس کے گڑگڑانے پر مجھے راضی ہونا پڑا۔

"اچھا اچھا! سوچتے ہیں کچھ۔"

"سوچنے کی کیا ضرورت ہے' وہی کرو جو جازم کے ساتھ کیا تھا یعنی دندناتی ہوئی جاؤ اس کے گھر اور لگادو وہی میری خامیوں والا فارمولا۔" وہ آنکھ دباتے ہوئے بڑے مزے سے کہہ رہی تھی۔

"کک۔۔۔ کیوں؟" میں ہکلائی۔

"اس لیے میڈم کہ ان صاحب کا آفس جازم بھائی کی طرح کراچی میں نہیں' بلکہ لندن میں ہے۔"

"کیا سچ! اتنے بڑے بندے سے میں بھلا کیوں ٹکرلوں' وہ بھی صرف تمہارے لیے۔"

"اب اتنا بڑا بھی نہیں ہے۔ صرف چھ فٹ کا ہے۔" اس نے "اتنا" پر زور دیا۔

"ہائے سچ! اور بتاؤ نا کچھ اس کے بارے میں۔"

"اب یقیناً" تم مجھ سے مار کھاؤ گی۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھے مجھے گھور رہی تھی۔

"تم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہو۔ دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں' مگر یہاں لوگوں کو صرف اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔" میں نے چہرے پر مظلومیت طاری کی۔ جواباً" وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"مجھے جازم کے کمنٹس یاد آئے۔" وہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ "جب میں نے ان کے سامنے تمہارا ذکر کیا تو کہنے لگے 'نہ بابا نہ! ایسی ٹارزن ٹائپ لڑکیوں کے ساتھ گزارہ کرنا اپنے بس کا کام نہیں۔"'

"کیا کہا۔۔۔؟ ٹارزن؟ میں نے اس کے آفس کی چھت پھلانگی تھی یا اسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا تھا؟" میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح میرے سامنے آجائے اور میں اس کا منہ نوچ لوں۔

"اوکے' اوکے کام ڈاؤن' میرے پاس ایک اور آپشن بھی ہے۔" اس نے میرے بھڑکتے غصے پر ٹھنڈی پھوار ڈالی۔

"کیا؟" میں نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"عمیر۔"

"عمیر' یعنی وہ تمہارا اوچھا بھائی' جسے ہمارے کالج گیٹ پر دوبار تھپڑ پڑا تھا۔" اب کے چلانے کی باری ثانیہ کی تھی۔

"تم سمجھتی کیا ہو خود کو؟ عمیر تو کبھی بھی نہ مانے' وہ تو تمہیں چڑیل کہتا ہے۔"

وہ نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی اور میں اپنا بیگ اٹھا کر بڑے سکون سے باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

دو دن بعد ثانیہ اور میں اسی لندن والے "چھ فٹے" سے دو دو ہاتھ کرنے جارہے تھے۔ آج زریں نہیں آئی تھی' اس لیے میں ثانیہ کو ہی پکڑ کر لے گئی۔

اس کے ٹھنڈے ہوتے ہوئے ہاتھوں کو دبوچ کر تقریباً" گھسیٹتے ہوئے جب میں گیٹ پر پہنچی تو بڑی بڑی مونچھوں والے ایک خوفناک سے چوکیدار کو اپنی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے پایا۔

"تمہارے صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے لہجے کو تحکم آمیز بنانے کی کوشش کی۔

"کیا کام ہے؟" اس نے ہمیں سر سے پاؤں تک گھورا۔

"فوراً" اندر اطلاع کرو۔ مس شرمین آغا آئی ہیں۔" [illegible] اپنا رنگ دکھایا اور وہ پیچھے ہٹ کر انٹر کام پر بات کرنے لگا۔

"یار! واپس چلتے ہیں۔" ثانیہ نے میرے مزید قریب ہو کر گھبرائی گھبرائی آواز میں سرگوشی کی۔

میں ان سنی کر کے اپنی جگہ جمی رہی۔ اس کی کلائی پر ابھی تک میرے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ وہ کب کی ہاتھ چھڑا کر واپس بھاگ چکی ہوتی۔

انٹر کام سے فارغ ہو کر چوکیدار نے ہمیں ڈرائنگ روم کا راستہ سمجھا کر اندر جانے کی اجازت دے دی۔

کچھ دیر میں ہم لش لش کرتے ڈرائنگ روم میں صوفوں میں دھنسی بیٹھی تھیں۔ میرے اعتماد کو اب کوئی چوری چوری نقب لگا رہا تھا۔ جسے نظرانداز کرنے کے لیے میں یونہی بلاوجہ بولنے لگی۔

"یہ ارب پتی تمہارا خواہش مند ہے اور تم بے مال کے پتی کی خواہش مند۔ ہے نا عجیب بات۔"

"آہستہ بولو کوئی سُن لے گا۔" ثانیہ کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

"ہاں! تو سن لے۔ میں کسی سے ڈرتی ورتی نہیں ہوں۔" میں نے دبنگ انداز میں شیخی ماری۔ پھر اس کے سر پیٹنے پر میں دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

خوبصورت سنہری فریم میں ایک قد آدم پورٹریٹ میرے دائیں طرف کی دیوار کی زینت تھا جس میں ایک شہنشاہ مصر' انداز دلبری سے سامنے والے کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے مبہم مسکرا رہا تھا اور میرے ہاتھ میں چھری نہیں تھی۔

"یہی ہے ناوہ؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں! یہی ہے۔" اس کے لہجے میں بے زاری تھی۔

اسی لمحے کسی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا تو میں سامنے متوجہ ہوئی۔ وہی شہزادہ فریم سے نکل کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ مگر اس وقت اس کے چہرے پر دلفریب مبہم مسکراہٹ کی جگہ کرخت اجنبیت تھی۔

"جی فرمایئے! کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔" [illegible]

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا' میں نے اس آدمی پونی شائستگی سے گزارہ کرنے کی کوشش کی۔

"آپ۔۔۔" کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو احساس ہوا اس کے بارے میں میری معلومات بالکل صفر ہیں۔ یادداشت کی گٹھڑی میں ہاتھ مارا تو سوائے چھ فٹ قد کے کوئی اور بات میرے حافظے میں نہیں تھی۔

"آپ مسٹر۔۔۔؟" میری سوالیہ نظریں اپنی مشکل کے آسان ہو جانے کی منتظر تھیں۔ مگر یہ جازم نہیں تھا جو ثانیہ کا نام سنتے ہی باقی سارے مراحل خود طے کر لیتا۔ صوفے پر نہایت اطمینان سے بیٹھ کر یہ شخص بہت گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"نہیں بتا تا تو نہ سہی۔" میں نے براہ راست بات کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔

"میں شرمین آغا ہوں۔"

"معلوم ہے۔" دو لفظی جواب۔

"ثانیہ کی دوست۔"

"اچھا۔۔۔"

"وہی جس سے آپ کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔"

"پھر۔۔۔؟" شاید وہ مجھے تپانے کی کوشش کر رہا تھا اور کامیاب ہو چکا تھا۔

"دیکھو مسٹر! تمہیں اس شادی سے صاف صاف انکار کرنا پڑے گا۔" میں نے کڑک کر کہا۔

"کیوں؟" کافی سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

"اس لیے کہ ثانیہ تم میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔" ساتھ ہی میں نے زبان دانتوں تلے دبالی' کیونکہ میری زبان سے "سچ" پھسل گیا تھا۔

"اف یہ میں نے کیا کر دیا۔" میں سابقہ کارروائیوں کی ترتیب بھول گئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں میں پہلی بار گھبرائی تھی۔

"تم بھی تو منہ سے کچھ پھوٹو۔" میں نے کہنی مار کر ثانیہ کو جگانے کی کوشش کی جو شاید سو گئی تھی یا پھر شے سے ٹکرانے میں ناکام رہا تو مڑ کر دیکھا' صوفہ خالی تھا اور دور دور تک کسی ثانیہ کا سایہ تک نہ تھا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح نجانے کس لمحے غائب ہو گئی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کہاں گئی' ابھی تو یہاں بیٹھی تھی۔" میں ہونق بنی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"کون' ثانیہ؟" اس نے یوں پوچھا جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔

"جی ہاں! وہی مجھے یہاں لائی تھی تاکہ میں آپ سے یہ بات کر سکوں۔" میں نے بھی جی کڑا کرتے ہوئے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

"جبکہ یہ بات انہیں اپنے والدین سے کہنی چاہیے تھی۔ نہ کہ ایک غائب دماغ لڑکی سے۔"

"کیا؟ تم مجھے پاگل کہہ رہے ہو؟" میں پسینے سے تر ہتھیلیاں بھینچ کر کھڑی ہو گئی۔

"تو کیا کوئی ذی ہوش لڑکی کسی ایسے شخص سے کہ جس کا وہ نام تک نہیں جانتی' اس کے گھر ملنے پہنچ سکتی ہے؟ ایسے لوگوں کی ذہنی حالت پر شبہ ہی کیا جا سکتا ہے یا کردار پر۔"

اس نے بہت بری بات کہہ دی تھی۔ لمحہ بھر کو مجھے یوں لگا جیسے میرے سر سے آسمان اور پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی گئی ہو۔

"آپ کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔" اب میں بہت سنجیدگی سے صورت حال پر غور کرنے لگی تھی۔ دل میں ثانیہ کو گالیاں دیتے ہوئے دروازے تک کا فاصلہ نظروں ہی نظروں میں ناپا۔

"اچھا! تو ایسی ویسی لڑکیوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟" اس کے ہونٹوں پر پھیلی ایک طنزیہ مسکراہٹ مجھے پہلی بار اپنے وجود میں گڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا اور مجھے خطرے کی گھنٹیاں سنائی دینے لگی تھیں۔

"سنیئے مس شرمین!" تیز قدموں سے باہر نکلتے

ہوئے میں نے اسے کہتے سنا تھا۔ اب میں آنکھیں بند کیے اندازے سے گیٹ کی سمت بھاگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ لڑکی انتہائی دھوکے باز ہے۔" میں نے ثانیہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اس وقت ہم زریں کے گھر پر تھے۔ ساری روداد اسے سناتے ہوئے میں ثانیہ پر فرد جرم عائد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ تو تم نے واقعی اچھا نہیں کیا ثانیہ!" زریں نے بھی میری طرف داری کی۔

"یار! اس کے گھر والے میری تصویر لے جا چکے ہیں۔ وہ مجھے پہچان لیتا تو اس سے بڑی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔"

"یہ بات تم مجھے اندر جانے سے پہلے ہی بتا سکتی تھیں۔" میں اس کا عذر ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"کئی بار کوشش کی، مگر تم کس کی سنتی کب ہو؟" اس نے منہ بنایا۔

"اور جو تمہیں گھر کے باہر منڈلاتے ہوئے اس کے گھر والے دیکھ لیتے پھر؟"

"یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ پاکستان میں اس کی صرف ایک بہن رہتی ہے' وہ بھی اس کے گھر سے بہت دور۔ اس کی والدہ امریکہ میں ہوتی ہیں جو آج کل میں پاکستان آنے والی ہیں۔" وہ بھی ساری معلومات اب فہم پہنچا رہی تھی۔

"اف! تو وہ گھر پر اکیلا تھا۔" مجھے کپکپی سی محسوس ہوئی۔ میری غائب دماغی پر ثانیہ کی بتیسی باہر نکل آئی تھی۔ پھر وہ میرے غفلت میں کہے گئے فرمودات زریں کے گوش گزار کرنے لگی۔ دونوں کی ہنسی کا جو فوارا پھوٹا تو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"بدتمیزو! اپنا نہیں تو کچھ میرے روزے کا ہی خیال کر لو۔" میری کھسیاہٹ نے انہیں مزید شہہ دے دی۔ مجبوراً" وہاں سے اٹھتے ہی بنی۔

"سنو' شرمین! افطاری کے بعد چلی جانا۔" زریں پکار رہی تھی۔ میں ان سنی کر کے باہر نکل آئی۔

مغرب کا وقت قریب تھا' اس لیے راستے بھر جگہ جگہ عارضی اسٹالز لگے ہوئے تھے۔ میں کچھ کولڈ ڈرنکس اور آئس کریم لینے ایک دوکان پر رک گئی تاکہ اپنے ساتھ ساتھ گھر والوں کے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کا سامان ہو سکے۔ گھر سے دوپہر کی غائب تھی اور نتیجہ بھی روز قیامت کی طرح میرے علم میں تھا۔ والٹ سے پیسے نکالنے کے لیے جب میں نے بیگ تلاش کرنا چاہا تو یاد آیا' وہ تو اسی جادوگر کے قلعے ہی میں رہ گیا ہے۔ میں بھاگتے ہوئے اسے ٹیبل سے اٹھانا بھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"باجی کہندی اے 'میری طبیعت چنگی نئی۔ اس لیے روزہ نہیں رکھ سکدی۔" ساجھی کے ذریعے میرا پیغام سحری کی میز تک کیا پہنچا' اماں جانی کے غضب کو جوش آ گیا۔ پھر کیا تھا' وہ گرجتی برستی ہوئی میرے کمرے میں آئیں اور کان سے پکڑ کر مجھے ٹیبل پر لا بٹھایا۔

"چار روزے گزرے نہیں اور اس کے بہانے شروع ہو گئے۔" وہ سحری کے دوران بھی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ جبکہ یہ بہانہ نہیں تھا' میری طبیعت سچ میں خراب تھی۔ پوری رات پریشانی میں گزری۔ نیند تو دور کی بات' میں ایک پل کو پلک تک نہیں جھپک سکی تھی۔ حمزہ بھائی کی تاکید کے باوجود میں گاڑی سے اپنا ڈرائیونگ لائسنس اٹھا لیتی تھی' جبکہ موبائل گاڑی میں بھول جاتی تھی۔ اب یہ ذرا سی لاپروائی میری زندگی میں بہت بڑا طوفان بھی لا سکتی تھی۔ میرا لائسنس میرے ہینڈ بیگ میں تھا' جسے وہ شخص اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔

میری طبیعت بوجھل ہو رہی تھی' ایک نوالہ لینے کی رغبت نہ تھی۔ مگر اماں جانی کی گھورتی نگاہوں نے مجبور کر دیا کہ اپنے سامنے رکھے پراٹھے کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ ابھی پہلا نوالہ منہ میں رکھا ہی تھا کہ ابکائی آ

گئی۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

"طبیعت تو واقعی خراب ہے اس کی۔ صبح ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔" دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے ابا جانی کو کہتے سنا۔

"شکر ہے! کوئی پیچھے نہیں آیا۔" میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ آج بچپن کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ مگر وہ بچپن جس میں ذرا سی چوٹ لگنے پر خوب آنسو بہاتے تھے 'کب کا بیت چکا تھا۔ اب تو ہر عمل کی وضاحت درکار تھی۔ وہ آزادی اور مرضی کا زمانہ قصہ پارینہ ہو گیا۔ اماں جانی ہمیشہ کہا کرتی تھیں "لڑکی اور اس کی عزت دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں اور دونوں ہی کانچ کی طرح نازک۔ ذرا سی ٹھیس پہنچی تو کرچی کرچی ہو گئے۔"

لڑکی ہونا کیا ہوتا ہے؟ یہ وہ پہیلی تھی، جسے میں کبھی سمجھ نہ پائی اور آج وہ شخص ایک جملے میں مجھ پر واضح کر گیا تھا۔ اس کا چبھتا ہوا طنزیہ لہجہ بار بار میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"ایسی ویسی لڑکیوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔"

میں نے بے قرار ہو کر کروٹ لی۔

"شرمین! تم رو رہی ہو؟" ربیعہ مجھ پر جھکی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"نن..... نہیں تو۔" میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی، مگر جیسے ہی آئینے پر نظر پڑی تو ٹھٹک گئی۔ سرخ آنکھیں اور بھیگا چہرہ۔ میں نجانے کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔

"لگتا ہے، تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" اس نے تکیے کا بھیگا غلاف اتارتے ہوئے کہا۔ میں چپ چاپ اٹھ کر واش روم میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

"مس شرمین آغا سے بات ہو سکتی ہے؟" موبائل میں گونجتی آواز کو میری سماعت نے فوراً" پہچان لیا۔

"تمہاری یہ جرات کہ مجھے کال کرو؟"

میں اپنے گھر میں اپنوں کے درمیان تھی 'لہٰذا اعتماد میرے لہجے میں پھر سے لوٹ آیا تھا۔

"آپ کا نام شرمین کی بجائے "شرارہ" بلکہ "مس آتش فشاں" ہونا چاہیے۔ لگتا ہے، شربت کی جگہ پانی میں بھی غصہ گھول گھول کر پیتی ہیں۔" نہ صرف اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا بلکہ وہ مجھے جان بوجھ کر بات کرنے پر اکسا رہا تھا۔

"مطلب کی بات کرو 'فون کیوں کیا ہے؟"

"اچھا تو آپ مطلب کی بات سننے کو تیار ہیں؟"

"شٹ اپ! تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے...؟ کوئی راہ چلتی ہوئی لڑکی...؟ تو یہ بھول ہے تمہاری۔ میں صرف اپنی دوست کی ہمدردی میں اس کی مدد کرنے چلی آئی تھی کہ وہ تم جیسے شخص سے شادی کرنا نہیں چاہتی 'ورنہ شرمین کس طوفان کا نام ہے 'یہ تم جانتے نہیں۔ تم جیسے شوقیہ غنڈوں کو سیدھا کرنا تو مجھے خوب آتا ہے۔ فور یور کائنڈ انفارمیشن میرے فادر ڈی آئی جی پولیس ہیں۔" اسے خوفزدہ کرنے کے لیے میں نے کافی بڑی بڑھک ماردی تھی۔

"یہ تو اور بھی آسانی ہو گئی۔ اب میں آپ کا ڈرائیونگ لائسنس تھانے بھجوا دیتا ہوں۔ وہاں سے آپ کے والد گرامی خود ہی لے آئیں گے۔" اس کے لہجے میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔

"نن..... نہیں! اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ اگر تم واقعی ایک شریف انسان ہو تو اس شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرا لائسنس لیٹر بکس میں ڈال دو۔" دل میں "جل تو جلال تو" کا ورد کرتے ہوئے میں نے ایک آسان حل پیش کیا۔

"اور باقی بیگ؟"

"اسے ڈسٹ بن میں ڈال دو۔" میں پھر سے تپ گئی تھی۔

"اب میں اتنا بھی شریف نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حلق پھاڑ کر کہا مگر جواب سے پہلے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں اور ربیعہ آٹھویں روزے کو ہی عید کی شاپنگ کرنے نکل کھڑی ہوئی تھیں 'جبکہ حقیقتاً" ابھی سے خریداری کا ارادہ دونوں کا نہیں تھا۔ ربیعہ نے پروگرام بنایا تو میں اپنا دھیان بٹانے کو راضی ہو گئی۔ جب ایک بڑی سی چادر لے کر میں باہر نکلی تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لائق تھے۔ ونڈو شاپنگ کے دوران بھی اس نے کئی بار زمین کو چھوتے ہوئے چادر کے کونے کی طرف میری توجہ دلائی۔

"آخر یہ تمہیں سوجھی کیا؟" آخر ایک جگہ رک کر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"دیکھا نہیں۔ یہ مرد ہر راہ چلتی عورت کو کیسے گھور رہے ہیں۔ بے غیرتوں کو رمضان کا بھی احترام نہیں۔" میں نے گھبرا کر اردگرد دیکھتے ہوئے سر کو اچھی طرح ڈھانپا۔

"شرمین! تم مارکیٹ پہلی بار تو نہیں آئیں۔ اور یہ مرد حضرات بھی ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے تبدیلی تم میں آئی ہے۔" وہ بے اختیار ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شاید اس کی بات سچ ہی تھی۔ مجھے خود پر اٹھنے والی ہر نگاہ آج کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو 'تمہیں معلوم ہے 'اماں جانی عید کے بعد تمہیں اس گھر سے رخصت کرنا چاہتی ہیں۔" وہ چوڑیوں کے مختلف شیڈز دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"مگر کہاں؟" حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔

"تمہارے اصلی گھر اور کہاں۔" اب وہ آگے بڑھ رہی تھی۔

"مگر اماں جانی کے سوچنے سے کیا ہو گا۔" میں نے سوچ کر سر جھٹکا۔ جبکہ ربیعہ ہینڈ بیگز کی دوکان میں گھس گئی تھی۔ وہ مختلف بیگز کو اٹھا کر دیکھ اور واپس رکھ رہی تھی۔ میں گلاس وال میں سے اسے دیکھتے ہوئے زریں کی شادی کے بارے سوچنے لگی تھی جو عید کے بعد طے تھی اور تو اور ثانیہ کی ماما نے بھی بیٹی کی خواہش کے آگے گھٹنے ٹیک دیے دراصل میرج بیورو والی ان کی دوست آخر کار انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ وہ بچاری بھی کیا کرتیں۔ ہم دونوں ہی کے رشتے ان کا درد سر بنے ہوئے تھے۔

"اماں جانی نے میرے ذمے ایک کام لگایا ہے۔" ربیعہ دکان سے باہر آتے ہی دوبارہ بات کا وہیں سے آغاز کر رہی تھی جہاں سے چھوڑ کر گئی تھی۔

"وہ چاہتی ہیں ہمیں عارفہ بھابھی سے شہروز بھائی کے لیے بات کروں۔" وہ بہت معنی خیزی سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ مگر میری خاموشی پر بولی۔ "تمہیں کوئی اعتراض 'آئی مین۔ تم کہیں انٹرسٹڈ تو نہیں۔ دراصل تم اس دن رو رہی تھیں تو میں سمجھی.....؟"

"اگر انٹرسٹڈ ہوتی تو یہیں ٹنگی رہتی؟" میرا موڈ بگڑ گیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے 'میں آج رات ہی بھابھی سے بات کرتی ہوں۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے کپڑے کی ایک دوکان میں گھس گئی تھی۔

شاپنگ نہ کرنے کے ارادے کے باوجود ہم کافی کچھ لے چکے تھے۔ اپنے اپنے شاپنگ بیگ تھامے ہم پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے جب ایک منظر نے میرے قدم روک لیے۔ ایک کار ڈرائیور نے پانچ چھ سال کے ایک بچے کو ٹکر مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ وہ لہولہان ہوا سڑک پر بے ہوش پڑا تھا۔ اور کار کا ڈرائیور فرار ہونے کے چکر میں تھا۔ رش زیادہ ہونے کے باعث اسے گاڑی نکالنے میں دشواری ہو رہی تھی 'میں نے اسی لمحے کا فائدہ اٹھایا اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے بی بی! پیچھے ہٹو۔" وہ شیشہ نیچے کرتے ہوئے تنگ مزاجی سے بولا۔

"تم اندھے ہو۔ دیکھ نہیں رہے ایک بچہ تمہاری لاپروائی کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہا ہے اور تم بھاگنے کے چکر میں ہو۔ انسانیت ہے تم میں کچھ۔ تم جیسے لوگوں کو تو اس مقدس مہینے کا بھی احترام نہیں نہ ہی دلوں میں خدا کا خوف ہے۔"

میں زور زور سے چلا رہی تھی اور بچہ کی ماں میرے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ ارد گرد کے لوگ بھی بے حسی کا چولا اتار کر گاڑی کے گرد دائرے کی صورت جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اب تو مکمل طور پر گاڑی کا راستہ بند ہو گیا۔ مجبوراً" وہ شخص نیچے اترا اور زخمی بچے کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیا۔ میں نے ماں کو بھی بچے کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد رش چھٹا تو مجھے ربیعہ ایک طرف کھڑی نظر آئی۔ وہ حیران و پریشان سی مجھے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو 'یہ سب کیا تھا میں نے بھی خاموشی سے کندھے اچکا دیے۔



شام سے ہی میرے دل میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ عشا تک انتظار کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔ پھر جیسے ہی نماز عشا اور تراویح سے فارغ ہوئی بھابھی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ دروازے سے کان لگا کر کچھ سننا چاہا تو احساس ہوا' دونوں خواتین اندر موجود نہیں 'جس کی گواہی حمزہ بھائی کے خراٹے دے رہے تھے۔ میں مایوس ہو کر پلٹ آئی۔ کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ یہ بھابھی ہی کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"ربیعہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ شرمین گھر کی لڑکی ہے۔ دیکھی بھالی اور خوش شکل بھی لیکن کیا یہ خوبیاں اسے اچھی بہو اور بیوی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔" بھابھی کا لہجہ بہت عجیب سا تھا۔ کچھ دیر کے لیے کچن میں خاموشی چھا گئی۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔ اچھی بہو ہونے کی ضمانت کسی بھی لڑکی کی نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے سسرال نے بھی ہمیں بغیر اس ضمانت کے اپنایا ہے۔"

ربیعہ حقیقت بیان کر رہی تھی مگر میرے دل نے اسے ایک اچھی بہو ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا۔

"تم جذباتی ہو رہی ہو ربیعہ! یہ عمر بھر کے بندھن ہوتے ہیں۔ انہیں وقتی جذباتیت کی نذر نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بہت آسانی سے اس کی حقیقت پسندی پر جذبات کا ٹھپہ لگا رہی تھیں۔ "تم تو شرمین کو بچپن سے جانتی ہو۔ کس قدر سرکش اور خود پسند لڑکی ہے۔ بلکہ لڑکی کیا ایک سرپھرا نوجوان ہے۔ تم ہی بتاؤ' اس میں اپنی ہم عمر لڑکیوں والی کوئی ایک بھی خوبی ہے۔ اگر میں سسرال کی لاج نبھانے پر رضامند ہو بھی جاؤں تو میرے ماں باپ اور اکلوتے بھائی کا کیا قصور ہے۔ جو انہیں یہ سزا دی جائے۔

اس لڑکی سے کچھ بعید ہے کہ میری ماں کا سر پھاڑ دے یا ابا کو کہیں دھکا دے آئے اور اگر شہوز کے ساتھ جرمنی چلی گئی تو خدا جانے وہاں کیا گل کھلائے۔ آج اس نے سڑک پر جو تماشا کیا وہ تو تم خود مجھے بتا چکی ہو۔" اب ربیعہ خاموش تھی۔

"شہوز سے تو تم واقف ہو۔ وہ کم گو اور سنجیدہ مزاج لڑکا ہے۔ ایسی آدھے دماغ کی لڑکی کو ایک دن برداشت نہیں کر سکے گا۔" ان کی گفتگو ابھی جاری تھی مگر مجھ میں مزید سننے کی سکت نہ رہی تھی۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"تو یہ ہو تم دوسروں کی نظر میں شرمین آغا!" کوئی میرے اندر قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔ میں گرتی پڑتی بہ مشکل اپنے کمرے تک پہنچی تھی۔

"کیا میری چھوٹی چھوٹی شرارتیں 'ہنسی مذاق اور کھلنڈرا پن میری سرکشی ہے؟"

"کیا میں بگڑی ہوئی لڑکی ہوں؟"

"ایسی ویسی لڑکیوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔" اچانک ایک طنز بھرا لہجہ میرے کانوں میں گونجا تھا۔

"نہیں 'نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں ہرگز ایسی ویسی نہیں ہوں۔ میرا قصور صرف یہ ہے کہ گزرتے وقت

کے ساتھ میں اپنے اندر کے ایک چلبلے بچے کو مار نہیں سکی۔ بہن بھائیوں کی شادیوں کے بعد گھر کی خاموش فضا میں اپنی ان چھوٹی چھوٹی شرارتوں سے رنگ بھرتی تھی۔ پھر ابا جانی بھی تو کہتے تھے کہ شرمین ہی کے دم سے گھر میں رونق ہے۔"

میرے اندر اٹھتے طوفان نے آنسوؤں کی صورت باہر کا رخ کرلیا تھا۔

"کسی کی تکلیف مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ہو سکتا ہے کہیں میرا طریقہ غلط ہو مگر میری سوچ غلط نہیں ہے۔ میں نے تو ہمیشہ سب میں خوشیاں بانٹنے کی کوشش کی ہے۔ اے اللہ! تو تو جانتا ہے نا میرے دل کو۔"

تواتر سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ میں نے جائے نماز بچھائی اور اس بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گئی جہاں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہستی تو ہمارے دلوں کے ان نہاں رازوں کو بھی جانتی ہے جو خود ہم سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جانے کتنا وقت اسی حالت میں گزر گیا۔ ساجھی سحری کے لیے جگانے آئی تو میں جائے نماز سے اٹھی۔ شب بیداری سے آنکھیں متورم تھیں مگر دل پر دھرا بوجھ اتر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"لو بھئی بیگم! آج رحمت کا عشرہ مکمل ہوا اور ہم مغفرت کے عشرے میں داخل ہو گئے ہیں۔" ابا جانی نے لاؤنج کی طرف آتے ہوئے اماں جانی کو مخاطب کیا۔

افطاری کے فوراً" بعد سب نماز کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ کھانا بعد میں کھایا جاتا تھا۔ پھر دونوں بھائی اور اماں ابا لاؤنج میں جا بیٹھتے۔ میں بھابھیوں کے ساتھ مل کر کچن سمیٹتی اور آخر میں چائے پی جاتی۔ تب تک عشاء کی اذان بھی ہو جاتی۔ سب مرد نماز عشاء اور تراویح کے لیے مسجد کا رخ کرتے اور خواتین اپنے اپنے کمروں کا۔ اس کے بعد گھر میں سحری تک خاموشی کا راج ہوتا۔ آج بھی دن بھر کی مصروفیات اپنے اختتامی مرحلے کی جانب بڑھ رہی تھیں یعنی چائے کے منتظر افراد لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔

"جی جناب اور یہ رحمت کا عشرہ اللہ تعالیٰ کی بے بہا رحمتیں میری جھولی میں ڈال گیا ہے۔" ابا جانی کے برابر والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اماں جانی بہت مسرور لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"اللہ کریم نے میری ساری دعائیں سن لی ہیں۔"

"کون سی دعائیں؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" ابا جانی نے سائیڈ ٹیبل سے اخبار اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"میری شرمین کے لیے ایسا پیارا رشتہ آیا ہے کہ میری ساری پریشانیاں دور ہو گئی ہیں۔"

"رشتے تو پہلے بھی بقول آپ کے سب ہی اچھے تھے۔" ابا جانی نے اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے حسب عادت بامعنی بات سرسری لہجے میں کہی۔

"مگر اس بار مسز نسرین نے انہیں ہر بات پہلے ہی صاف صاف بتادی ہے۔" اماں جانی نے میرج بیورو والی آنٹی کا نام لیا جو اکثر میرا نام سنتے ہی بدمزا ہو جایا کرتی تھیں۔

میں چائے کی ٹرے پکڑے لاؤنج کے دروازے پر ہی رک گئی تھی۔

"ان لوگوں نے نہ صرف اطمینان کا اظہار کیا ہے بلکہ کسی حد تک رضامندی بھی ظاہر کردی ہے۔" اب کے ابا جانی کے ساتھ ساتھ ٹی وی دیکھتے ہوئے حمزہ بھائی اور زوہیب اور ارسہ سے کھیلتے ہوئے طلحہ بھائی بھی اماں جانی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"باقی کے معاملات تو دونوں گھرانوں کے ایک دوسرے سے ملنے کے بعد ہی طے ہوا کرتے ہیں۔" انہوں نے تینوں مردوں کی جانب جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ انہیں کسی روز افطاری کے بعد بلوالیں۔" دونوں بھائی بھی تائید کرنے لگے۔

عارفہ بھابھی ہمیشہ کی طرح میرے حصے کا کام نمٹانے کے لیے ٹرے میرے ہاتھ سے لے کر آگے

گئیں۔ ربیعہ بھی جاتے جاتے میرے گال پر ...رارت سے چٹکی لیتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

...ی یو بیسٹ آف لک۔"

بے اختیار میرے منہ سے نکلا "آمین۔"

☼ ☼ ☼

بیش قیمت لباس و زیورات سے لدی پھندی خوب ...ورت سی خاتون لڑکے کی بہن تھیں۔ ان کے دو عدد ...ول مٹول شرارتی سے بچے زوہیب اور ارسہ کے ...ساتھ مل کر ڈرائنگ روم کے تمام ڈیکوریشن پیسز کی ...رتیب نو میں مصروف تھے۔ دوسرے صوفے پر ایک ...بس سی خاتون صرف مسکراہٹ پر اکتفا کیے مطمئن ...بیٹھی تھیں۔ وہ غالباً" موصوف کی والدہ تھیں۔

جاتے ہوئے وہ اماں جانی کو بصد اصرار اپنے ہاں ...نے کی دعوت دے گئیں، جس سے گھر میں گویا شادی ...رگ کا سماں بندھ گیا تھا۔ ہر شخص خوش تھا خاص طور ...اماں جانی تو اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ ...صرف نازنین آپی نے ہمیشہ کی طرح چند عجیب و غریب ...سے اعتراضات اٹھائے تھے۔

"لڑکے کی بہن ہنستی بہت ہے، دیے ہوئے وقت ...ر یہ لوگ تو فوراً" ہی پہنچ گئے..... آنٹی صاحبہ شرمین کو ...کچھ زیادہ ہی چمٹا چمٹا کر مل رہی تھیں یا۔"

"بس رہنے دو ناز! ہنسنا برائی ہے نہ وقت پر پہنچنا، ...شرمین کو پیار کر رہی تھیں تو اچھی بات ہے۔ اسی کا ...رشتہ لینے آئی تھیں نہ کہ تمہارا۔"

آج تو اماں جانی بھی ان کی اس عادت سے بے زار ...ہو گئی تھیں۔

"اماں جانی! خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ایسی باتوں کا۔ ...پھر لڑکے کا نام بھی تو دیکھیں۔ کتنا عجیب ہے 'ابدال' ...شرمین تو ہرگز نہیں مانے گی۔" اب وہ میرے کندھے ...پر بندوق رکھنے کی کوشش میں تھیں۔ اماں جانی نے ...گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ پھر آپی کو نظروں ہی نظروں ...میں تنبیہہ کرنے لگیں۔

"ناز آپی!" میرے یک دم مخاطب کرنے پر وہ چونکی تھیں۔ "ناموں میں کچھ نہیں رکھا۔ اصل اہمیت شخصیت کی ہوتی ہے۔ اگر وہی کھوکھلی ہو تو نام صرف تختی بن کر رہ جاتا ہے جو یا تو گھر سے باہر گیٹ پر لگتی ہے یا کتبے کی صورت قبر پر۔" میں سنجیدگی سے کہہ کر اٹھ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جلد ہی ناز آپی کے تمام اعتراضات صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ کیونکہ یہ لوگ جس شخص سے ملنے گئے تھے، وہ کوئی ساحر تھا جس نے سب کو پہلی ملاقات میں ہی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ پھر حمزہ بھائی نے بھی تھوڑی بہت تحقیق کروا کر اپنی تسلی کرلی۔ یوں جھٹ رشتہ پٹ منگنی کی تیاریاں بھی ہونے لگیں۔

ثانیہ اور زریں حیران تھیں کہ مجھے کسی بات پر بھی اعتراض کیوں نہیں ہو رہا۔

"میری مانو تو ایک نظر اسے دیکھ ہی لو۔ کہو تو آپی سے تصویر وغیرہ کی بات کروں۔" ثانیہ کہتی۔

"مگر سنا ہے کہ اس طرف سے بھی ایسی کسی فرمائش کا اظہار نہیں کیا گیا۔" فرمائشوں کے بوجھ تلے دبی زریں بھی منہ کھولے دیکھتی۔

میں فقط دھیرے سے مسکرا دیتی تو وہ دونوں حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے لگتیں۔

اب انہیں کیا بتاتی کہ آج کل میں جس عجیب کیفیت کا شکار تھی اس میں نہ اعتراض کر سکتی تھی نہ اعتراف۔ میں جب بھی آنکھیں بند کرتی تو نجانے کہاں سے دو غصیلی آنکھیں اور طنز بھرے ہونٹ میرے سامنے آجاتے۔ وہ شخص جس کا میری زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، کوئی خوب صورت یاد اس سے وابستہ نہیں تھی، سوائے اس کے کہ اس نے میرا ڈرائیونگ لائسنس ہمارے گھریلو لیٹر بکس میں ڈال کر خود کو ایک شریف انسان ثابت کر دیا تھا اور دوبارہ کبھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی، پھر میرے خیالوں میں نجانے کیوں بار بار آجاتا تھا۔ ان الجھے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر میں ابدال کا فرضی تصور

ذہن میں بسانے کی کوشش کرتی تو خود پر ہنسی آجاتی۔
اسی کشمش میں گزرتے دنوں کا آخری سرا یعنی چاند رات بھی آپہنچی۔ جی ہاں وہی چاند رات جسے رسم کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔



آج صبح ہی سے دل کی عجب سی کیفیت تھی۔ میں اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔ اداس ہرگز نہیں تھی مگر عجیب بے کلی سی تھی۔ عارفہ بھابھی کی باتوں نے جیسے میرا خود پر سے اعتماد ختم کر ڈالا تھا۔ میں اپنے بستر پر لیٹی اسی کیفیت سے الجھ رہی تھی' جب ربیعہ مجھے پکارتی ہوئی اندر آئی۔ ربیعہ کیا تھی 'کپڑوں' جوتوں اور زیورات کے ڈبوں اور نجانے کن کن اشیا کا ایک ڈھیر تھا جو دھم کی آواز کے ساتھ بستر پر گرا تو پیچھے سے وہ خود نمودار ہوئی۔
"ہم صبح سے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو رہے ہیں اور محترمہ یہاں چھپی بیٹھی ہیں۔" مصروفیت اور عجلت میں بھی خوشی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔
"لو سنبھالو بھئی! تمہاری ساس نے سب چیزیں پہلے سے اس لیے بھجوادی ہیں تاکہ تم وقت پر تیار ہو کر انہیں دیدار کرواسکو۔" وہ ہنستے ہوئے ڈبہ کھول کر دیکھنے لگی۔ سفید ریشمی سوٹ پر گولڈن اور سلور امتزاج میں خوب صورت کام تھا۔
"واہ بھئی! پسند تو بہت اچھی ہے مسٹر ابدال کی۔ اتنے دنوں سے تمہاری نند صاحبہ میرے کان کھا رہی تھیں کہ ابدال نے سب شاپنگ اپنی پسند سے کرنی ہے۔ سچ میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ نجانے کیا اٹھا لائے مگر یہ تو سب کچھ کمال کا ہے بھئی۔"
ربیعہ اپنی آواز کو باریک کر کے نورینہ باجی کی نقل اتارنے لگی تو ضبط کے باوجود مجھے بلاوجہ ہی رونا آنے لگا۔
"ارے ارے یہ کیا بھئی۔" اندر داخل ہوتی ہوئی ثانیہ کی نظر سب سے پہلے میرے آنسوؤں پر ہی پڑی تھی۔
"اگر سوٹ پسند نہیں آیا تو فون کھڑکاؤ۔ آنسو کیوں ضائع کرتی ہو۔ انہیں رخصت کے وقت کے لیے سنبھال رکھو۔" وہ ٹشو سے میرے گال پونچھنے لگی۔
"مگر صرف رخصتی کے کیے بعد میں تو وہی بچارہ روئے گا۔" ربیعہ نے بھی لقمہ دیا۔ جس پر ان دونوں کے ساتھ میری بھی ہنسی نکل گئی۔
"لڑکیو! یہ ہنسی مذاق چھوڑو اور پار لر جانے کی تیاری کرو۔" اماں جانی کے اندر آتے ہی سب کی ہنسی کو بریک لگ گئی تھی۔ جلدی جلدی ضروری اشیاء ثانیہ نے ایک بیگ میں ڈالیں اور ہم حمزہ بھائی کے ساتھ پارلر چلے گئے۔ واپسی پر زریں کو لیتے ہوئے جب ہم گھر پہنچے تو سب مہمان آچکے تھے۔ لہٰذا زریں اور ثانیہ مجھے سیدھا لان میں بنے اسٹیج پر ہی لے آئیں۔
"ماشاء اللہ۔ میری بہو تو چاند کا ٹکڑا ہے۔" آنٹی میری بلائیں لے رہی تھیں۔
"گھنی 'میسنی' کیا ہیرو پسند کیا ہے۔" میری دونوں ہم زاد ابدال کو اسٹیج پر آتا دیکھ کر میرے کانوں میں گھسنے لگیں۔
"واؤ' سفید شیروانی پر سلور اور گولڈن کام۔ اس نے تو پوری میچنگ کر رکھی ہے تمہارے ساتھ۔" ایک قدرتی شرم وحیا نے میرے سر کو خود بخود جھکا دیا اور پلکیں تھیں کہ کوشش کے باوجود نہ اٹھ رہی تھیں۔
"دیکھو تو! شرمین آج واقعی شرمین ہی لگ رہی ہے۔" عارفہ بھابھی کسی سے کہہ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کے لہجے میں حسرت ہو۔
"ہمیشہ ایسی ہی رہنا۔" میری طرف ذرا سا جھکتے ہوئے سائے کی گمبھیر سرگوشی نے دل کی دھڑکن کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔
رسم کے بعد جب کھانا کھلا تو صد شکر ربیعہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ گئی اور مجھے اندر لے آئی۔



"لڑکیو' پلیز تھوڑی دیر کے لیے باہر آجاؤ۔ ابدال

شرمین سے ملنا چاہتا ہے۔" نازنین آپی نے اچانک کمرے میں آکر دھماکا کیا۔

"مم..... مگر کیوں۔" میں اس اچانک افتاد پر گھبرا گئی تھی۔

"اب ملتے ہوئے کیوں غش پڑ رہے ہیں۔ کمینی لڑکی! تم سے تو بعد میں پوچھیں گے۔" ثانیہ اور زریں منہ پر ہاتھ پھرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

جیسے ہی سلور اور گولڈن کام والا کھسہ دہلیز پہ نظر آیا، میرا سر ایک بار پھر جھک گیا۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی شرمیلی واقع ہو گی، مس شرمین آغا!" یہ لہجہ میری سماعت پر بجلی بن کر گرا تھا۔

"آپ یہاں؟" میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"جی جناب! میں یعنی ابدال احسن، جس کے چرنوں میں آپ کئی اشخاص کی بھینٹ دینے کو تیار تھیں۔ میں نے سوچا ایسی پجارن اور کہاں ملے گی لہٰذا زندگی بھر کے لیے آپ کے سامنے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔" ہونٹوں پر بہت دلفریب مسکراہٹ سجائے وہ عین میرے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

"و..... وہ تو صرف ایک مذاق تھا۔" میں شرمندہ ہوئی۔

"آپ کے لیے ہو گا، میں تو پہلی نظر میں ہی دل ہار گیا تھا۔" اس کے کلون کی خوشبو مجھے اپنے چاروں طرف پھیلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

"کہا تو آپ نے بھی تھا کہ میں آتش فشاں ہوں۔ نظریں چراتے ہوئے میں نے حساب برابر کرنا چاہا۔

"ہاں وہ تو تم ہو اور یہی بات تو میرے دل کو بھائی تھی۔" وہ نہایت پرسکون انداز میں صوفے پر جا بیٹھا تھا۔ "میری ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ میری شریک حیات ایک بہادر اور صاف گو لڑکی ہو۔ جب کسی غیر مرد سے بات کرے تو بے لچک لہجہ اس کے کردار کی گواہی دے۔ تم سے مل کر یوں لگا، جیسے میری منزل مل گئی ہے۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ پھر ایک دن اچانک ہی تمہارے اندر کے ہمدرد انسان سے ملاقات ہو گئی، جب تمہارا احساس دل ایک زخمی بچے کے لیے تڑپ رہا تھا اور تمہاری آنکھوں میں تیرتی نمی جس کی شاید تمہیں بھی خبر نہ تھی، اس حساس دل کی گواہی دے رہی تھی۔ میں ہجوم میں کھڑا کتنی ہی دیر تمہارے چہرے کو تکتا رہا۔ اس دن میں نے اپنے دل کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔"

میری بے یقین ہوتی سماعتوں نے اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے کو دل پر دستک دیتے سن لیا تھا۔ اور یقین بھی کر لیا تھا۔

"مگر آج۔" وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا۔

"تمہارے اس انوکھے روپ نے مجھ پر یہ عقدہ کھولا کہ محبت کی نرم پھوار جب کسی عورت کے دل کی زمین پر پڑتی ہے تو حیا کی سرخی خود بخود اس کے چہرے پر سج جاتی ہے۔" وہ محبت آگیں لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"جب میرا چوکیدار تمہاری گاڑی کے پیچھے بھاگنے کے باوجود پرس تمہیں نہ لوٹا سکا تو میں نے اسی دن جان لیا تھا کہ یہی اللہ کی رضا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ میری نظروں نے چوری کی ایک چھوٹی سی جسارت کی اور واپس جھک گئیں۔

"چاند نظر آ گیا ہے، مبارک ہو۔" باہر برقی قمقموں سے سجے لان میں یک دم ہی ہلچل سی مچ گئی تھی۔

"آپ کو بھی۔" وہ مسکرا کر باہر نکل گیا۔

میں نے کھڑکی سے جھلکتے آسمان کے ٹکڑے میں چاندی کی باریک تار جیسا یکم شوال کا چاند ڈھونڈنے کی کوشش کی، پھر آنکھوں میں کئی دن سے بسے فرضی تصور میں رنگ بھرتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔



غمِ عاشقی سے کہہ دو، رہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے

میں نظر سے پی رہا تھا تو یہ دل نے بددعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

جو نقابِ رخ اُٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اُٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

نئی صبح پر نظر ہے، مگر آہ! یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

وہی اک خموشی نغمہ ہے شکیلؔ جانِ ہستی
جو زباں پہ نہ آئے، جو کلام تک نہ پہنچے

شکیلؔ بدایونی

وہ دن

پینسٹھ سال پہلے ایک دن ایسا بھی آیا تھا
جب اک سورج نکلنے پر
چمکتی دُھوپ پھیلی تھی تو منظر جگمگایا تھا
اگرچہ میں نے وہ منظر بچشمِ خود نہیں دیکھا
مگر جب یاد کرتا ہوں تو سانسیں گنگناتی ہیں
کئی صدیوں سے صحراؤں میں بکھرتی ریت کی صورت
کروڑوں لوگ تھے جن کا
نہ کوئی نام لیتا تھا نہ کچھ پہچان تھی باقی
ہر اک رستے میں وحشت تھی
سب ہی آنکھوں میں حسرت تھی
نہ آبا سی ہنرمندی نہ اگلی شان تھی باقی
کھلا سر پر جو اس اعلان کا خوشبو بھرا سایا
ہلالی سبز پرچم کا وہ ٹھنڈا دلربا سایا
تو ان کی جاں میں جاں آئی
لہو میں روشنی جاگی
دہن میں پھر زباں آئی
پینسٹھ سال پہلے کا وہ اک احسان مت بھولو
خدا کی خاص رحمت ہے یہ پاکستان، مت بھولو

امجد اسلام امجد



یمانِ وفا باندھا، پھر بھول گئے سب کچھ
تھر کو کیا سجدہ، پھر بھول گئے سب کچھ

یا کیا نہ اُٹھائے ہیں، صدمے شبِ ہجراں کے
یکن جو اسے دیکھا، پھر بھول گئے سب کچھ

رصت نہ ملی ہم کو، دُنیا کے بکھیڑوں سے
س ہاتھ ترا چھوٹا، پھر بھول گئے سب کچھ

جو خواب تھے آنکھوں میں کچھ رنگ تھے باتوں میں
حالات نے جب لُوٹا، پھر بھول گئے سب کچھ

جھل تھا نگاہوں سے، اک صبر سا تھا دل کو
لیں تُو نے نقاب اُلٹا، پھر بھول گئے سب کچھ

تقدیر کی بازی میں جب مات ہوئی ہم کو
ک بار تو دل رویا، پھر بھول گئے سب کچھ

بشریٰ ہاشمی

میرے دیس کے سارے دریا کدھر گئے
بہت سے لوگ یہاں پیاسے مر گئے

عدو کے لشکروں سے لڑتا رہا تمام عمر
تنہا مجھے چھوڑ کر سب لوگ کدھر گئے

پرندے اب جائیں تو جائیں کہاں
اُن کے تو یہاں ٹوٹ سارے پر گئے

میرے ساتھ کیا ہوا کچھ پتا ہے تمہیں
سارے لوگ مجھ کو بلا کر اپنے گھر گئے

بہت دیر سے تلاش میں ہے لگا ہوا
قاتل اُس طرف ہے گیا لوگ جدھر گئے

وسیم اختر

شگفتہ جاہ

رنگا رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعود کی زوجہ محترمہ حضرت زینب ثقفیہؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

"کیا میری جانب سے اپنے خاوند بیرا اور اپنے زیر کفالت یتیموں پر خرچ کرنا صدقے کے طور پر کافی ہو سکتا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس خاتون کو دو ثواب ملیں گے۔ صدقہ کرنے کا ثواب اور رشتے داروں (سے نیکی) کا ثواب۔"

فوائد و مسائل:-

1- بیوی بچوں کا خرچ مرد کے ذمے ہے، عورت کے ذمے مرد یا بچوں کا خرچ نہیں، اس لیے مرد کا بیوی بچوں پر خرچ کرنا زکوۃ میں شمار نہیں ہو سکتا البتہ بیوی کا خاوند پر خرچ کرنا اور بچوں کا خرچ برداشت کرنا صدقہ ہوگا۔

2- زکوۃ بھی ایک صدقہ ہی ہے جو فرض ہے اس لیے بیوی خاوند کو زکوۃ دے سکتی ہے جبکہ خاوند نادار ہو اور بیوی صاحب نصاب ہو۔

3- عورت بھی مرد کی طرح ملکیت کا مستقل حق رکھتی ہے۔ وہ تجارت دستکاری یا ملازمت سے بھی رقم حاصل کر سکتی ہے اور والدین، خاوند یا دیگر رشتہ داروں کے ترکے میں حصے کی بھی حق دار ہے۔ تاہم عورت کی ملازمت یا کاروبار ایسا ہو جو مردوں سے الگ تھلگ ہو۔

4- اقارب اگر امداد کے مستحق ہوں تو ان کی مالی امداد کا ثواب دوسروں کو صدقہ دینے سے زیادہ ہے۔

صدقہ،

جب انسان اپنے ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے تو صدقہ پانچ باتیں کہتا ہے۔ میں فانی مال تھا تو نے مجھے بقا دے دی۔ میں تیرا دشمن تھا لیکن تو نے اب مجھے دوست بنالیا ہے۔ آج سے پہلے تو میری حفاظت کرتا تھا لیکن آج سے میں تیری حفاظت کروں گا۔ میں حقیر تھا۔ تو نے مجھے عظیم بنادیا۔ پہلے میں تیرے ہاتھ میں تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں۔

نوال افضل گھمن۔ گجرات

کچھ الفاظ چنے ہیں،

☆ جب انسان اللہ سے دور ہو جائے تو سکون اس سے دور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ خوف اور اندیشہ مسلط کر دیا جاتا ہے۔

☆ گزرا ہوا زمانہ انسان کے چہرے پر بہت کچھ لکھ جاتا ہے۔ مسافر کے چہرے پر گرد سفر اس کے سفر کا حال بتا دیتی ہے۔

☆ اپنی اولاد کو ہم بہت کچھ سمجھانا چاہتے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتی۔ ہماری اولاد بھی ہمیں بہت کچھ سمجھانا چاہتی ہے لیکن ہم نہیں سمجھتے۔

☆ جس کو زندگی میں کوئی سچا گرو نہ ملا ہو، اس جھوٹے چیلے کو بدنصیب نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

☆ جس انسان کے دل میں روشنی نہ ہو، وہ چراغوں کے میلے سے کیا حاصل کرے گا؟

(واصف علی واصف)

نوال گھمن۔ گجرات

مسکرائیے،

☆ خبر ملی ہے کہ دو نشستوں والا ایک چھوٹا طیارہ مشرقی پنجاب کے ایک قبرستان میں گر کر تباہ ہو گیا ہے۔

مقامی گاؤں کے سکھوں نے اب تک پانچ سو لاشیں برآمد کرلی ہیں۔ باقی لاشوں کی تلاش کے لیے کھدائی کا کام جاری ہے۔

☆ امریکی اور روسی ٹیلی وژن میں صرف اتنا فرق ہے کہ امریکہ میں ہم ٹیلی وژن دیکھتے ہیں اور روس میں ٹیلی وژن ہمیں دیکھتا ہے۔

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

اظہار ہمدردی،

ایک صاحب کوچ میں سوار ہوئے تو کنڈیکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"سر! کل آپ اس کوچ سے اترنے کے بعد خیریت سے گھر پہنچ گئے تھے نا؟"

"مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" ان صاحب نے حیرت سے کہا۔

"وہ دراصل ... بات یہ ہے کہ کل ایک مسافر کوچ میں سوار ہوا تو آپ اسے اپنی سیٹ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے جبکہ اس وقت کوچ میں آپ دو ہی مسافر تھے۔ باقی سب سیٹیں خالی پڑی تھیں۔" کنڈیکٹر نے آہستگی سے جواب دیا۔

ارسطو،

● غصہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور ندامت پر ختم ہوتا ہے۔

● سب سے بڑا بزدل وہ ہے جو موت سے ڈرتا ہے۔

● ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے۔

● عادت طبیعت کو ضعیف کر دیتی ہے اور اس کے خلاف کام کرتی ہے۔

● جو بات معلوم نہ ہو اس کے اظہار میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔

● زیادہ گفتگو کرنا ہر چند کہ اچھی ہو، دلیل دیوانگی ہے۔

● دنیا ایک خس پوش کنواں ہے۔ عقلمندوں کو اس میں سوچ کر پاؤں رکھنا چاہیے۔

زیر تربیت،

سوئمنگ کلب کے زیر اہتمام چند نوجوانوں کو غوطہ خوری کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس دوران انسٹرکٹر کچھ دیر کے لیے کسی کام سے چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ تمام نوجوان غوطہ خوری کی مشق کرنے کے بجائے بھیگے ہوئے جسموں کے ساتھ کلب کی عمارت میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔

"تم لوگوں نے غوطہ خوری کی مشق کیوں بند کر دی؟" انسٹرکٹر نے قدرے غصے سے پوچھا۔

"باہر بارش ہو رہی ہے نا ... اس لیے۔" ایک نوجوان نے معصومیت سے جواب دیا۔

عائشہ۔ گوجرہ

بے وقوفی،

مشاعرہ ہو رہا تھا۔ حاضرین محفل لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاعر نے مصرعہ پڑھا۔

"دل سی نایاب شے فدا کر دی"

سامعین نے کہا "واہ واہ ... ارشاد ... مکرر"

شاعر نے پھر کہا۔ "دل سی نایاب شے فدا کر دی"

محفل میں سے کسی منچلے نے آواز لگائی "بے وقوفی کی انتہا کر دی"

آمنہ اجالا۔ ڈھرکی

نصیحت،

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی۔

"اے بیٹا! کسی عورت کے پیچھے چلنے سے بہتر ہے کسی شیر کے پیچھے چلے جانا۔ کیونکہ اگر شیر پلٹ

آیا تو جان چلی جائے گی۔ اور اگر عورت پلٹ آئی تو ایمان چلا جائے گا۔"

سنہری کرنیں،

- مہمان کے واسطے زیادہ خرچ کرو کیونکہ یہ اسراف میں سے نہیں۔
- کم کھانا بیماریوں کا علاج ہے اور شکم سیری بیماری کی جڑ ہے۔
- جب معدہ بھر جائے تو قوت فکر کمزور پڑ جاتی ہے اور حکمت و دانش کی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔
- تمہارے واسطے خیر یہی ہے کہ شر سے باز رہو۔
- زبان کی حفاظت کرو کیونکہ یہ ایک بہترین خصلت ہے۔
- سچائی کی مشعل سے فائدہ اٹھاؤ اور یہ مت دیکھو کہ مشعل بردار کون ہے۔
- حق کا پرستار کبھی ذلیل نہیں ہوتا۔ چاہے سارا زمانہ اس کے خلاف ہو جائے۔ باطل کا پیروکار کبھی عزت نہیں پاتا۔ چاہے چاند اس کی پیشانی پر نکل آئے۔

سعدیہ۔ سدرہ۔ شریف آباد

مجھے تم یاد آتے ہو،

تم مجھے یاد نہیں آتے
لوگوں سے
اور اپنے آپ سے
میں یہ بات کہہ کہہ کے تھک گیا ہوں
(فرحت عباس شاہ)

فوزیہ ثمر بٹ۔ ہانیہ عمران۔ گجرات

کام کے بعد،

ایک شخص ایک وقت میں بیس روٹیاں کھا سکتا تھا سرکس والوں کو پتا چلا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ پہلے شو میں بیس روٹیاں کھانے پر لوگ بہت حیران ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد ہونے والے شو میں وہ پھر بیس روٹیاں کھا گیا اور گھنٹے بعد ہونے والے تیسرے شو سے پہلے غائب ہو گیا۔ مالک نے ڈھونڈا تو ایک ہوٹل پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ مالک کے ڈانٹنے پر معصومیت سے بولا۔

"سارا دن کام کے بعد کیا میں روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔"

موتی مالا،

- رب سے محبت اور انسان سے محبت میں یہ فرق ہے کہ انسان سے محبت آپ کی سب سے بڑی کمزوری اور رب سے محبت آپ کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے۔
- اپنے متعلق کوئی بھی بری بات نہ کہو، آپ کے رشتے دار اس موضوع پر بحث کرنے کے لیے کافی ہیں۔
- زندگی توقعات کے پورا نہ ہونے اور غیر متوقع حادثات و واقعات کا سامنا کرنے کا نام ہے۔

جب آپ درست ہوں تو کوئی بھی آپ کو یاد نہیں کرتا مگر جب آپ غلط ہوں تو کوئی بھی آپ کو بھول نہیں پاتا۔

- اگر آپ اپنے کسی درست موقف پر ڈٹ جائیں تو اپنے آپ کو کسی تنہا درخت کی طرح اکیلا رہ جانے کے لیے تیار کر لیں۔ لیکن اگر آپ زمین پر گر جائیں تو اس بیج کی طرح گریں، جو زمین میں اُگ کر دوبارہ لڑنے کے لیے کسی پودے کی شکل میں سر اٹھا لیتا ہے۔

آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

دل کی فائل،

مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں۔

"ایک فائل دل کی بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہو تو وہ کتاب نہیں رہتی بلکہ انسائیکلوپیڈیا بن جاتی ہے۔ ایک فائل خطوط، کارڈز، فون نمبر کی بھی ہوتی ہے۔ اسے بھی کبھی کبھار دیکھنا چاہیے۔ جو بھول گئے ہوں انہیں یاد کر لینا چاہیے۔"

عذرا ناصر۔ کراچی

امت الصبور

خاموش ڈائری

روشن ہاشم کی ڈائری سے

جس طرح کے حالات سے ہم گزر رہے ہیں۔ احمد فراز کی یہ غزل حسب حال سی لگتی ہے۔ اسی لیے میں نے آج اپنی ڈائری میں سے خاص طور پر اسے چنا ہے۔

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پر برستا دکھائی دے

اس شہر غم کو دیکھ کے دل ڈوبنے لگا
اپنے پہ ہی سہی، کوئی ہنستا دکھائی دے

اے صدر بزم مے، تری ساقی گری کی خیر
ہر دل بسانِ شیشۂ شکستہ دکھائی دے

گھر سے نہیں تو زہر ہی لاؤ کہ اس طرح
شاید کوئی نجات کا رستہ دکھائی دے

اے چشم یار تو بھی تو کچھ دل کا حال کھول
ہم کو تو یہ دیار نہ بستا دکھائی دے

جنس ہنر کا کون خریدار ہے فراز
ہیرا کہ پتھروں سے بھی سستا دکھائی دے

سحر خان کی ڈائری سے

"لفظوں میں جادو ہوا کرتا ہے"، جس کسی نے بھی کہا ہے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ الفاظ کا جادو آپ کو جکڑنے تو تا حیات آپ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، شاید امجد اسلام امجد صاحب کا وجود بھی کسی کے لفظوں میں جکڑا گیا تبھی تو یہ خوبصورت غزل ہمارے لیے تخلیق ہوئی۔ آپ بھی پڑھیے۔

اُس نے آہستہ سے جب پکارا مجھے
جھک کے تکنے لگا ہر ستارا مجھے

تیرا غم اس فشار شب و روز میں
ہونے دیتا نہیں بے سہارا مجھے

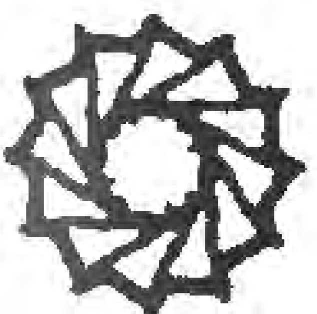
ہر ستارے کی بجھتی ہوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارا مجھے

اے خدا کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکارا مجھے

کوئی سورج نہیں، کوئی تارا نہیں
تو نے کس جھٹپٹے میں اتارا مجھے

عکس امروز میں، نقش دیروز میں
اک اشارہ تجھے، اک اشارہ مجھے

ہیں ازل تا ابد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لا کے مارا مجھے





ناقدہ خاتون

بہنوں کی عدالت

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

اُمِ مریم۔۔۔ جڑانوالہ

ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ خیر اس وقت زندگی میں پہلی بار اگر یہاں خط لکھنے کا ارادہ کیا ہے تو وجہ اور کچھ نہیں۔ بے حد معتبر اور قابل احترام نام عنیزہ سید ہیں۔ "کوہ گراں تھے ہم" سے میں نے آپ کی تحریر سے رشتہ قائم کیا اور پہلی قسط سے ایسا سحر طاری ہوا کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ جن دنوں رفعت ناہید سجاد کا ناول "چراغ آخر شب" ختم ہو رہا تھا۔ میں بے حد اداس تھی۔ اس کا ہیرو فاروق اور عبیر میری زندگی کے یادگار ناقابل فراموش کردار بن گئے۔ آنی (رفعت ناہید سجاد کو میں آنی کہتی ہوں۔) کا انداز بیان اس قدر متاثر کن اور جان دار تھا کہ ہر بار پڑھتے وقت مجھے لگتا' میری نگاہوں کے سامنے یہ منظر زندہ ہونے لگا ہے۔ پھر عنیزہ سید کا ناول آیا تو پہلی قسط پڑھ کر ہی دل خوش ہو گیا۔ بشریٰ سعید کا سفال گر بے مثال تحریر تھی۔ بشریٰ صاحبہ کے ہم پکے فین ہیں۔ راحت آپی کا ناول بہت پسند آیا ہمیں' فرحت اشتیاق سے ہمیں شکایت ہے' بہت بڑی۔ چلتے چلتے وہ بھی کر دیں۔ آپ نے ام مریم کو اتنا برا بنایا کہ اس والی ام مریم کا دل ہی ٹوٹ گیا۔

اب میں سیدہ نازیہ حسن آپ کو وضاحت کرنا چاہوں گی۔ جن رائٹرز کے نام آپ لیے' آپ نے ان میں میرا بھی شامل تھا۔ ہر ناول میں کہانی مختلف ہو گی تو ہیرو کی کوالٹیز بھی مختلف ہوں گی۔ خوب صورتی مجھے ذاتی طور پر پسند ہے اور میری ہر کہانی کا ہیرو خوب صورت نہیں ہوتا۔ میرا ناولٹ "ہم معتبر ٹھہرے" کا ہیرو بے حد عام انسان تھا اور اسی بنیاد پہ اسے پسند بھی کیا گیا تھا کہ وہ باکردار صلح جو ہی نہیں بے حد خیال رکھنے والا اور رشتوں کی اہمیت کو سمجھنے والا تھا۔ نگہت عبداللہ کا ناول خواتین میں میرا فیورٹ ناول ہے۔ میرا دل کرتا ہے اریبہ کی شادی شمشیر سے ہو۔ ہمیں آمنہ مفتی اور سعدیہ عزیز آفریدی بھی بہت پسند ہیں اور سمیرا یونس صاحبہ بھی۔ جو بس اک جھلک دکھلا کر غائب ہو گئیں۔ واپس تشریف لے آئے سمیرا جی آپ کا مغیث والا ناولٹ دل پہ نقش ہے۔

ج ام مریم! آپ نے خط لکھا' ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ ان شاء اللہ جلد آپ کا ناولٹ بھی شامل ہو گا۔ خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ٹائٹل آپ کو اچھا نہیں لگا۔ مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

آپ کی اس بات سے ہم سو فیصد متفق ہیں کہ ہر کہانی کا ہیرو اور ہیروئن خوب صورت نہیں ہوتی۔ بہت سی کہانیاں عام سی شکل و صورت اور ذہانت کے لوگوں پر بھی لکھی گئی ہیں اور ہمارے ہاں شائع ہوئی ہیں۔

کائنات عابد۔۔۔ فیصل آباد

اس ماہ کا ٹائٹل تو بس ٹھیک ہی تھا۔ عنیزہ سید کا ناول بھی اس دفعہ کمال کا تھا۔ راحت جبیں کے ناول کی تو کیا بات ہے۔ نگہت جی کا ناول بھی بہت خوب صورت موڑ پر ہے۔ شمشیر کچھ برا نہ کرے بس اور نایاب جیلانی کا ناول' واؤ آمیزنگ سارے نام A سے اسٹارٹ ہو رہے تھے۔

ویسے عشوہ نام کا کیا مطلب ہے۔ بہت اچھا ناول تھا۔ عمیمہ جیسی بیٹیاں سب کی ہونی چاہئیں۔ عشوہ کی اتنی چھوٹی سی عمر میں شادی ہو گئی۔ بڑی بات ہے کہ اس نے سب اچھے طریقے سے سنبھالا۔ ویسے مجھے اس بات پر بڑی ہنسی آئی جب عمر نے کہا کہ میں اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو جاتا تو عشوہ جھک کر اس کے پیر دیکھنے لگی تھی۔ افسانوں میں نازیہ کنول نازی کا افسانہ اچھا لگا۔ ویسے نازی آپی بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ مہوش کنول کا ناول ٹھیک ہی تھا۔ "احساس زیاں" مقدس مشعل کا اچھا ناول تھا۔ منیزہ کو اس کے صبر کا بڑا اچھا انعام ملا۔ رنگا رنگ پھول میرا فیورٹ سلسلہ ہے اور خلیل جبران کی فلاسفی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میرے پاس اس کے بہت سے اقوال ہیں۔

ج کائنات! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ عشوہ کا مطلب ہے۔ ادا' نخرا۔

مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

صاعقہ جبیں۔۔۔ (پھلروان) سرگودھا

میرے اس خط کو لکھنے کی وجہ فرحت آپی ہیں۔ ریئلی یو آر گریٹ' پلیز سینور سکندر اور بیلا کے ساتھ برا مت کیجیے گا اور اب دی گریٹ عنیزہ سید' کیا بات ہے آپ کی عنیزہ جی۔ بہت اسٹرونگ اسٹوری ہے۔ میں فرسٹ ٹائم عنیزہ سید کو پڑھ رہی ہوں' لیکن بے حد متاثر ہوں۔ "میرے خواب لوٹا دو" میں رازی اب پہلے جیسا اچھا نہیں لگتا۔ اور راحت جی یہ کیا۔۔۔ اتنا ظلم اب تو بس مجھ سمیت سب کو مکافات عمل کا ہی انتظار ہو گا کیوں؟ مقدس مشعل نے اچھا لکھا۔ لیکن نایاب جیلانی اس بار کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں۔ "محبت آزمائش بن گئی" میں ایک بات سمجھ نہیں آئی' اگر ہادی کیپٹن تھا تو ہمہ وقت آفس میں ہی کیوں ہوتا تھا۔ افسانوں میں ٹاپ پر "محبت جاوداں" تھا بے چاری عورت محبت کی بھیک مانگتے مانگتے برداشت کی کس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ باقی افسانے بھی ٹھیک تھے۔

عدنان بھائی کے مشوروں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اس دفعہ نفسیاتی الجھنیں میں اس خاتون کا خط پڑھ کر دھچکا لگا۔ کیا وہ ایک عورت' ایک بیوی اور ایک ماں کہلوانے کے لائق ہے؟

ج پیاری صاعقہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں گئی۔ اس لیے کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

تنقید و تبصرہ ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچایا جا رہا ہے۔

صومیہ ناہید۔۔۔ احمد ال

ٹائٹل بہت فضول تھا۔ دانشور عبداللہ بیگ کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ نعمان اعجاز سے ملاقات اچھی لگی۔ "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید کی کہانی بہتر تھی۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" فرحت اشتیاق سے گزارش ہے کہ اب اس کو سمیٹ ہی لیں۔ بہت زیادہ طوالت کہانی کا مزا ختم کر دیتی ہے۔ راحت جبیں کی کہانی "ساری بھول ہماری تھی۔" ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ باقی سب سلسلے ہی اچھے تھے۔ "خبریں وریں" کا سلسلہ زبردست ہے۔ پلیز اس کو ختم نہ کیجیے گا۔ انٹرویو میں کافی پہلے آپ سے فرمائش کی تھی کہ شہزاد رائے بمعہ فیملی انٹرویو شائع کریں۔ ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ سائرہ خان کا بھی انٹرویو شائع کریں۔ نمرہ احمد سے ایک ریکویسٹ ہے کہ پلیز آپ اپنی کہانیوں پہ ڈرامہ نہ بننے دیجیے گا۔ کیونکہ ڈرامہ ڈائریکٹرز جو کہانی حشر کرتے ہیں۔ وہ سب کو ہی پتا ہے۔ آپ کی کہانیاں بہت زبردست ہیں۔

ج پیاری صومیہ! شہزاد رائے کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔ سائرہ خان کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ارم اقبال۔۔۔ کلاچی

اتنی مدت سے ان دونوں شماروں کے ساتھ تعلق رہا۔ مگر خط نہ لکھ پائی۔ اور وجہ ہے "زمیں کھا گئی آسمان کیسے کیسے" یقین مانیں سچے دل سے کچھ ان ہی سے ملتے جلتے الفاظ میں' میں خود بھی عبداللہ بیگ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہی مصروفیت آڑے آئی۔ سر جتنا پیارا بولتے تھے' جتنی مہذب گفتگو فرماتے تھے اور خوش بیانی جو ان کے لہجے سے عیاں تھی۔ آج کے دور میں بالکل مفقود ہے۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ سلسلے

ہمارے نام کی طرف بڑھ گئے۔ ہمیں اس سلسلے سے بہت محبت ہے۔ کیونکہ قارئین اتنے بہترین طریقے سے تمام ڈائجسٹ کا تجزیہ کرتے ہیں کہ مزا دوبالا ہو جاتا ہے مطالعے کا۔ اس بار فرخندہ انجم (لاہور) کے خط نے تو مجھے رلا دیا۔ بہن واقعی یہ غلط بات ہے۔ مگر سچ پوچھیں تو ہم نے ایسے بھی گھر دیکھے ہیں جہاں کی بہوؤں نے تو بخوشی لڑکے کو دیکھے بنا ہی سسرالی جوڑا پہن لیا۔ مگر ان کی اپنی بیٹی نے سسرال کے جوڑے کو ٹھکرا دیا۔ یقین مانیں اپنا عمل ہر آدمی خود بھگتتا ہے۔ سو آپ اپنا دل اور عمل صاف رکھیں۔ اللہ بے شک عدل کرنے والا ہے۔ تہنیت احمد (رحیم یار خان) آپ کی سوچ بے حد اچھی لگی۔ جس طرح علم کی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ قابل ستائش و تقلید ہے۔ افسانوں میں چھوٹی سی مٹکی میں گویا دریا بند ہوتا ہے۔ مگر اس دفعہ معذرت کے ساتھ سوائے سعدیہ حمید کے کوئی افسانہ متاثر نہ کرسکا۔ نایاب جیلانی مجھے بے حد پسند ہیں۔ ان کی تحریر میں روز بروز بے حد نکھار آرہا ہے۔ رشتوں کی خوب صورتی بیان کرنا انہی کا خاصہ ہے۔ فرحت اشتیاق ہم سفر دیکھ کر ان کی مداح ہوئی۔ مگر افسوس کے ساتھ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ویسا شان دار نہیں لگا۔ پھر بھی ان کا انداز تحریر لاجواب ہے۔ "ساری بھول ہماری تھی" راحت جبیں کا "زرد موسم" ابھی تک نہیں بھولا کہ یہ ناولٹ دل میں جگہ بنانے لگا۔ راحت جبیں سے پلیز فوج' آرمی کے متعلق کوئی ناول لکھوائیے۔ مجھے انتظار رہے گا۔

موسم کے پکوان کے لیے ایک فرمائش کروں گی۔ پلیز' پلیز' پلیز گلاب جامن بنانے کی گھریلو ترکیب بتا دیں۔ کیونکہ ڈبوں والی خوراکیں میرے ہسبینڈ نہیں کھاتے۔ آخر میں ایک گزارش کروں گی کہ پلیز E.Mail کا بھی ایک سلسلہ رکھیں۔ اس کے لیے باقاعدہ ایک یا دو صفحے ہوں۔

ج پیاری ارم! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ کا ناول موصول ہو چکا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں۔ فرحت اشتیاق کا ہم سفر بہت خوب صورت تھا۔ لیکن کہانی کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ ناول اس سے بھی اچھا ہے۔ ویسے پسند اپنی اپنی۔

گلاب جامن کی ترکیب دے رہے ہیں۔ مزے دار گلاب جامنیں بنا کر خود بھی کھائیں اور شوہر صاحب کو بھی کھلائیں۔ ای میل کا سلسلہ ہے۔ آپ ہمیں ای میل کریں۔ ای میل ایڈریس پرچے میں دیا ہوا ہے۔

اقرا رانی محمد اشرف۔۔۔ گاؤں بھوبڑا میکھکی منڈی

اتنا خوب صورت اور کچھ کچھ افسردہ کر دینے والا ناول ہمیں پڑھانے پر فرحت آپی کو میری طرف سے دعائیں اور ان کو مبارک باد بھی۔ راحت جبیں آپا کا ناول بھی اس ماہ بہت اچھا رہا۔ نگہت عبداللہ اور عنیزہ سید کے ناول بھی بہت اچھے چل رہے ہیں اور بہت خوب صورت بھی ہیں۔ یہ دونوں ناول مجھے پسند بھی ہیں۔

ج پیاری اقرا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

نائلہ صدف۔۔۔ اکھوڑی اٹک

ہم گاؤں میں رہتے ہیں اور رسالہ اتنی دیر سے ملتا ہے کہ جب ہم رسالہ پڑھتے ہیں تو تب تک اس سے اگلے ماہ کا شمارہ بھی شائع ہو جاتا ہے۔ اس لیے پچھلے کئی شماروں پر تبصرہ کر رہے ہیں۔

ٹائٹل سے لے کر خوب صورت بنیے تک تمام رسالہ ہی بہت زبردست ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو بشریٰ سعید کو "سفال گر" کے لیے مبارک باد۔ اپنی طرز کا بہت منفرد اور شان دار ناول تھا۔ ہمیشہ یاد رہے گا۔ فرحت جی کا "جو بچے ہیں سنگ" بہت عمدہ تحریر ہے۔ "میرے خواب لوٹا دو" نگہت عبداللہ نے تو شمشیر کو بالکل بدل دیا۔ اچھا ناول ہے۔ مگر پہلے سمجھ نہیں آتی تھی کہ یاسمین ایک ماں ہو کر ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ عنیزہ سید کا "کوہ گراں" بلاشبہ اچھی تحریر ہے۔ سارہ کا دکھ ہمیں اپنے دل پہ محسوس ہوتا ہے۔ "ساری بھول ہماری تھی" پڑھ کر دل بہت دکھتا ہے۔ اتنے خود غرض لوگ' مگر کچھ ابرار' محسن اور نبیلہ جیسے مخلص لوگ بھی ہیں۔ یہ تو تھے سلسلہ وار ناولز اب کچھ تبصرہ باقی رسالے پر۔ مئی کے شمارے میں صباحت یاسمین کا "مزاحف" بہت زبردست تھا۔ مطلب کچھ ہٹ کر۔ رمشا خالد کی تحریر بھی اچھی تھی۔ افسانوں میں عائشہ فیاض کا "ساس جیسی" اچھا رہا۔ اس کے علاوہ بھی باقی سب اچھے تھے۔

جون کے شمارے میں شہزادی عباس کا "دغا ہے" حسین اچھا تھا اور سمیرا حمید کا "لگی تھی جو جیت" زبردست تحریر تھی۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ نفسیاتی الجھنیں اچھا سلسلہ ہے۔ میں اٹک کے ایک گاؤں اکھوڑی میں رہتی ہوں۔ میرا گاؤں بہت خوب صورت ہے۔ گاؤں کی زیادہ تر لڑکیاں خواتین' شعاع اور کرن پڑھتی ہیں۔ مگر اپنے رسالے پڑھنے کے لیے کسی کو نہیں دیتیں' ہر کسی کو اپنا رسالہ خود منگوانا پڑتا ہے۔ میں بھی اپنا رسالہ خود منگواتی ہوں' پڑھنے کے لیے دوسروں کو بھی دیتی ہوں' مگر واپسی کے مطالبے کے ساتھ۔

ج پیاری نائلہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید ہمیں احساس ہے کہ چھوٹے شہروں اور گاؤں تک پرچا بہت لیٹ پہنچتا ہے۔ اس لیے تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود آپ کا خط شامل کر رہے ہیں۔

آپ کا خط اور تبصرہ بہت اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ اپنے رسالے دوسروں کو پڑھنے کے لیے دے دیتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں تنگ دلی کرنے سے آپس کی محبتیں کم ہو جاتی ہیں' جبکہ تحفہ دینے سے محبتیں بڑھتی ہیں اور خواتین ڈائجسٹ سے بڑھ کر کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ لیکن لینے والوں کو چاہیے کہ احتیاط سے پڑھ کر واپس کریں۔

شگفتہ۔۔۔ ایبٹ آباد

مجھے 15 سال ہو گئے ہیں۔ آپ کا ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے میں نے اس وقت آپ کا ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا جب میں 5th کلاس میں پڑھتی تھی اور مجھے کہانیوں کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی اور آج میں ایک اسپتال میں اسٹاف نرس کی جاب کر رہی ہوں۔ مجھے کہانی "ساری بھول" راحت جبیں کا اس ماہ شدت سے مجھے انتظار تھا۔ فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ اس میں جو سلسلہ ہے۔ "کرن کرن روشنی" وہ تو بہت ہی اچھا جارہا ہے۔

ج شگفتہ! معذرت خواہ ہیں کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے۔

پندرہ سال سے خواتین ڈائجسٹ کی قاری ہیں اور صرف دو خط؟ اب ہر ماہ باقاعدگی سے لکھتی رہیے گا۔

...حافظ آباد

پہلے گاؤں سے شہر شفٹنگ اور پھر بھائی کی شادی کی مصروفیت کی بنا پر تین ماہ سے تبصرہ محفوظ ہے۔ اس دوران عنیزہ سید کا ناول "کوہ گراں تھے ہم" شامل ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ معاشرے کے کسی نہ کسی حساس گوشے کو ٹاپک بناتی ہیں۔ اس ماہ کی سب سے خوب صورت کاوش مقدس مشعل کا "احساس زیاں" ہے۔ ہر لڑکی کو منیرہ جتنا ہی اسٹرونگ ہونا چاہیے۔

"جو بچے ہیں سنگ" میں فرحت جی سے گزارش ہے کہ سکندر کو لیزا سے دور مت کیجئے گا۔ اب سارے سنگ ام مریم کے لیے بچا کر رکھیے گا جو سزا کی حق دار ہے۔ شہریار خان کی شخصیت کے بارے میں جاننا اچھا لگا۔ بظاہر سخت لیکن اندر سے کس قدر ٹوٹی ہوئی شخصیت کا مالک ہے وہ۔ جبکہ نایاب جیلانی اس بار کچھ خاص متاثر نہ کر سکیں۔ اسٹوری کے اینڈ کی مثال کچھ ایسی ہے۔ "کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا"

ج پیاری سلمیٰ! سالگرہ کا تحفہ حاضر ہے۔ ہماری طرف سے بھائی کی شادی کی مبارک باد۔

خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔ عنیزہ سید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

سب سے پہلے ٹائٹل آج کل اچھے ٹائٹل دے رہے ہیں آپ۔ ہمارے نام میں فرخندہ انجم لاہور سے سمجھ نہیں آئی وہ کس کی بات کر رہی تھیں! کس کہانی کی طرف اشارہ تھا ان کا! قاری بہن عالیہ بتول بہار شاہ کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین) انہیں اس طرح تنقید نہیں کرنا چاہیے تھی۔

ج عائشہ! عالیہ کی تنقید ہمیں تو بری نہیں لگی۔ انہیں ٹائٹل پسند نہیں آیا تو اس کے اظہار کا انہیں حق ہے۔ فرخندہ انجم نے کہانی کی طرف اشارہ یا تبصرہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے خط کے آغاز میں اس کی وضاحت بھی کر دی تھی۔ انہوں نے ایک سوال پوچھا تھا' ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا تعلق ان کی ذات سے ہو یا کسی اور کے حوالے سے یہ سوال پوچھا ہو۔ رنگا رنگ پھول میں آپ اچھا انتخاب

بھجوائیں ضرور شائع ہوگا۔

مسرت شاہین۔۔۔ ٹاؤن شپ لاہور

اس ماہ کا شمارہ زبردست اور ٹائٹل نہایت بکواس لگا۔ (معذرت کے ساتھ) ماڈل بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ سب سے پہلے بات ہوجائے "ساری بھول ہماری تھی" راحت نے کہانی کا ٹیمپو تھوڑا چینج کیا ہے۔ سلسلے وار ناول "میرے خواب لوٹادو" بہت جان دار کہانی اور اجلال رازی کی سارہ میں دلچسپی لحاتی کشش بنے گی یا اس کی زندگی بدلے گی۔ یہ جاننا باقی ہے۔ یاسمین کی تیز طراریاں اور چالاکیاں اللہ کی پناہ۔ مجھے شمشیر علی کے انتقامی جذبات کے بارے میں کوئی یقینی صورت حال نہیں سوجھ رہی' پتا نہیں کیا کرے گا۔ بہرحال بہت خوب صورت کہانی ہے۔ "جور کے توکوں گراں تھے ہم" عنیزہ میری پسندیدہ مصنفہ رہی ہیں۔ لیکن ابھی ان کی کہانی کا بہاؤ اتنا رواں نہیں ہے۔ مجھے پری والا حصہ پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ وہ کون ہے شاید سعد جس کی تیمار داری کررہا ہے' وہ ہے۔ لیکن اس کے والدین وغیرہ۔ تجسس ہی ہے۔ تمام ناولٹ اور افسانے اچھے لگے۔ لکھاری بہنیں پوری توجہ اور تندہی سے پلاٹ تیار کرتی ہیں۔ کہانی کا بناؤ اتنا خوب صورت کہ آنکھوں کے سامنے کردار چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک فرمائش ہے اگر پوری کرسکیں۔ انٹرویو میں شاہین رشید کا انٹرویو ہونا چاہیے۔ وہ خود اتنے اچھے سوالات کرتی ہیں تو میں ان کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ آپ کے تمام مستقل سلسلے بھی اچھے لگے۔

ج پیاری مسرت! ہمیں افسوس ہے ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔
شاہین رشید پچھلے تیس سالوں سے ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے وابستہ ہیں۔ اب تک بے شمار انٹرویو لے چکی ہیں۔ وہ انٹرویو دیں گی تو ہم ضرور شائع کریں گے۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مریم عابد' صبا شفقت۔۔۔ سنجر

راحت جبیں کا یہ ناولٹ اچھا ہے۔ بس اتنا خاص متاثر نہیں کرتا۔ حالانکہ ہر چیز اس میں مناسب مقدار میں موجود ہے۔ جس ناول (سلسلہ وار) کی وجہ سے خواتین کا انتظار رہتا ہے وہ ہے فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ" بہت زبردست جارہا ہے۔ اس میں تھوڑی سی الجھن ہے۔ لیزا (ام کلثوم) تو اپنے والد کے ساتھ ہی رہی تھی اور ام مریم اپنی ماں کے ساتھ' پھر اگر ام مریم نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا بھی کیں تو بھی شروع میں تو ام کلثوم اپنے والد کے ساتھ تھی۔ تو یہ غلط فہمیاں کس طرح پیدا ہوگئیں اور ایک لمبے عرصہ تک ام کلثوم کو ذرا سا اندازہ بھی نہ ہوا۔ (یا حیرت) اس ماہ کے ڈائجسٹ میں نایاب جیلانی کا مکمل ناول "ایک رات کی بات" اچھا تھا۔ بلکہ بہت اچھا تھا۔ نازیہ کنول نازی کا افسانہ چارہ گر ایک ایسے پلاٹ پر لکھا گیا جو کہ میرے خیال میں' میں پہلے بھی ایک' دوبار اس پر کہانیاں پڑھ چکی ہوں۔ "مقصد حیات" ایک اچھا افسانہ تھا۔ نایاب جیلانی کے ناول میں جو ہیروئن کا نام ہے "عشوہ" اب اس کا مطلب کیا ہے؟ گستاخی معاف اگر برا نہ لگے تو سچ تو یہ ہے کہ "مہک اٹھے سارے موسم" ایک دم فضول افسانہ تھا۔ "محبت آزمائش بن گئی" یہ ناول بھی بس کیا کہوں اور "احساس زیاں ہوا جب" یہ سمجھ نہیں آئی۔ اس میں بتایا کیا گیا تھا۔ اب آپ یہ مت سمجھیں کہ میں نے یہ خط لکھا ہی تنقید برائے تنقید کے طور پر ہے' لیکن دیکھیں جب کوئی چیز پسند ہی نہ آئے تو جھوٹی تعریف کیا کرنی' یہ بھی اب ہم نے انہی تینوں کرن' خواتین اور شعاع سے سیکھا ہے۔ بعض اوقات تو اتنی زبردست کہانیاں شائع ہوتی ہیں کہ میں اتنی دفعہ پڑھتی ہوں کہ حفظ ہوجاتی ہیں اور بعض اوقات۔۔۔ (سمجھ جائیں۔)

ج۔ والدین کے آپس کے تعلقات خوش گوار نہ ہوں تو بچوں پر "عموماً" اس کے بہت برے اثرات ہوتے ہیں۔ ایسے گھروں میں چھوٹے بچے "عموماً" بڑے بہن بھائیوں کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ ام مریم "فطرتاً" چالاک اور مکار تھی جبکہ لزا سادہ مزاج تھی۔ ام مریم نے بڑی پلاننگ سے اسے باپ سے بدظن کیا۔
ہمیں بے حد افسوس ہے کہ اس ماہ فرحت اشتیاق اور نایاب جیلانی کے علاوہ کوئی تحریر آپ کو متاثر نہ کرسکی۔

پچھلے ماہ بہن فرخندہ انجم کا خط شائع کیا گیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

"اگر لڑکی شادی کے دن ہی سسرال کے لائے جوڑے کو ناپسند کرکے پہننے سے انکار کردے اور لڑکی کی ماں یہ کہہ کر ٹال دے' بچی ہے' آج کل کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"
ان کا سوال آج کی لڑکیوں سے یہ تھا کہ آپ کو سسرال کی کوئی چیز پسند نہیں آئی تو کیا ساس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گی؟
ہمیں اس کے جواب میں بہت سے خطوط موصول ہوئے کچھ خطوط شائع کیے جارہے ہیں۔

راحت حنا۔۔۔ لاہور

سب سے پہلے بہن فرخندہ سے کہ جیسا کہ آپ کو اللہ نے بیٹے کی ماں کا رتبہ دیا اور پھر بیٹے کی شادی کی خوشی دکھا کر آپ کو بڑائی اور عزت دی۔ آپ بھی اپنی بہو کی اس غلطی کو دلی وسعت کے ساتھ درگزر کردیں اور جہاں تک بات نئی نسل کی بچیوں سے پوچھے گئے سوال کی ہے تو میری بیٹی عائشہ جو میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر میری شادی کا جوڑا میری پسند کا نہ بھی ہو تو میں پھر بھی اسے پہن لوں گی اور دلی خوشی سے' کیونکہ میری نہ سہی کسی کی خوشی تو پوری ہوگی' اور یہاں یہ بات بھی بتاتی چلوں کہ میری شادی کا جوڑا بھی میری پسند کا نہ تھا۔ بلکہ انتہائی ناپسندیدہ کلر آتشی گلابی پر سبز کامدار پٹی کا سوٹ تھا۔ لیکن میں نے بڑے آرام سے نہ صرف پہنا تھا بلکہ خوشی خوشی پہنا تھا اور میرا اپنا ذاتی خیال یہ تھا کہ میں انتہائی بری لگ رہی ہوں گی۔ لیکن سب نے ہی میری تعریف کی تھی۔

اسماء اقبال عمران۔۔۔ لاہور

میں ابھی ساس بننے کے رشتے سے کافی دور ہوں اور زندگی کی 37 بہاریں دیکھ چکی ہوں۔ میرے خیال میں فرخندہ انجم صاحبہ نے بہت اہم مسئلے پر ہم سب کی توجہ مبذول فرمائی ہے۔ بے شک آپ نے کسی کے لیے ارمان و شوق سے شاپنگ کی ہو اور وہ آپ کی شاپنگ کو کسی خاطر میں نہ لائے تو ایسے سوال ہی جنم لیتے ہیں' لیکن ان سوالوں کے جوابات تک پہنچتے ہوئے کچھ سوالات میرے پاس بھی ہیں۔
کیا لڑکے کی ماؤں نے کبھی اس چیز پر غور کیا ہے کہ وہ بہو کس گھر سے لارہی ہیں؟ وہ حیثیت میں برابر ہیں؟ اوپر ہیں یا نیچی ہیں؟ اگر برابر حیثیت کے ہیں تو غور فرمایئے کہ آپ کی بہو کیا بہت اچھے؟ درمیانے؟ یا برے کپڑے پہنتی ہیں؟
دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اصول اپنے لیے کچھ اور دوسروں کے لیے کچھ اور ہے یہاں پر ہی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ بیٹی اپنی پسند سے ہر چیز لے اور بہو ہماری پسند کی ہوئی چیزوں پر "آمنا" "صدقنا" ہوجائے۔
باوجود اس کو پسند کرے۔ یہ تو دہرا معیار ہے۔
ہوتا کچھ یوں ہے جب بری کی تیاری ہورہی ہوتی ہے تو لڑکے سے خوب پیسے ہونے والی بیوی کے نام پر بٹورے جاتے ہیں۔ مگر جب بری تیار ہوتی ہے تو دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا ہے' یہ چیز کہیں کہیں پائی جاتی ہے' مگر ہر جگہ نہیں' بعض ساسیں تو دل کے ارمان بھرپور طریقے سے سرانجام دیتی ہیں۔
اور لڑکی کی ماؤں کے لیے بھئی پلیز رشتے کی نزاکت کو سمجھنا چاہیے اور اپنی بیٹی کو "دل کو سمجھاؤ" کی تربیت کرنی چاہیے۔ اس فارمولا کے ساتھ کہ ہر اچھی چیز تمہارے لیے نہیں ہے۔ کبھی کبھی ان چیزوں پر بھی کمپرومائز کرنا چاہیے جو تمہیں پسند نہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر آپ اپنی بری کے اچھے برے سب جوڑے پہن لیں تو ساری زندگی تعریف ہی ملتی ہے' بد تعریفی نہیں ہوتی' جیسے میری بری لال' پنک' جوڑوں سے بھری پڑی تھی اور میری مرحومہ ساس (اللہ غریق رحمت کرے) فرماتی تھیں کہ اسماء نوں لال رنگ بڑا سجتا ہے! اور مجھے سچی مچی یقین آگیا تھا۔ تو بزرگوں کی دعائیں لیں نہ کہ بددعائیں۔

رضوانہ مشہود۔۔۔ ناتھ کراچی

جولائی کے خواتین میں فرخندہ آنٹی کا خط پڑھا۔ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ جان کر بہت دکھ ہوا۔ آپ نے انہیں کافی مدلل جواب دیا۔ شاید اسے پڑھ کر انہیں کچھ ذہنی سکون ملا ہو۔ اس سلسلے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لیے میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتی ہوں۔
اکتوبر 2011ء میں میری شادی ہوئی ہے۔ میری ساس حیات نہیں ہیں۔ سسر صاحب' ایک شادی شدہ نند

اور دو غیر شادی شدہ نندیں ہیں۔ میرے شوہر اکلوتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے بری اور بارات' ولیمہ کے جوڑے دیکھ کر حیرت اور صدمے سے اپنی زبانوں کو کچھ بھی کہنے سے بہت مشکل سے روکا۔ خود مجھے اور میری فیملی کو دھچکا سا لگا تھا۔ لیکن نہ میں نے' نہ میری فیملی نے اعتراض کا ایک بھی حرف زبان سے ادا کیا۔ نہ چہرے سے ظاہر کیا کہ بقول امی' ابو اور تمام مخلص لوگوں کے۔ زندگی ان چیزوں سے نہیں' محبت' خلوص اور اپنائیت سے گزرتی ہے اور میں بھی مادی اشیا کو بہت اہمیت نہیں دیتی۔

لیکن وہ دن تو میری بھی زندگی میں ہر عام لڑکی کی طرح ایک ہی بار آیا تھانا... اب تو لوٹ کے نہیں آئے گا۔

سسرال والوں کے جذبات اور خوشیوں کا ہر طرح خیال رکھا۔ کسی چیز اور بات پر اعتراض نہیں کیا اور پیاری قارئین بہنوں اور فرخندہ آنٹی نہایت افسوس اور دکھ سے لکھ رہی ہوں کہ وہ محبت' اپنائیت اور خلوص مجھے شروع سے لے کر اب تک نہیں ملا جو میری نظر میں مادی اشیا سے کہیں قیمتی ہے۔ بہت آزمائش میں ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

حنا زین... واہ کینٹ

سب سے پہلے ادارے کا شکریہ جس نے فرخندہ انجم کے سوال کے جواب کے سلسلے میں ہم قاری بہنوں کو دعوت دی۔ ان کا سوال پڑھ کر بے اختیار یہ بات ذہن میں آئی کہ یہ شادی سراسر لو میرج ہے' جس میں ساس کو باور کروا دیا گیا ہے کہ آپ کی حیثیت کیا ہے۔

پھر غور سے بار بار پڑھا تو اس میں یہ جملہ کہ "ایک ماں پالتی ہے' پڑھاتی ہے اور اس کے لیے لڑکی تلاش کرتی ہے۔" پرانٹک گئی کہ مشہور ہے کہ لڑکی دیکھنے جاؤ تو اس کی ماں کو دیکھو' میرا نہیں خیال کہ لڑکی کی ماں کوئی سمجھ دار خاتون ہیں۔ ورنہ ساری زندگی پڑی ہے اپنی مرضی کی چیز پہننے کے لیے۔ ہر ماں بری بناتے وقت اپنے تمام ارمان نکالتی ہے۔ مجھے بے حد دکھ پہنچا کہ ایک لڑکی نے اتنا بھی کمپرومائز نہیں کیا' کیا ہوا اگر اس کے معیار کا جوڑا نہیں تھا۔ محبتوں کا بدل کچھ نہیں ہے۔

آج سے پندرہ سال پہلے جب ہم اپنے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے تھے تو ہماری ایک آنٹی نے بہت اچھی بات کہی کہ لڑکی ایسے گھر سے لائیں جہاں باپ کا ہولڈ ہو' ماں کا نہیں۔ آپ یقین کریں میں نے بہت مشاہدہ کیا واقعی لڑکیوں کی شخصیت میں واضح فرق محسوس کیا۔

بینا شاہ... ٹوپی صوابی

فرخندہ آنٹی مجھے لگتا ہے کہ یہ آپ کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس لیے آپ کو بہت دکھ پہنچا۔ آپ یہ سوچیں کہ اسی طرح ایک لڑکی کا ارمانوں بھرا دل اس وقت ٹوٹتا ہے جب وہ ایک ناپسندیدہ جوڑے کو نکاح والے دن مجبوراً" پہنتی ہے۔ جس دن کے لیے اس کے دل میں ہزاروں خواہشیں ہوتی ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ سب سے خوب صورت نظر آئے اور وہ یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ چلو اس دفعہ ساس کی مرضی' اگلی دفعہ اپنی مرضی' وہ لڑکی سمجھوتہ تو کر لیتی ہے' لیکن ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ۔

مسرت شاہین... ٹاؤن شپ لاہور

میرے خیال میں جب آپ اپنی بہو کا انتخاب کرتے ہیں چاہے آپ خود کریں یا بیٹا۔ دل سے راضی ہوں یا اوپری دل سے ... ہونا تو پڑتا ہے تو پھر اپنی پسند کے بجائے باہمی رائے و مشورہ سے تمام جیولری' جوڑا اور دیگر آرائشی سامان دلہن اور بیٹے کی والدہ مل کر منتخب کریں۔ دوسری بات بہو نے دوسرے ماحول' گھرانے سے آکر آپ کا گھر آباد کرنا ہوتا ہے تو آپ کو دل بڑا کرنا چاہیے نہ کہ آتے ہی اس کے لیے دل میں بغض اور عناد رکھ لیں۔ جب آپ نے اسے اپنے گھر میں جگہ دینی ہے تو پہلے اسے دل میں جگہ دیں۔

لیکن ہمیشہ شادی کے موقع پر بہو کی رائے کا احترام کریں۔ اس کو پسند کا حق دیں تو ضرور اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔

☆

روشن حرف وہ سارے

اقرا شفقت وفا

جیسے ہی ہوش میں قدم رکھا' خوابوں کی حقیقت' شہزادوں کے خیالات' آزمائش حالات سب اس شاعری سے جانا' مانا اور بیان کیا۔

1 لبوں پر اکثر موقعوں کے حساب سے شعر جاری ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنی حساسیت اور طبیعت کا بتانا ہو تو...

میرے تعارف کے لیے اتنا ہی کافی ہے
میں اس کا ہرگز نہیں ہوتا جو ہر کسی کا ہو جائے

یا اگر کسی درد کی کیفیت میں ہوں تو...

کوئی دکھ ہو' غم ہو' درد کوئی ہو عدیم
مسکرانا پڑ ہی جاتا ہے زمانے کے لیے

2 اعتبار ساجد کی یہ غزل مجھے میری دوست نے ایس ایم ایس کی' اس کے بعد ان کو پڑھا۔

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں' مجھے کوئی شام ادھار دو
یہاں کسی کو کسی کے حال سے' نہ کوئی غرض ہے' نہ واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو' میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو
میری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے تنہائیوں کے عذاب نے
میرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا' میری دھڑکنوں کو قرار دو
وہاں گھر میں کون ہے منتظر کہ فکر ہو دیر سویر کی
بڑی مختصر سی یہ رات ہے' اسے چاندنی میں گزار دو

3 شعر! آہم!! ویسے اس سوال کا جواب تو ہے' مگر مسئلہ ہے یادداشت کا' ارے رکیے رکیے! مجھے یاد آگیا۔

ایک بار میری دوست نے میری شاعری کے حوالے سے ایک شعر پڑھا تھا' اس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا۔

چھوٹے سے قد کی لڑکی چھوٹی سی شاعرہ ہے

بعد ازاں ہمیں چھوٹا قد کہنے پہ محترمہ کی جو درگت بنی وہ... ایک مرتبہ میری جونیئر نے مجھے دوستی کی پیش کش کرتے ہوئے کہا تھا۔

کسی کی کیا مجال تھی جو ہمیں خرید سکتا
ہم تو خود ہی بک گئے خریدار دیکھ کے

اور اسی دوست سے جب ملاقات ہوتی' وہ یہ شعر پڑھتی۔

وہ مجھے دیکھ کے نگاہیں جھکا لیتی ہے
میں نے کاغذ پہ بھی بنا کے دیکھی ہیں آنکھیں اس کی

4 ریڈیو پہ سنتے ہوئے غزلیں لکھنا بہت پرانی عادت ہے۔ کئی غزلیں پسند آئیں' مگر مجھے یہ غزل اچھی لگی۔

اے جذبہ دل گر میں چاہوں' ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے
اے دل کی خلش چل یوں ہی سہی' چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا' جب رنگ پہ محفل آجائے
اے رہبر کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے
اس وقت مجھے بھٹکا دینا' جب سامنے منزل آجائے
ہاں یاد مجھے تم کر لینا آواز مجھے تم دے لینا
اس راہ محبت میں کوئی درپیش جو مشکل آجائے
اب کیوں ڈھونڈوں وہ چشم کرم ہونے دے ستم بالائے ستم
میں چاہتا ہوں اے جذبہ غم' مشکل پس مشکل آجائے

5 شاعر نامعلوم ہیں' مگر یہ غزل میرے دل کو بہت بھاتی ہے' آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہے

کبھی بن سنور کے آگئے بہار حسن دکھا گئے
میرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل' کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل' وہ دکان اپنی بڑھا گئے
میرے پاس آئے تھے دم بدم' وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چراغ نے کیا ستم کہ مجھ سے آنکھیں چرا گئے

میرے پاس آئے تھے دم بدم' وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چراغ نے کیا ستم کہ مجھ سے آنکھیں چرا گئے

☆

آپ کا باورچی خانہ

طوبیٰ دانش

1۔ ماہ رمضان کی رونق افطار سے سجے دستر خوان سے دوبالا ہو جاتی ہے بلکہ سچ پوچھیں تو جو مزا مجھے رمضانوں میں نت نئی ڈشیں پکانے اور کھلانے میں (ارے بھئی! کھانے میں بھی) آتا ہے وہ ہمیشہ سے بڑھ کر ہے ۔جہاں تک غذائیت اور صحت کا خیال ہے وہ سحری میں تو پھر بھی رکھ لیا جاتا ہے کہ زود ہضم غذائیں اور دہی وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر افطار میں تو یوں سمجھ لیں کہ صحت غذائیت اور گھر والوں کی پسند یعنی "لذت" کا آپس میں مقابلہ ہوتا ہے اور جیت ہمیشہ "لذت" ہی کا مقدر بنتی ہے اور کیوں نہ ہو' جب گھر میں سب ہی پکانے میں ماہر ہوں یا نہ ہوں۔ کھانے اور تبصرہ کرنے میں اولیٰ درجے کے ماہر ہوں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں چند ماہرانہ تبصرے۔

"اوہ! آج یہ فروٹ چاٹ کچھ پھیکی لگ رہی ہے۔ چاٹ مسالا ختم ہو گیا کیا؟" (دستر خوان پر نظر دوڑاتے ہوئے)

"کیا آج وہی بڑے صرف میٹھے والے ہی ہیں؟ بھئی! مجھے تو نمکین میں زیادہ مزا آتا ہے (وہی بڑے کا پورا "بڑا" منہ میں رکھتے ہوئے)

"اف! یہ مرچوں کے پکوڑے زیادہ کیوں نہیں بنائے؟"

(سی سی کرتے ہوئے)

تو بس سمجھ جائیں کہ مجھے کس چیز کا زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے (آخر اپنی تعریفیں بھی تو سننا اچھا لگتا ہے نا؟)

2۔ مہمان اچانک آجائیں تو ۔۔۔ جی جناب اس کا تجربہ بھی اکثر بلکہ پچھلے رمضانوں میں ہو چکا ہے' جب افطار سے چند لمحے قبل قریبی عزیز کا فون آیا کہ ہم لوگ آرہے ہیں (جو تقریباً "5 افراد تھے) اب چیزیں تیار اور ہم حیران پریشان کہ اب کیا ہوگا۔ امی نے تسلی دی اور ساتھ ہی گُر کا کہ بس جو بھی ہے' وہ سامنے رکھنا اور منہ مت بناؤ۔۔۔ اور یقین کریں کہ وہ جو کہتے ہیں کہ "مہمان اللہ کی رحمت" تو ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ "رمضان برکت ہی برکت" وہی افطاری جس سے گھر کے افراد پورا انصاف کیا کرتے تھے مہمانوں کے انصاف پر بھی پوری اتری۔ بس جی! دستر خوان چھوٹا ہو یا بڑا' اپنا دل ضرور بڑا رکھیں۔ اللہ تعالیٰ برکت ڈال دیتا ہے۔ مہمانوں نے خاص طور پر میری اس ڈش کی بہت تعریف کی اور مزے لے لے کر کھائی۔

کچوری

ضروری اجزا :

میدہ	ایک کلو
چنے کی دال	3/4 کپ
اجوائن پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
سونف پاؤڈر	1/4 کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	1 چٹکی
سرخ مرچ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک پیالے میں میدہ لے کر اس میں 3/4 کپ تیل اور ایک کھانے کا چمچہ نمک ڈال کر پانی کی مدد سے گوندھ لیں۔

دیگچی میں 5-4 گلاس پانی ڈال کر اس میں چنے کی دال درمیانی آنچ پر پکائیں۔ 30 منٹ بعد اس میں اجوائن پاؤڈر' سونف پاؤڈر' گرم مسالا پاؤڈر' سرخ مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ اس کا پانی خشک ہو جائے۔ اس آمیزے کو پیس لیں یا مشین سے گزار لیں۔ فرائی پین میں ڈیپ فرائنگ کے لیے تیل ڈال کر گرم کریں۔ گوندھے ہوئے میدے کی تھوڑی مقدار لے کر اس کے درمیان میں دال کا آمیزہ (اتنی مقدار میں رکھیں کہ پیڑا پھٹنے نہ پائے) رکھ کر پیڑا بنالیں' اسی طرح سارے پیڑے بنالیں اور انہیں ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیڑوں کو گول کچوری کی شکل میں بیل لیں اور گرم تیل میں ڈال کر تیز آنچ پر فرائی کرلیں۔ ہلکی سنہری ہو جائیں تو گرما گرم کچوریاں سرونگ ڈش میں نکال کر آلو چنے کی ترکاری کے ساتھ پیش کریں۔

3۔ کچن / رسوئی / مطبخ خانہ / باورچی خانہ یہ جتنے بھی نام ہیں ہر لڑکی اور عورت کے لیے لازم و ملزوم ہیں خاص طور پر "آپ کا باورچی خانہ" یہ نام بھی آپ نے اچھا ہی رکھا ہے کیونکہ واقعی یہ ہر لڑکی ہر عورت کے لیے اس کا اپنا ہی ہوتا ہے اور ایک صاف ستھرا' سجا ہوا باورچی خانہ ہی گھر کی خواتین کے سلیقے کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے لہٰذا مجھے بھی اپنا باورچی خانہ سجانے کا جنون ہے۔

4۔ سحری میں روٹی / کم تلے ہوئے یا سینکے ہوئے پراٹھے' سبزی' شوربہ دار سالن' آلو کی قتلیاں (چپس)' کھجوریں' نمکین لسی یا دہی۔ کھجلہ' پھینی وغیرہ استعمال ہوتا ہے (اب آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم لوگ ایک ہی وقت میں یہ سب کچھ کھاتے ہیں یہ تو پورے رمضان بھر کا شیڈول ہے بھئی اب ہمارے گھر والے اتنے بھی پیٹو نہیں۔

عید پر ناشتے کا اہتمام بہت زور و شور سے کرتی ہوں' کیونکہ میرے خیال میں جب یہ تہوار ہمارے لیے "بہت خاص" ہے تو پھر اس دن ہر بات' ہر چیز "بہت خاص" ہی ہونی چاہیے۔ عید کی صبح میں ناشتے پر "سرخ تل والا تکہ" بناتی ہوں' جو بہت لذیذ ہوتا ہے۔ آپ بھی ضرور ٹرائی کیجیے گا۔ (اور ہاں! پھر مجھے داد دینا ہرگز نہ بھولیے گا۔)

5۔ رمضانوں میں باہر کھانا ممکن ہی نہیں البتہ آخری روزوں میں کبھی عید کی شاپنگ کے دوران ایک آدھ روزہ مارکیٹ میں کھولنا پڑ جائے تو وہی مجبوراً" کھولتے ہیں ورنہ جو مزہ گھر کی افطاری میں وہ مزہ کہاں اشیائے بازاری میں۔

6۔ موسم کے پکوان ۔۔۔ سردی' گرمی' خزاں' بہاران سب سے جدا ایک موسم ہے "رمضان کا موسم" اس کی مناسبت سے پکوان کا لطف ہی اور ہے' پھر آج کل آموں کی سوغات موجود ہے تو آم کا شیک اور مینگو سلاد استعمال کر کے اس موسم رمضان کا لطف لیجیے۔

7۔ اچھا کھانا پکانا بھی ایک فن ہے۔ اس میں مہارت تو محنت' شوق اور لگن سے آہی جاتی ہے' مگر میرے خیال میں ہاتھ کا قدرتی ذائقہ بھی کسی عام سے کھانے کو خاص یا اچھا بناتا ہے۔

8۔ اگر کبھی سالن وغیرہ زیادہ بھون لیا جائے یا جل جائے تو پریشان نہ ہوں بلکہ دوسری دیگچی میں آرام سے پلٹ لیں اور بہت سارا دودھ ڈال کر دھیمی آنچ پر رکھ دیں چند منٹ بعد بو ختم ہو جائے گی اور رنگت بھی صحیح ہو جائے گی۔

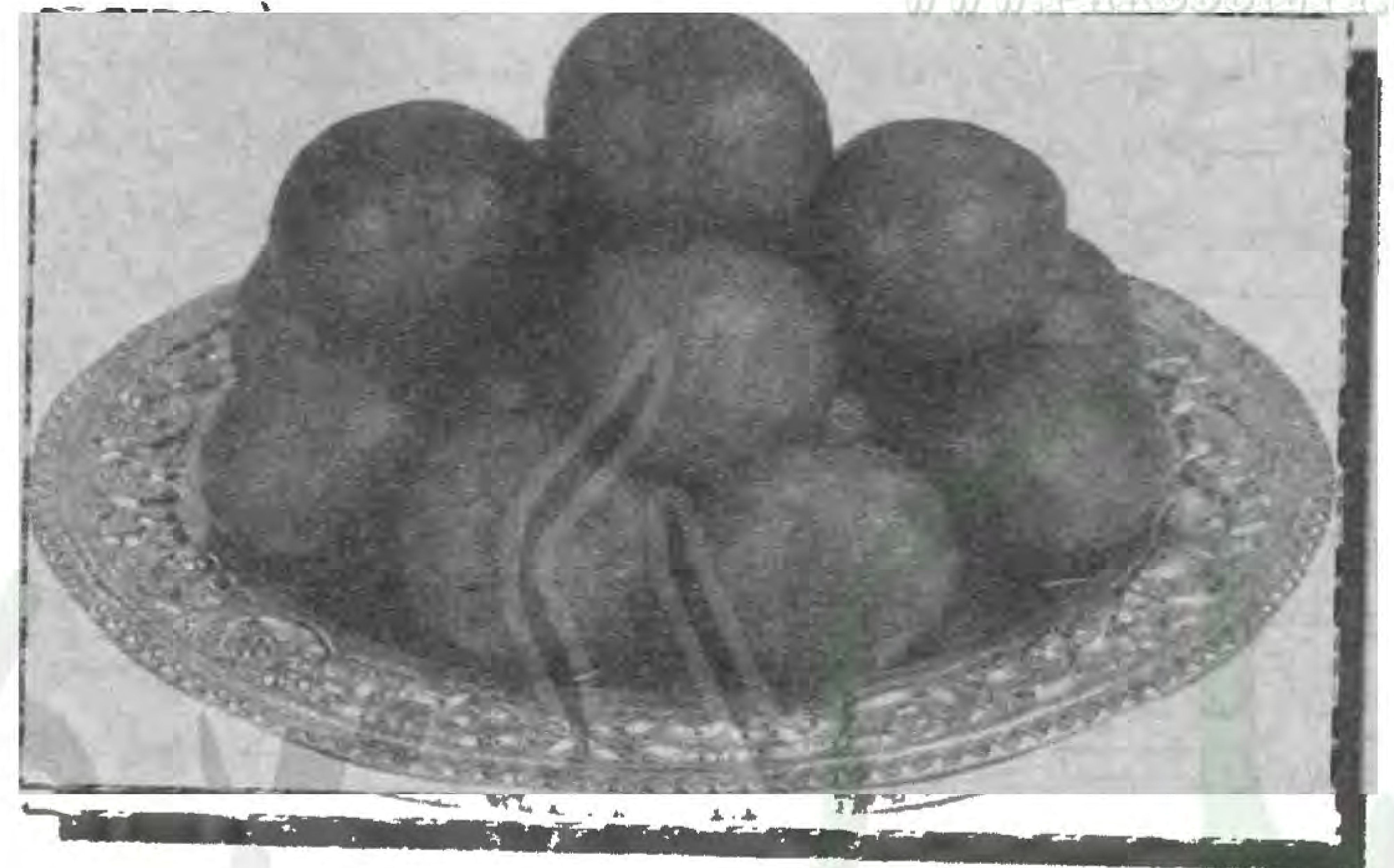
سرخ تل والا تکہ

ضروری اجزا :

مرغی (چکن تکہ پیس)	ایک عدد
لہسن' ادرک پیسٹ	1/2 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
خشخاش	1/2 چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
لیموں کا رس	2 کھانے کے چمچے
دہی	1/2 کپ
جائفل' جاوتری پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
ووسٹر شائر سوس	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	2 کھانے کے چمچے
تل	2 کھانے کے چمچے
کھانے کا سرخ رنگ	1/2 چائے کا چمچہ

ترکیب :

گوشت میں نمک' لال مرچ پاؤڈر' سیاہ مرچ پاؤڈر' لہسن' ادرک پیسٹ' گرم مسالا پاؤڈر' خشخاش' لیموں کا رس' جائفل' جاوتری' دہی' ووسٹر شائر سوس' تیل' تل اور کھانے کا رنگ لگا کر اچھی طرح سے مکس کر کے ایک گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد اسے باربی کیو کریں۔ روسٹ کریں یا پھر تیل میں فرائی کرلیں اور چٹنی کیچپ اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔ ✡



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گلاب جامن

ضروری اشیا:

خشک دودھ	دو کپ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سوڈا	ایک چٹکی
انڈا	ایک عدد
گھی	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	دو کپ
پانی	دو کپ
الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

خشک دودھ میں میدہ، بیکنگ پاؤڈر، سوڈا اور گھی مکس کر دیں اور انڈے سے گوندھ لیں اور چھوٹی چھوٹی بالز بنا کر ہلکے گرم تیل میں ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔ گولڈن کلر آجائے تو شیرے میں ڈال کر پکائیں گلاب جامن پھول جائیں تو الائچی پاؤڈر ڈالیں۔ ڈش میں نکال کر بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

شاہی ٹکڑے رنگین سویوں کے ساتھ

ضروری اشیا:

رنگین سویاں	ڈیڑھ کپ
دودھ	ایک لیٹر
چینی	آدھا کپ
کھویا	آدھا کپ
بادام، پستہ (کترے ہوئے)	حسب ضرورت
ڈبل روٹی کے سلائس	آٹھ عدد
تیل یا گھی	تلنے کے لیے
چینی	آدھا کپ
پانی	آدھا کپ

ترکیب:

دودھ کو ابال لیں اور چینی اور سویاں ڈال کر پکائیں

سویاں نرم ہو جائیں تو چولہا بند کر دیں اور ڈش میں نکال لیں۔

ڈبل روٹی کو حسب پسند شیپ میں کاٹ کر تل لیں۔ چینی میں پانی ڈال کر پکائیں کہ چینی گھل جائے۔ اب تلے ہوئے سلائس شیرے میں ڈال کر نکال کر سویوں پر رکھیں۔ سلائس پر کھویا، بادام، پستہ رکھ کر پیش کریں۔

سویوں کا زعفرانی زردہ

ضروری اشیا:

سویاں	ایک پیکٹ
گھی	آدھا کپ
الائچی (کچلی ہوئی)	چھ عدد
چینی	ایک کپ
دودھ	ایک کلو
(پکا کر گاڑھا کرلیں)	
کھویا	ایک پاؤ
زعفران	ایک چائے کا چمچہ
زعفرانی ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
زعفرانی رنگ	ایک چٹکی

ترکیب:

ایک کڑاہی میں گھی گرم کریں۔ الائچی ڈالیں پھر سویوں کو ڈال کر ہلکی آنچ پر بھونیں۔ اب چینی، زعفران، زعفرانی رنگ، دودھ ڈال کر مکس کریں اور پانچ منٹ پکائیں۔ اب کھویا مکس کردیں اور دم پر رکھ دیں۔ سویاں الگ الگ ہو جائیں تو زعفرانی ایسنس، ناریل، کشمش مکس کردیں اور ڈش میں نکال لیں۔ کھوئے، پستہ، بادام، ناریل، کشمش سے سجاوٹ کر دیں۔

انڈوں کے گلگلے

ضروری اشیا:

انڈے	دس عدد
میدہ	ایک کپ
چینی	دو کپ
گھی یا مکھن	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

ایک بڑے پیالے میں انڈے پھینٹ لیں۔ اس میں میدہ شامل کر کے دوبارہ پھینٹیں۔ اب بیکنگ پاؤڈر شامل کر کے دوبارہ اچھی طرح یک جان کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ آدھا کپ پانی میں چینی شامل کر کے ابال لیں۔ ذرا سا لیموں کا رس شامل کر دیں۔ جب چینی مکمل حل ہو جائے تو اس شیرے کو چھان لیں۔ چھاننے کے بعد شیرہ ابال لیں۔ گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ پھر چولہے سے اتار لیں۔ گھی یا مکھن الگ برتن میں گرم کرلیں۔ اب انڈوں کا مرکب چمچہ بھر کر اس میں ڈال کر تل لیں۔ سنہرے ہو جانے پر نکال لیں اور شیرے میں ڈال دیں۔ تاکہ وہ اسے اچھی طرح جذب کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد نکال کر پیش کریں۔

ہرا مسالا چکن

ضروری اشیا:

چکن	ایک کلو
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
پودینہ	آدھا گٹھی
ہری مرچیں	آٹھ عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
بادام	آٹھ عدد
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں	ایک عدد
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (پسی ہوئی)	دو عدد
تیل	آدھا کپ
دہی	آدھا کپ

ترکیب :

کھلے منہ کی ایک دیگچی میں تیل گرم کریں۔ اس میں چکن فرائی کرلیں اور نکال لیں۔ اب اسی تیل میں پسی پیاز، لہسن، ادرک پیسٹ فرائی کریں۔

پیاز فرائی ہو جائے تو ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ، زیرہ بھون کر بلینڈر میں پیس لیں اور پیاز کے آمیزے میں ڈالیں۔ فرائی چکن بھی ڈال دیں اور دہی پھینٹ کر ڈالیں اور اچھی طرح ملا کر دیں۔ جب مسالا اور دہی کا پانی خشک ہو جائے تو گرم مسالا، لیموں کا رس چھڑک کر ڈش میں نکال لیں۔ اوپر سے بادام کتر کر پیش کریں۔

چکن نہاری

ضروری اشیا :

مرغی کا گوشت	ایک کلو
نہاری مسالا	ایک پیکٹ
گھی	ڈیڑھ کپ
لہسن، ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
پیاز	ایک عدد (سلائس کاٹ لیں)
آٹا	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھا کپ
ہری مرچیں	دو عدد (چوپ کرلیں)

ادرک کے سلائس، لیموں سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

دیگچی میں گھی گرم کر کے پیاز ڈال کر سنہری کرلیں۔ لہسن، ادرک پیسٹ اور گوشت ڈال کر بھونیں۔ نہاری مسالا ڈال کر مزید بھونیں اور حسب ضرورت پانی شامل کر کے ڈھک کر پکائیں۔ آٹا ایک کپ پانی میں گھول لیں۔ گوشت گل جائے اور حسب پسند شوربہ باقی رہ جائے تو آٹا اور نمک شامل کردیں۔ چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ ڈھک کر دھیمی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ تیل الگ ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال لیں۔ الگ ڈش میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں، ادرک کے سلائس اور لیموں کی قاشیں سجا کر نہاری کے ساتھ پیش کریں۔

ویجی ٹیبل آملیٹ

ضروری اشیا :

انڈے	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز (چوپ کرلیں)	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
(بیج نکال کر باریک کاٹ لیں)	
ہرا دھنیا	آدھا کپ
ہری مرچیں (باریک کترلیں)	دو عدد
تیل	چوتھائی کپ
دودھ	چوتھائی کپ

ترکیب :

پیالے میں انڈے، نمک، لال مرچیں اور دودھ ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ انڈوں میں پیاز، ٹماٹر، ہرا دھنیا، ہری مرچیں ڈال کر پھینٹیں۔ فرائی پان میں تیل گرم کر کے آملیٹ کا آمیزہ ڈال کر آنچ ہلکی کر دیں۔ ڈھک کر ایک منٹ تک پکائیں۔ آملیٹ سیٹ ہو جائے تو پلٹ کر دوسری طرف سے پکائیں۔ دونوں طرف سے پک جائے تو پلیٹ میں نکال کر پراٹھے کے ساتھ پیش کریں۔



خالدہ جیلانی



حنا کنول ——— حویلی لکھا

محبتوں میں تو ملتا ہے یا اُجڑ جانا
مزاجِ عشق میں کب اعتدال رکھتا ہے

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

عشق ٹھہرا تو پھر انا کیسی
وہ نہ بدلے تو ہم بدل جائیں

شگفتہ ——— ایبٹ آباد

بقا کی فکر کرو خود ہی اپنی زندگی کے لیے
زمانہ کچھ نہیں کرتا کسی دوسرے کے لیے
مزا تو تب ہے اُس راہ پر بھی چراغ جلاؤ
جو صدیوں سے ترستی ہے روشنی کے لیے

سادیہ چوہدری ——— ڈوگہ گجرات

قتل چھپتے تھے کبھی سنگ دیوار کے بیچ
اب تو کھلنے لگے مقتل بھرے بازار کے بیچ
دیکھے جاتے نہ تھے آنسو مرے جس سے محسن
آج ہنستے ہوئے دیکھا اُسے اغیار کے بیچ

تانی چوہدری ——— آکسفورڈ یوکے

زیست ہے کتنا کٹھن کام کوئی کیا جانے
عشق الزام سہی الزام کوئی کیا جانے
میں نے اک روز مسرت کی تمنا کی تھی
بھیگی اشکوں میں ہر اک شام کوئی کیا جانے

ثمرہ، اقرا ——— کراچی

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

عائشہ، تحریم ——— گوجرہ

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

مہوش ڈوگر ——— گوجرانوالہ

اگر پڑ جائے عادت آپ اپنے ساتھ رہنے کی
یہ ساتھ ایسا ہے کہ انسان کو تنہا نہیں کرتا
زمین پیروں سے کتنی بار دن میں نکلتی ہے
میں ایسے حادثوں پر دل مگر چھوٹا نہیں کرتا

یاسمین کنول ——— پسرور

میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ کچھ پیش کروں
جس میں تابندہ ستاروں کی چمک شامل ہو
جس میں گزرے ہوئے لمحات کی تصویریں ہوں
جس میں انجان جزیروں کی مہک شامل ہو

سمیرا ملک ——— ٹوبہ ٹیک سنگھ

وہ جو روٹھا ہوا ہے مدت سے
کاش وہ آن ملے عید کے روز
میں نے کچھ خواب سے بُن رکھے ہیں
وہ ملاقات کرے عید کے روز

انیس فاطمہ ——— پسرور

تارے اُترے جب پھیلایا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو
چاند رات کی مہندی مجھ سے کہتی ہے
تم بھی اک پیغام لکھو ناں ساجن کو

تسلیم اختر ——— کچا کھوہ خانیوال

دل میں احساسِ جُدائی کا اندھیرا ہے ابھی
چاند دیکھا ہی نہیں عید منائیں کیسے

بُشریٰ لودھی ——— میانوالی

عید کی سچی خوشی تو دوستوں کی دید ہے
سامنے جب تو نہیں تو خاک میری عید ہے

توبیہ نذیر ——— بھائی والا فیصل آباد

بڑی مشکل سے فلک پہ نظر آتا ہے
عید کے چاند نے انداز تمہارے سیکھے

✡

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ









خبریں و گبیں

تبصین نشاط

ذمہ دار

شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والے اعصام الحق اور پریوں جیسے حسن کی مالک فاہا اکمل کو ایک حسین تعلق میں بندھے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ شاید اسی لیے اس شادی سے کچھ لوگوں کے دل میں بھڑکنے والی آگ ابھی تک سرد نہیں ہوئی ہے' جب ہی تو ان حاسدین نے ان کے تعلقات میں سرد مہری کی "افواہ" اڑا دی۔ کسی بھی خبر کو سب سے پہلے نشر کرنے کے جنون میں مبتلا میڈیا نے اس "افواہ" کو "خبر" بنانے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ کئی چینلز نے ان کی طلاق کی خبر چلا دی۔ فاہا اکمل اور ان کے سرپرستوں کی جانب سے بیانات بھی چلا دیے کہ اعصام کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ فاہا کو مناسب وقت نہیں دے پاتے۔ لہٰذا دونوں میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہو سکی اور فاہا نے اعصام سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔

خبر نشر ہوتے ہی عوامی حلقوں میں تبصرے شروع ہو گئے (ہمارے قومی مزاج کے عین مطابق) کوئی اس خبر پر بے حد خوش تھا تو کچھ لوگوں کو فاہا سے ڈھیروں شکایتیں ہو گئیں۔ ایک دل جلا تبصرہ آیا کہ فاہا کو ایک جملہ کہنے میں جتنا وقت درکار ہوتا ہے' اتنا وقت تو اعصام کے پاس ہے بھی نہیں۔ کسی نے اسے "چائنا برانڈ" شادی قرار دیا۔ ابھی یہ تبصرے جاری تھے کہ پھر خبر آئی کہ یہ خبر ہی غلط ہے۔ کسی نے فیس بک پر فاہا اکمل کے نام سے آئی ڈی بنائی اور اس میں یہ خبر لکھ دی۔

فاہا نے میڈیا پر جب یہ خبر سنی' تب انہیں پتا چلا کہ ان کی لندن میں موجودگی کو کیا رنگ دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے فوراً" تردیدی بیان جاری کر دیا۔

(یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہلے والی خبر جھوٹی تھی تو اس وقت میڈیا پر فاہا اور ان کے سرپرستوں کی طرف سے بیانات کیسے جاری ہو گئے؟ اس سوال کا جواب تو صرف ہمارا "ذمہ دار میڈیا" ہی دے سکتا ہے۔)

ایک اور تنازعہ

خود کو "نمبرون ہیروئن" سمجھنے کے جنون میں مبتلا میرا شاید "اسکینڈلز" میں بھی نمبرون ہی رہنا چاہتی ہیں جب ہی تو دیتا کی ٹکر پر آئے دن ان کا بھی کوئی نہ کوئی اسکینڈل کھڑا ہو جاتا ہے۔ امریکی پائلٹ نوید پرویز سے منگنی اور پھر ان کے والد سے خاصی بڑی رقم اور مکان ہتھیا لینے کی خبریں ابھی محو پرواز ہی تھیں اور کسی خاص مقام پر "لینڈ" کرنے کی نوبت نہیں آنے پائی تھی کہ ایک اور تنازعہ گونج اٹھا۔ لندن میں رہائش پذیر ڈاکٹر سمیرا علی نے دعوا کیا ہے کہ میرا نے اپنی مختلف ضروریات کے لیے ان سے ایک لاکھ پاؤنڈ کی رقم



ادھار لی تھی' تاہم ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت جانے کے بعد بھی واپس نہیں کی۔ جب ڈاکٹر سمیرا نے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو میرا نے انہیں پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ ڈاکٹر سمیرا نے یاد دلایا کہ وہ میرا کی سوتیلی چھوٹی بہن شائستہ بخاری کے دوست سہیل خان کی ہمشیرہ محترمہ ہیں۔ وہی سہیل خان جن سے شائستہ شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ تب میرا اپنی چھوٹی بہن شائستہ بخاری کے وجود ہی سے انکاری ہو گئیں۔ (لو کر لو گل! ویسے اس میں میرا کا کیا قصور..... آج کے نفسا نفسی کے دور میں جب سگے رشتے ہی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تو پھر شائستہ تو میرا کی سوتیلی بہن ہیں نا.....) پھر اس کے اگلے ہی دن میرا کو یاد آ گیا کہ ان کی شائستہ نامی ایک چھوٹی بہن بھی ہیں۔ (ہماری فلموں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سر پر چوٹ لگنے سے گمشدہ یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ شاید میرا کے سر پر بھی.....) تاہم میرا رقم ادھار لینے سے اب بھی انکاری ہیں۔ (تو پھر ایک چوٹ اور.....)

ہوائی روزی

شوبز کو ہوائی روزی سمجھا جاتا ہے۔ آج کام مل رہا ہے تو کیا بھروسا کل کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے' سو اکثر عقل مند فنکار اس کو ذریعۂ معاش بنانے سے گریز ہی کرتے ہیں۔ جنید جمشید نے بوتیک کیا کھولا' اس کے بعد تو فنکاروں کے بوتیکس کی لائن ہی لگ گئی۔ اعجاز اسلم' ہمایوں سعید اور اب احسن خان۔

جی ہاں! اپنے احسن خان بھی خیر سے ایک عدد بوتیک کے مالک ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے لاہور میں اپنے بوتیک کا آغاز کیا ہے۔ احسن خان خاصے مقبول اداکار ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے کپڑے عوام میں کس قدر پسندیدگی حاصل کرتے ہیں۔

دنیا میں بے شمار کام ہیں لیکن ہمارے فنکار جب شوبز سے ہٹ کر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو زیادہ تر بوتیک ہی کھولتے ہیں۔ اس رجحان کی وجہ کہیں وہ ہیروئنس تو نہیں کہ جو کپڑے پہننے پر تیار ہی نہیں ہوتیں۔ شاید یہ فنکار اسی طرح انہیں کپڑے پہنانا چاہتے ہوں۔)

٭ ٭ ٭

یہ بیان کالمانہ

حکیم سعید شہید فرمایا کرتے تھے کہ قدرت نے سورۃ الرحمٰن میں قوموں اور ملکوں کے اندر جتنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان میں ان سے دو چار زیادہ



ہیں اور انہیں گنوایا بھی کرتے تھے۔

(عبدالقادر حسن۔غیر سیاسی باتیں)

اب تو رمضان صرف ریاست کا نہیں رہا۔میڈیا کا بھی ہو گیا ہے جس نے رمضان کے ایام کو infotainment کے نام پر بنائے گئے شوز کے نام کر دیا ہے۔ایرانی نژاد صحافی ولی نصر نے ایک امریکی جریدے میں مضمون لکھا ہے' پوری عرب دنیا میں کمرشل ٹی وی والے پورے سال کی آمدنی کا تیس فیصد رمضان کے نام پر بنائے گئے پروگراموں سے حاصل کرتے ہیں۔

(نصرت جاوید۔برملا)

پیپلز پارٹی کی حکومت میں آمد پر ہماری ریلوے ختم ہو گئی۔بجلی ختم ہو گئی۔اسٹیل مل ختم ہو گئی۔پی آئی اے کا دم لبوں پر ہے' سوائے حکمرانوں کے باقی کیا بچا ہے۔معلوم نہیں۔واقعہ یہ ہے کہ پانی تک پوری طرح دستیاب نہیں ہے۔

(عبدالقادر حسن۔غیر سیاسی باتیں)

سچ پوچھیے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ماہ رمضان ایک فوڈ فیسٹول ہے۔روزے کو ایک ایسا دن بنا دیا گیا ہے جس میں رات کو یہ سوچا جاتا ہے کہ سحری میں قیمہ پراٹھے۔شامی کباب' دودھ جلیبیوں کے علاوہ اور کیا کیا ہو گا اور سہ پہر سے خواتین یہ سوچنا شروع کر دیتی ہیں کہ افطار میں آج کیا کیا بنے گا۔

(رئیس فاطمہ۔اِدھر اُدھر سے)

برمی مسلمان قتل ہوتے رہے' فوج تماشا دیکھتی رہی۔بدھوں نے گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیے۔پولیس بھی مسلمانوں پر گولیاں برساتی رہی۔

(بی بی سی نیوز)

روزہ اچھلنا کیا ہوتا ہے اب یہ محاورہ مشکل سے کسی کی زبان پر آتا ہے۔روزہ میں اگر کوئی جھنجلا کر بات کرتا تو بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں کہ اس بی بی کا روزہ اچھل رہا ہے۔

(انتظار حسین۔بندگی نامہ)





ایک حکیم صاحب کے پاس ایک بیمار گیا اور کہا۔ "حکیم صاحب۔ میں بہت عرصے سے بیمار ہوں بیماری سمجھ میں نہیں آتی۔"

حکیم نے نبض دیکھی آنکھوں کا معائنہ کیا' زبان دیکھی اور کہا۔ "تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔"

بیمار۔ "حکیم صاحب! دیکھتے نہیں میں کس قدر کمزور ہو گیا ہوں۔ آپ کہتے ہیں کوئی بیماری نہیں۔"

حکیم۔ "ہاں میں ٹھیک کہتا ہوں۔"

بیمار۔ "نہیں صاحب' ذرا غور سے میری نبض دیکھیں اسے پہچانیں اور بیماری کی تشخیص کریں۔"

حکیم صاحب نے دوبارہ نبض پر ہاتھ رکھا' ایک بار پھر زبان ملاحظہ فرمائی۔ آنکھوں کا بھی دوبارہ معائنہ کیا اور کہا۔ "اب میں سمجھ گیا ہوں اور نسخہ لکھ دیتا ہوں یہ استعمال کرو اور تندرست ہو جاؤ گے۔"

نسخہ

کم کھانا کھاؤ	ایک ماہ
مرچ کم کھاؤ	ایک ماہ
ٹھنڈے پانی سے نہاؤ	ایک ماہ
ضرورت سے زیادہ کام مت کرو	ایک ماہ
صبح شام سیر کرو	ایک ماہ
پوری نیند سوؤ	ایک ماہ
تمباکو اور دیگر نشوں سے پرہیز کرو	ایک ماہ
یہ سوچنا چھوڑ دو کہ تم بیمار ہو	ایک ماہ

بیمار (نسخہ دیکھ کر) "آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔"

حکیم۔ "بھلے مانس وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ پھر تو میرے پاس کیوں آیا۔ جا اور اگر تندرست ہونا ہو تو اس نسخے پر عمل کر اور ایک ماہ بعد میرے پاس آنا۔"

وہ بیمار چلا گیا اور گھر آکر سوچنے لگا کہ کیا حرج ہے اس علاج پر کوئی پیسہ تو خرچ ہوتا نہیں' عمل کر ہی ڈالو۔ چنانچہ نسخے کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا۔ مہینہ بھر ہی میں اس کے اندر طاقت آگئی۔ جسم تندرست اور توانا معلوم ہونے لگا۔

یہ اوپر کی مثال میں نے اس لیے لکھی جو خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جو بیمار نہیں ہوتے۔ بہر حال وہ لوگ نسخے پر عمل کریں۔ تندرستی ان کے دروازے پر منتظر کھڑی ہے۔

ف۔ الفوائزہ

اچھی بہن! آپ کو اپنی والدہ سے محبت کی کمی کا شکوہ ہے بھائی سے بھی آپ کو کچھ شکایات ہیں۔ لیکن آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں۔ تو آپ محسوس کریں گی آپ شکایت کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں۔

آپ کو اپنی ماں سے شکایت ہے کہ وہ توجہ نہیں دیتیں لیکن آپ اپنی ماں کے حالات پر غور کریں۔ 9 بچوں کی پرورش جبکہ ایک بیٹا ابنارمل بھی ہے۔ ابنارمل بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال نارمل بچوں سے سو گنا زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ ساری عمر ان کے ساتھ محنت کرنا پڑتی ہے۔ پھر اس جسمانی محنت کے ساتھ ساتھ دل کو دکھ گھیرے رکھتا ہے کہ اس بچے کا مستقبل کیا ہو گا۔ ہمارے بعد اس کو کون دیکھے گا۔

پھر جب بچے چھوٹے تھے' آپ کی والدہ بیوہ ہو گئیں۔ ان کو میکے کا سہارا بھی نہیں تھا' چھ بیٹیاں' کمانے والا کوئی نہیں۔ سارا بوجھ آپ کے دونوں بھائیوں پر آپڑا۔ بھائیوں کے لیے ظاہر ہے یہ بہت بڑی ذمہ داری' بہت بڑا بوجھ تھا۔ انہوں نے حتی المقدور اسے نبھایا۔ بہنوں کی شادیاں بھی کیں جبکہ آپ کے والد کے انتقال کے وقت وہ زیر تعلیم ہی تھے' اس صورت حال میں آپ کی بہنیں باوجود ذہین ہونے کے اعلا تعلیم نہ حاصل کر سکیں تو یہ مجبوری تھی۔ بھائی آپ کا خیال رکھتے ہیں۔ آپ سے محبت کرتے ہیں لیکن انہوں نے بڑی بہنوں پر پابندیاں لگائیں تو وہ آپ کے دل سے اتر گئے۔ آپ یہ تو سوچیں کہ جب باپ کا سایہ سر پر نہ تھا تو ان کو محتاط تو رہنا تھا' ذرا سی بات آپ کی بہنوں کے لیے دھبہ بن جاتی تھی۔ اس کے باوجود بھائیوں نے حتی المقدور آپ کی فرمائشیں پوری کیں۔ آپ کو کالج میں ایڈمیشن دلوایا آپ کو ہاسٹل میں رکھا' ہاسٹل کے اخراجات برداشت کیے۔ گاؤں میں رہنے والی کسی بھی لڑکی کے لیے یہ سب ایک خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ خوش نہیں ہیں۔ بھائی آپ کو بوجھ سمجھتے تو آپ کو سائنس کی تعلیم کے بجائے پرائیویٹ بی اے کا امتحان بھی دلوا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے آپ کی خواہش کا احترام کیا اور کالج میں ایڈمیشن دلوایا۔

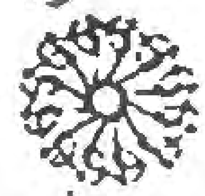
والدہ اگر بہوؤں کے ساتھ محبت کا اظہار کرتی ہیں تو اس کی وجہ ہے' وہ جانتی ہیں کہ یہ رشتہ ایسا ہے جس میں اظہار ضروری ہے جبکہ ماں بیٹی کے رشتہ میں اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ذہین لوگ حساس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ آپ اپنی ماں سے توجہ اور محبت چاہتی ہیں لیکن یہ نہیں جانتیں کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔

اللہ سے ناراض ہو گئیں' نماز چھوڑ دی۔ آپ اللہ کی نعمتوں اس کے کرم کا شمار کریں تو سجدہ سے سر نہ اٹھا سکیں گی۔

ر۔ے

اچھی بہن! جو کچھ آپ نے لکھا' اسے پڑھ کر مجھے یہ محسوس ہوا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے' میرا خیال ہے کہ ہر حساس آدمی اسی طرح سوچتا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ بہت ذہین ہیں (آپ کی تحریر اس بات کی غماز ہے) آپ اپنے ذہن کو اس طرف راغب کریں کہ آپ کس طرح لوگوں کی مدد کر سکتی ہیں ان کے کام آسکتی ہیں؟ یہ نہ سوچیں کہ آپ ان کی مدد کریں۔ بلکہ کسی کو اچھی بات بتانا' کسی سے مسکرا کر ملنا بھی اسے خوشی دے سکتا ہے خاص طور پہ کسی بچی یا بچے کو پڑھا کر' پڑوس میں کسی بیمار خاتون کی عیادت اور خدمت کر کے۔ کہ جو لوگ دوسروں کو خوشی دیتے ہیں' ان کے کام آتے ہیں بے غرض' بغیر کسی مطلب کے' قدرت انہیں خود بخود ایک سکون اور روحانی خوشی کا احساس عطا کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں محبت بانٹنا اور محبت پانا سب سے بڑی خوشی ہے۔ آپ اپنے ارد گرد نظر ڈالیں۔ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں گے جن کی آپ مدد کر سکتی ہیں' جن کے کام آسکتی ہیں۔ ان کی مدد کریں۔ آپ کو ایسی روحانی خوشی اور سکون کا احساس ہو گا کہ تمام دکھ بھول جائیں گی اور پھر یہ دنیا آپ کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس کے مطابق خود کو ڈھالنا بھی تو ضروری ہے





امت الصبور

بیوٹی بکس

عید میک اپ پلان

عید پر خوب صورت لباس کے ساتھ ساتھ سلیقے سے کیا گیا میک اپ آپ کی جاذبیت میں اضافہ کردے گا۔

میک اپ سے قبل اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کریں۔ اس کے بعد چہرے اور گردن پر اچھا سا موئسچرائزر لگا کر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیں۔ تاکہ وہ اچھی طرح جذب ہو جائے' یہ آپ کی جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے۔ پھر میک اپ کا آغاز کیجیے۔

سب سے پہلے فاؤنڈیشن کی تہہ لگائیے۔ خشک جلد والی خواتین مائع فاؤنڈیشن کا انتخاب کریں۔ فاؤنڈیشن کا انتخاب اپنے چہرے کی رنگت کی مناسبت سے کریں۔

فاؤنڈیشن کے بعد فیس پاؤڈر لگائیں۔ پاؤڈر کے رنگ کا انتخاب فاؤنڈیشن کے رنگ کی مناسبت سے کریں۔ اس کے بعد بلش آن لگائیں۔ اگر آپ کا چہرہ بیضوی ہے تو بلش آن اپنے گالوں کی ہڈیوں پر لگائیں۔ گول چہرے والی خواتین بلش آن کو ہونٹوں سے کانوں کی طرف لگائیں۔ اس سے چہرہ لمبائی کا تاثر دے گا۔ دیگر ساخت کے چہروں پر بلش آن ناک سے گالوں کی طرف لگایا جاتا ہے۔

اب آنکھوں کا میک اپ کیجیے۔ آنکھوں کے میک اپ کے لیے آئی لائنر' آئی شیڈز اور مسکارا کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھنوؤں کے نیچے ہلکے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں' تاکہ یہ جگہ نمایاں ہو جائے۔ اس سے آنکھیں بڑی لگتی ہیں۔ پپوٹوں کے درمیانی حصوں پر گہرے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں۔ انگلی سے ہلکا سا مل لیں' تاکہ دونوں آئی شیڈز کے کنارے واضح نہ ہوں اور وہ الگ الگ نہ محسوس ہوں۔ اب پلکوں پر مسکارا لگائیں۔ کالے رنگ کا مسکارا ہر طرح کی آنکھوں کے لیے سب سے بہتر رہتا ہے۔ اگر آپ نیلا' براؤن' یا کسی اور رنگ کا مسکارا لگانا چاہتی ہیں تو پھر آئی لائنر بھی اسی رنگ کا لگائیے۔ اگر ہلکی پلکیں ہیں تو مسکارا لگانے سے پہلے پلکوں پر تھوڑا سا ٹالکم پاؤڈر لگائیں' پھر مسکارا لگائیں۔ اس سے پلکیں گھنی لگیں گی۔

آخر میں ہونٹوں کا میک اپ کیجیے' ہونٹوں کا میک اپ سب سے زیادہ اہم ہے' کیوں کہ یہ میک اپ کا مجموعی تاثر اجاگر کرتا ہے۔ لپ پنسل سے ہونٹوں کی ساخت نمایاں کیجیے۔ ہونٹ زیادہ پتلے ہیں تو پنسل کی مدد سے ہونٹوں سے باہر کی طرف خط کھینچیے۔ ہونٹ اگر موٹے ہیں تو اندر کی طرف لگائیں۔ پھر لپ برش کی مدد سے لپ اسٹک لگائیے۔ ایک نرم ٹشو پیپر لے کر اسے دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ کر ہلکے سے دبائیے۔ اس کے بعد دوبارہ لپ اسٹک لگائیے۔ اس سے لپ اسٹک زیادہ دیر تک ہونٹوں پر جمی رہے گی۔ اس کے بعد لپ گلوس لگا لیجیے۔

اپنے لباس کی ہم رنگ نیل پالش لگائیں۔

اب آپ کا میک اپ مکمل ہے۔ اچھا سا ہیئر اسٹائل بنائیے اور دیکھیے اس عید پر آپ کی سج دھج کس قدر نرالی ہے۔

☆